شامی کاغذ

ناصرہ شرما

شامی کاغذ

ناصرہ شرما کے افسانے

شامی کاغذ

ناصرہ شرما

اردو مرکز عظیم آباد
۲۴۷، ایم آئی جی، لوہیا نگر، پٹنہ۔ ۸۰۰۰۲۰

شامی کاغذ

ناصرہ شرما کے افسانے

اشاعت : نومبر 2005

قیمت : 250 روپے

ناشر : اردو مرکز، عظیم آباد، پٹنہ

طباعت : پاکیزہ آفسیٹ، شاہ گنج، پٹنہ

کور آرٹ : صبا حسن

دستیاب

• اردو مرکز، عظیم آباد

247، ایم آئی جی، لوہیا نگر، پٹنہ۔ 800020، بہار (انڈیا)

• بک امپوریم

اردو بازار، سبزی باغ، پٹنہ۔ 800004

• مکتبہ جامعہ

جامعہ نگر، نئی دہلی۔ 110025

SHAMI KAGHAZ

Stories by Nasera Sharma

URDU MARKAZ
247 MIG, Lohia Nagar
Patna - 800020, Bihar (India)

Rs. 250/-

ترتیب

یہودی سرگردان / ۹
گونگا آسمان / ۲۳
زیتون کے سائے / ۳۵
کاغذی بادام / ۶۳
موم جامہ / ۷۹
پل صراط / ۹۵
جہاں نما / ۱۱۵
خوشبو کا رنگ / ۱۳۰
شامی کاغذ / ۱۴۰
آب توبہ / ۱۶۳
غنچہ دہن / ۱۸۷
اڑان کی شرط / ۲۰۹
سنگسار / ۲۲۷

تمہارے نام

نئے گلّے بان کی بُر بُر کی آواز سے
کھوئی بھیڑیں گھر کو لوٹ رہی ہیں
کھیت، کھلیان
فصل اور اناج سے بھر اٹھے ہیں
دھیرے دھیرے
ٹوٹے گھروں کی دیواریں بن رہی ہیں
کچھ پر
نئی چھتیں بھی پڑ چکی ہیں
جوان عورتیں
پیٹ سے ہیں اور
گایوں نے بچھڑوں کو جنم دیا ہے
صلیبوں کے جنگل
کٹ چکے ہیں اور
پھلوں سے بھرے درختوں کے بیچ
شہر در شہر
گاؤں سے قصبوں اور
ایک گھر سے دوسرے گھر تک
ٹوٹی زندگی پھر سے جڑ رہی ہے
دم توڑتی
رات کی سیاہی کے بیچ
اب
پو پھٹنے والی ہے
کل
جو نیا سورج اُگے گا
وہ تمہارے بنا
کتنا اپنا لگے گا

■

یہودی سرگردان

شراب خانے میں میری میز کے ٹھیک سامنے وہ بیٹھا تھا۔ اسے یہاں بیٹھے لگ بھگ چار گھنٹے ہو رہے تھے اور اس بیچ میں اسے صرف مے نوشی کرتے دیکھ رہا تھا۔ اپنے میں ڈوبا جانے کن وادیوں کا سفر طے کر رہا تھا۔ بڑی دیر سے دبی خواہش کو اب زیادہ دیر نہ دبا سکا۔ بیرے کو بلا کر میں نے کارڈ پر اس کے لئے پیغام لکھا اور بیرے کو تھما دیا۔

بیرے کے ہاتھ سے لے کر اس نے پیغام پڑھا۔ دیر تک اس پر نظر گڑائے رہا پھر اس نے میری طرف دیکھا اور بہت شائستگی کے ساتھ اپنی کرسی سے کھڑا ہو گیا۔ میں اپنی جگہ سے اٹھا اور اس کی طرف بڑھا۔ اس نے اپنا ہاتھ آگے بڑھایا۔

'ڈاکٹر پرتاپ۔'

'ڈاکٹر برہان۔'

'بڑی خوشی ہوئی آپ سے مل کر......۔'

'مجھے بھی خاص کر یہ جان کر کہ آپ بھی ڈاکٹر ہیں۔'

'اتفاق ہے۔'

'تشریف رکھیں۔'

'آپ کا وطن......۔'

'میرا کوئی وطن نہیں ہے۔ میں یہودی سرگردان ہوں۔ سارے جہاں کو اپنا گھر سمجھ رہا ہوں۔'

'پھر بھی—' ڈاکٹر پرتاپ نے دلاسے کے انداز سے کہا مگر اس پر اس مرہم کا کوئی اثر نہ ہوا۔ وہ

سر جھکائے خاموش اپنے میں ڈوبنے لگا۔ ڈاکٹر پرتاپ نے خاموشی توڑی۔

'میں ہندوستان سے ہوں، پندرہ دن کے لئے ایک کانفرنس کے سلسلہ میں آیا ہوں، ابھی چند دن اور رہوں گا۔'

ڈاکٹر برہان ہلکے سے مسکرائے، پھر لمبی سانس لی۔ ہلکی سی کھنکھار کے ساتھ بولے۔ 'قاعدے کی بات تو یہ ہے کہ میں بھی آپ کو بتاؤں کہ پیرس میں کب تک رہوں گا...... مگر جب مجھے خود پتہ ہو تب نا؟ کب تک مجھے رکنا پڑے گا اور پھر یہاں سے کہاں جانا پڑے گا۔۔۔؟ آپ کے لئے پیگ منگاتا ہوں...... بیرا......!' پھر خاموشی چھاگئی۔ پیگ کے آجانے پر اس نے بوتل اٹھائی اور میرے لئے جام بنایا۔

'میں کب تک گز بھر وطن کے لئے دربدر پھرتا رہوں گا، اسے ڈھونڈتا رہوں گا، ہاتھ کچھ بھی نہیں لگے گا۔' اتنا کہہ کر اس نے خالی مٹھی کھولی، بند کی، پھر اپنی ہتھیلی کو ڈاکٹر پرتاپ کے سامنے کھول کر رکھا۔

'دیکھئے! چند سپاٹ لکیریں ہتھیلی پر ابھری ہیں، ان لکیروں کی سمت اور زبان انجان ہے اور میں نادان نہیں جانتا؛ کہ ایرانی قوم کی یہ سرگردانی کب ختم ہوگی؟'

ڈانس کے لئے میوزک شروع ہوگئی تھی۔ جوڑے کھڑے ہونے لگے تھے۔ ڈاکٹر پرتاپ پھیلی آنکھوں سے کالے سفید، جوان ادھیڑ جوڑوں کو جاتے ہوئے دیکھنے لگے۔ ایک دم سے ایک باریک سریلی آواز سن کو وہ چونک پڑے۔ ایک عورت جسے بے حد حسین کہا جاسکتا تھا، میز کے نزدیک کھڑی تھی۔ ڈاکٹر برہان اپنا سارا کھویا پن بھول کر اس سے بڑی گرم جوشی سے ہاتھ ملا رہے تھے۔ ڈاکٹر پرتاپ سے معذرت چاہتے ہوئے اس کی کمر میں ہاتھ ڈال کر اسے ڈانسنگ فلور کی طرف لے گئے۔ ڈاکٹر پرتاپ پل بھر کے لئے حیرت زدہ رہ گئے مگر دوسرے لمحہ ہی ان کے چہرے پر ایک شرمیلی مسکان ابھر آئی۔

لال، پیلی، نیلی روشنی کے بنتے بگڑتے ہالے میں ڈاکٹر پرتاپ کی نظریں ان دونوں کو ڈھونڈ رہی

تھیں۔ وہ دونوں ناچتے بدن کے بیچ چھپتے پھر نظر آنے لگتے تھے۔ وہ بہت اچھا ناچ رہا تھا اور اتنا زیادہ پینے کے بعد بھی وہ مدہوش نہ تھا۔ میں اکیلے انگلیوں سے میز پر تال دیتا اپنا اکیلا پن دور کرتا رہا۔ ہفتے بھر سے ایسا موقع مجھے ایک بار بھی نہیں مل پایا تھا۔ دن بھر کام میں مصروف رہتا، مگر شام کاٹ کھانے کو دوڑتی تھی۔ شام سے گئی دیر رات تک بیوی اور بچے بے حد یاد آتے تھے۔

وہ دونوں میری ہی میز پر آ گئے۔ ڈاکٹر برہان نے میرا تعارف کرایا— 'ماریہ! یہ میری دوست، بہت اچھی مصورہ ہیں۔ احساسات و جذبات کو پتیوں پر پھیلی نسوں کی طرح چہرے پر بڑی باریکی سے برش کے ذریعہ ابھارتی ہیں۔ چہرے کی ہر چیز آپ سے بات کرنے لگتی ہے!'

'بڑی خوشی ہوئی آپ سے مل کر!'' سچ مچ ڈاکٹر پرتاپ کو اس عورت سے مل کر خوشی ہوئی تھی۔ ہفتے بھر میں یہ پہلی شام تھی جو خالی نہیں تھی اور دلچسپ لوگوں کے ساتھ گزر رہی تھی۔

باتوں باتوں میں پتہ چلا کہ وہ بہت اچھا ہارٹ اسپیشلسٹ ہے، کسی پکنک اسپاٹ پر وہ ماریہ سے ملا تھا۔ دو تین ملاقاتوں ہی میں دونوں بڑے اچھے دوست بن گئے تھے۔ کھانے کے بعد ماریہ کو وہ اس کی کار تک چھوڑنے کے لئے باہر نکلا۔ میں نے کھانے کا بل منگوایا۔ معلوم ہوا، اس نے باہر جاتے ہوئے بل ادا کر دیا ہے۔ مجھے عجب پھرتیلا آدمی لگا۔ تھوڑا برا بھی لگا۔ کچھ دیر بعد وہ تیز قدموں سے میرے نزدیک آیا اور بولا— 'معاف کیجئے گا، میں نے آپ کو تنہا چھوڑ دیا، اگر آپ تھکے نہ ہوں تو باغ میں ٹہلتے ہیں، میں پاس ہی ہوٹل بیلفاسٹ میں ٹھہرا ہوں۔'

'چلئے!'' کہہ کر میں کھڑا ہو گیا۔ اتفاق سے میں بھی اسی ہوٹل میں ٹھہرا ہوا تھا۔

سڑک پر ٹہلتے ہوئے مجھے احساس ہوا کہ وہ مجھ سے کافی لمبا ہے۔ پیڑوں کے سائے کے ساتھ اس کا سایہ میرے اوپر پڑ رہا تھا۔

'ماریہ سے جب بھی ملتا ہوں، ایران بڑی شدت سے یاد آنے لگتا ہے۔ اس کے بدن سے، باتوں سے، اس کے پورے وجود سے میں ایران کی خوشبو محسوس کرتا ہوں۔ ماریہ پانچ سال ایران میں رہی ہے۔ پورے ایران کا دورہ کیا ہے، میرے غم کو اچھی طرح جانتی ہے۔'

'آپ کبھی ہندوستان گئے ہیں؟'

'گیا تھا، لگ بھگ دس سال پہلے۔'

'ایران آنے کا پروگرام میرا بھی بنا تھا مگر ایکدم سے پروگرام ٹل گیا۔ تہران میں غضب کی گڑ بڑ شروع ہو گئی تھی۔'

'ہاں، تب میں امریکہ میں تھا۔ ایران لوٹا تو سارے ملک کا نقشہ ہی بدلا ہوا تھا۔ مذہب کی جونک ہم زرتشتیوں کا خون پینے کے لئے ایران کے جسم پر چپک گئی تھی!'

''مذہب میں آخر برائی کیا ہے، ڈاکٹر برہان' ڈاکٹر پرتاپ نے حیرت سے پوچھا۔

'کون سی برائی نہیں ہے ڈاکٹر پرتاپ؟' اونچی آواز سے اندھیرے کو چیرتا ہوا اس کا قہقہہ درختوں پر سوتی چڑیوں کے دل دہلا گیا۔

'دل اور روح کو سکون......!' ڈاکٹر پرتاپ کی بات بیچ ہی میں کٹ گئی۔

'ہمارا سکون، ہماری تہذیب، ہمارے تمدن کو عرب اسلام کے بلڈوزر سے اکھاڑ پھینکنا چاہتے ہیں......! تین سو سال کی اتھاہ کوششوں کے بعد بھی وہ یہ کام ابھی نہیں دے سکے۔ حافظ اور فردوسی جیسے شاعروں نے انہیں منہ توڑ جواب دیا تھا۔ اب ایران پر دوبارہ عرب کا حملہ ہوا ہے۔ اس کی حکومت کو ایرانی دل سے قبول نہیں کریں گے۔ گولی کا خوف وقت کی زبان پر چاہے تالے ڈال دے!'

ڈاکٹر پرتاپ خاموشی سے چلتے رہے۔ وہ جب تک صبح کو آدھا گھنٹہ پوجا نہیں کر لیتے تھے، من عجیب سا رہتا تھا۔ بچپن سے اب تک یہی عادت پڑی تھی انہیں۔ کیا کہتے برہان کی ان بے تکی باتوں پر؟

'ڈاکٹر پرتاپ، اگر آپ کے ملک پر کسی غیر ملکی حکومت کا حملہ ہو جائے تو کیا آپ خوش ہوں گے؟'

'بالکل نہیں، اس میں خوشی کی کیا بات ہے؟'

'تو پھر میرے زخم پر نمک نہ چھڑکیں! خاموش رہ کر کہیے کہ حقیقت میں ایران پر ظلم ہوا ہے، ایرانی بے گھر ہوا ہے۔ آپ سے اگر آپ کے رسوم و رواج چھین لئے جائیں تو آپ پر کیا گزرے گی؟'

'پاگل ہو کر مر جاؤں گا' ڈاکٹر پرتاپ نے فوراً جواب دیا۔

'ہم ایرانی پہلے مرنا پسند کرتے تھے۔ اس وقت ہمارے ایران میں شہید ہونے کا چلن عام نہیں ہوا تھا۔ ہمارے کوچے اور بازار، سڑک اور فٹ پاتھ جب سے لاشوں سے پٹنے لگے ہیں ہم موت نہیں، جنگ چاہتے ہیں جس میں دیوانہ وار ان غیر ملکیوں کی جڑیں، جڑ سے اکھاڑ پھینکیں!'

ہوٹل سامنے نظر آرہا تھا۔ دونوں کے قدم آگے بڑھ گئے۔ ڈاکٹر پرتاپ کو خاموش رہنے سے ڈر لگنے لگا تھا کہ کہیں ڈاکٹر برہان پھر خفا نہ ہو جائیں۔

'آپ کا غصہ اپنی جگہ پر مناسب ہے۔ مذہب آپ کا دشمن نہیں ہے بلکہ وہ شخص، جو اس مذہب کو اپنے اقتدار کے لئے استعمال کرے، وہ برا ہے!' ڈاکٹر پرتاپ نے دھیرے سے کہا۔

'آپ کی فکر اور نظریہ ایک دم صحیح ہے، مگر اسلام نے ہمیں دیا ہی کیا ہے سوائے اس جذبہ کے کہ مذہب کا مطلب کوڑے اور زنجیریں ہیں؟ ظلم اور ستم ہے؟ جس مذہب کی وجہ سے پچھلے چودہ سو سالوں سے خون خرابہ، قتل و غارت گری ہو رہی ہو اس سے آپ کی امید تو بندھ سکتی ہے مگر مجھ جیسے زرتشتی کی نہیں...... ! میرا نام حسین تھا۔ جب ہوش آیا تو محسوس ہوا کہ میرا نام ایرانی نہیں، غیر ملکی ہے۔ آخر کیوں، ماں باپ سے جی بھر کر لڑا اور اپنا نام گرش رکھا...... نام بدلوانے میں دانتوں پسینہ آگیا۔ مان لیں آپ کا نام ڈاکٹر برہان ہوتا اور آپ ہندو ہوتے۔ تب مجھے حق تھا کہ میں آپ کے دوغلے پن پر حیرت کرتا۔ کیا آپ خود اپنے اوپر کرتے؟'

'ضرور کرتا، ڈاکٹر برہان! آپ کی باتیں — معاف کریں، میری معلومات بہت کم ہیں اور یہ باتیں سمجھنے کے لئے مجھے ایران کے ماضی اور حال کو سمجھنا پڑے گا۔ ہم تو صرف اتنا ہی جانتے ہیں کہ شاہ ایک اچھا حکمراں تھا۔ اس نے ایران کی روایات کو چار چاند لگا کر اسے دنیا میں ایک اونچا مقام دلوایا تھا اور بس۔'

'شاہ کی غلطیاں ہی تو تھیں جو ہم نے یہ دن دیکھا۔ اس پر دوسرا ملک سوار تھا۔ امریکہ سے ایران، فیشن اور کرپشن میں صرف ۸۰ گھنٹے پیچھے تھا۔ سب کچھ گھن کھایا، دیمک زدہ کھوکھلا تھا۔ خیر چھوڑیئے ...... کچھ پئیں گے؟' ڈاکٹر برہان نے ہنستے ہوئے کہا۔

'کچھ ٹھنڈا...... سافٹ ڈرنک......!' ڈاکٹر پرتاپ نے کہا۔

'بچوں والی بات...... گولڈ اسپاٹ، کوکا کولا، پائن ایپل...... یہ تو بچے پیتے ہیں۔' ڈاکٹر برہان کے قہقہے کی آواز لابی کی چھت پھاڑنے لگی۔ آس پاس کے لوگ چونک کر دیکھنے لگے۔ ڈاکٹر پرتاپ بھی ان کی معصومانہ خوشی پر اپنی ہنسی دبا نہیں پائے۔

لابی میں بھیڑ کافی تھی۔ ایک طرف خالی صوفہ دیکھ کر وہ ادھر جا کر بیٹھ گئے۔ بیرے کو آرڈر دے کر ڈاکٹر برہان نے اپنی آنکھیں چھت پر گاڑ دیں، پھر تھوڑا جھک کر ڈاکٹر پرتاپ کی طرف مڑے اور کہنے لگے۔

'بڑی امیدیں لے کر ہندوستان گیا تھا۔ اس دھرتی کو ڈھونڈنے جہاں پنچ تنتر جیسی آب حیات، کھانے پینے سے بے گانہ عابد، ہمالیہ کی چوٹی پر دھیان میں مگن رہتے ہیں مگر ناامیدی ہوئی۔ وہاں مجھے وہ سب کچھ نہ ملا جو میں نے ٹیگور کی نظموں، نہرو اور گاندھی کی سوانح حیاتوں میں پڑھا تھا۔ آگرہ جا کر ان ایرانی کاریگروں کے لئے رو پڑا جنھوں نے تاج محل جیسا شاہ کار بنا کر اپنے ہاتھ کٹوالئے—فن کی اونچائی فن کار کو کیا دیتی ہے—اپاہج پن؟! یہ پہلی بار ہندوستان نے مجھے سمجھایا۔' ڈاکٹر برہان نے پیگ میں شراب انڈیلتے ہوئے کہا۔

ڈاکٹر پرتاپ خاموش رہے۔ نیند ان کے پپوٹوں پر حاوی ہو کر ان کی نسوں میں خمار سا بھر رہی تھی۔ رات کے دو بج رہے تھے۔ دس بجے دودھ کا ایک گلاس پی کر سو جانے والے ڈاکٹر پرتاپ بہت بے چین سے ہو رہے تھے۔ جوتے اور پینٹ میں کسے ان کے پاؤں ڈھیلی ڈھالی تہمد کے لئے تڑپنے لگے تھے۔

'آپ کو نیند آ رہی ہے؟' ڈاکٹر برہان نے اپنا تیسرا پیگ ایک کے بعد ایک خالی کرتے ہوئے ڈاکٹر پرتاپ کے پہلے پیگ کو دیکھتے ہوئے پوچھا۔

'جی! جی نہیں—یوں ہی آنکھیں جھپک گئی تھیں!' ڈاکٹر پرتاپ نے جیب سے رومال نکال کر منہ پونچھتے ہوئے کہا۔ پیچھے کے دانت نہ ہونے کی وجہ سے سوتے میں رال بہتی ہوئی گالوں پر آجاتی ہے۔

'آپ نے کبھی عشق کیا ہے، ڈاکٹر پرتاپ؟' ڈاکٹر برہان نے بجھی لکڑی پر پھونک ماری۔

'عشق؟ میں نے؟......' درد بھرے لہجے نے چنگاری کو ہوا دی۔

'جوان ہونے سے پہلے ہی شادی ہو گئی۔ عشق کہہ لیں یا جو بھی——وہ میں نے اپنی بیوی ساوتری سے کیا ہے۔' لکڑی نے آگ پکڑلی۔

'عشق بیوی سے نہیں، محبوبہ سے ہوتا ہے۔' لکڑی پر تیل چھڑکا گیا۔

'جی؟' لکڑی دیوانہ وار لپکتے شعلوں سے بھر گئی۔

'ہاں! میں دس سال پہلے عاشق ہوا تھا۔ اس وقت میری شادی کے نو سال گزر گئے تھے اور......!'

'شادی کے بعد آپ نے......؟' ڈاکٹر پرتاپ کی نیند ان کی آنکھوں سے کوسوں دور بھاگ گئی تھی۔ ان کی حالت غیر ہو چکی تھی، اس خیال سے کہ ایسا گناہ کرنے والا ان کے نزدیک بیٹھا ان کے ساتھ مے نوشی کر رہا ہے۔

'اس میں حیرت کی کیا بات ہے؟ عشق تو کبھی بھی ہو سکتا ہے۔ عاشق ہونے کی کوئی عمر نہیں ہے۔ جب تک دل جوان ہے، احساس کی کونپلیں پھوٹتی ہیں، آپ عشق کر سکتے ہیں۔ جب میں دوبارہ عاشق ہوا تھا تب میری عمر تیس سال کی تھی۔ پہلی بار جب میں اپنی موجودہ بیوی پر عاشق ہوا تھا اس وقت میں صرف انیس سال کا تھا۔ اسے میں نے اپنے چچا کے باغ میں اوپر چھت سے بالکل ننگی حالت میں دیکھا تھا۔ وہ کپڑے اتار کر حوض میں تیر رہی تھی۔ مگر میں اپنا ایمان کھو کر خودکشی پر آمادہ ہو گیا اور گھر والوں کو دھمکی دے کر بتایا کہ شادی میں اسی سے کروں گا ورنہ نہیں۔ مجبوراً اسے میری محبت کو تسلیم کرنا پڑا۔ اس کی منگنی ہو چکی تھی۔ میرے پاس اب اس سے چار بچے ہیں۔ بیوی اور بچے ایران میں میرا انتظار کر رہے ہیں۔ انہیں روز میرے خط کا انتظار رہتا ہوگا کہ کب میں ان کے لئے ٹکٹ بھیجوں۔ میں پوری کوشش میں ہوں کہ وہ کسی طرح وہاں سے نکل آئیں......! خیر...... ہاں تو، میں اپنے دوسرے عشق کا ذکر کر رہا تھا—— تیس سال، مرد کے لئے بھرپور جوانی کا جام چھلکانے کی عمر ہوتی ہے اور تیس سال عورت کی جسمانی خواہشات کی شدت کا وقت ہوتا ہے۔ سحر تیس سال کی بھرپور عورت تھی۔ عشق اور جوانی کی دیوانگی ہمارے بیچ پانچ سال تک چلی۔ شہد اور شراب کے نشہ میں ہم مدہوش تھے۔ ڈاکٹر پرتاپ، آپ نے سیب سے بھرا درخت دیکھا ہے؟ ایسی ہی جوانی اور حسن سحر میں تھا جو آپ کو فوراً توڑ کر اپنے کو کھانے کے لئے مجبور کرتا ہے۔ جانے کیسے اس کے

شوہر کو ہم پر شک ہو گیا۔ میں اس کی زندگی خراب نہیں کرنا چاہتا تھا اس لئے خاموشی سے امریکہ چلا آیا، اس خیال سے کہ فساد خود دب جائے گا۔ میں اسے دل و جان سے چاہتا تھا۔'

'ماریہ......؟' ڈاکٹر پرتاپ کو بے چینی تھی کہ ڈاکٹر برہان انہیں اب بتادیں کہ ماریہ سے انہیں چالیس سال کی عمر میں پھر تیسری بار عشق ہو گیا ہے۔

'ماریہ کی میں بہت عزت کرتا ہوں۔ ماریہ میرے وطن سے پیار کرتی ہے۔ میں ماریہ کی شخصیت کے آئینے میں ایران کا عکس دیکھتا ہوں۔ وہ آئینہ......! اسے میں توڑ نہیں سکتا ہوں، ہم دونوں بہت اچھے دوست ہیں اور بس۔' ڈاکٹر برہان نے ڈاکٹر پرتاپ کے جذبات پر ٹھنڈے پانی کے چھینٹے مارے۔

'سحر سے آپ کی ملاقات پھر نہیں ہوئی؟' ڈاکٹر پرتاپ نے جذبات سے بھری خواب ناک فضا سے نکلتے ہوئے پوچھا۔

'ہوئی تھی، وہ مجھے بھول نہیں پائی تھی۔ اس نے شوہر کے سامنے اقرار جرم کر لیا تھا۔ یقین و اعتماد سے بھری جب وہ طلاق نامہ لے کر میرے پاس پہنچی تو اسے معلوم ہوا کہ میں ایران چھوڑ کر لمبے عرصے کے لئے غیر ملک چلا گیا ہوں۔ کہاں؟ پتہ نہیں۔ سال بھر بعد جب میں لوٹا تو وہ غم سے نڈھال سوکھے درخت میں تبدیل ہو چکی تھی۔ اس کے شوہر کی موت بھی کار کے حادثہ میں ہو گئی تھی۔ ہر طرف سے لٹی اجڑی وہ خود دھرتی چھوڑنے لگی تھی۔ جب میں اس سے ملا تو وہ میری بانہوں میں کسی کھوکھلے درخت کی طرح گر گئی۔ انہی بانہوں کے بیچ اسی سینے پر اس نے دم توڑ دیا۔ میں نے اسے آب حیات پلانا چاہا تھا۔ اس کی زندگی میں خوشیاں بھرنا چاہی تھی اور ہوا اس کے برعکس......!، ڈاکٹر برہان کے کندھے جھک گئے۔ آواز میں پانی کا گیلا پن تھا۔ گھڑی کی سوئی تین بجا رہی تھی۔ مگر ڈاکٹر پرتاپ کی آنکھوں سے نیند کافور کی طرح اڑ چکی تھی۔

'آج اسے گزرے ہوئے چھ سال ہو گئے ہیں۔ بدھ کی رات تھی جب میں اس سے ملنے گیا تھا۔ جب اس نے میرے سینے پر دم توڑا تھا، تب وہ جمعرات کی صبح تھی۔ یعنی رات کے تین بجے......!' برہان نے شراب کی پوری بوتل گلاس میں الٹ لی۔

'اس دن سے آج تک میرے لئے کوئی......'

'آپ کا فون ہے، سر!' بیرے نے برہان سے کہا۔

'اچھا، ڈاکٹر پرتاپ میں ابھی حاضر ہوتا ہوں۔' کہہ کر برہان نپے تلے قدموں سے ٹیلی فون کی طرف بڑھنے لگے۔

اسی بیچ ڈاکٹر پرتاپ نے اپنا سر صوفہ پر پیچھے ٹکایا، پیر پھیلائے اور آنکھیں بند کر لیں۔ اس سے پہلے کہ ڈاکٹر برہان لوٹتے، وہ گہری نیند میں ڈوب چکے تھے۔

دو دن تک ڈاکٹر پرتاپ ڈاکٹر برہان کی خبر لینے کے لئے بے چین رہے۔ پھر تھک کر شام کو اکیلے ہی گھومنے کے لئے جانے لگے۔ صبح اور رات کو کب ڈاکٹر برہان آتے اور جاتے ہیں، ہوٹل والوں کو بھی اس کی کوئی خاص جانکاری نہیں تھی۔

تنہائی سے ڈاکٹر پرتاپ تھک چکے ہیں۔ ہندوستان لوٹنے میں ابھی دو دن باقی ہیں۔ بچوں اور ساوتری کے لئے تھوڑا بہت سامان خرید لیا ہے۔ پھر بھی کسی نئی، سستی، اچھی چیز کی امید میں بازار کی طرف نکل گئے۔ ہندوستان سے وہ اکیلے ہیں۔ زیادہ تر لوگ مشرق وسطیٰ ممالک کے ہیں۔ ان کے ساتھ دوستی صرف میٹنگ تک رہتی ہے۔ پھر وہ شام ہوتے ہی کیبرے اور مہنگی تفریح کی طرف چل پڑتے ہیں۔ ایک دو بار تو وہ بھی پگال— کی طرف گھوم آئے ہیں۔ سیکس شاپ بھی گھبراہٹ میں دیکھ آئے ہیں، مگر انہیں یہ سب کچھ اچھا نہیں لگا۔ ایک دو ساتھی جو فرنچ تھے، انہوں نے ایک بار سب کو ڈنر پر بلا کر اپنا فرض پورا کر لیا۔ اس لئے غیر ملک اکیلے جاتے ہوئے ڈاکٹر پرتاپ گھبراتے ہیں۔ گوشت کھا نہیں پاتے ہیں۔ شراب نوشی بھی پچھلے پانچ سالوں سے ہی شروع کی ہے۔ زندگی کے چالیس سال خالص سبزی کے کھانے اور نشہ سے دور رہ کر گزار چکے ہیں۔

بازار سے لوٹتے ہوئے ڈاکٹر پرتاپ نے سوچا کہ ڈاکٹر برہان ہارٹ اسپیشلسٹ ہیں۔ ان سے ایک بار اپنا چیک اپ کرا لینا برا نہیں ہے۔ دو سال پہلے ہلکا سا ہارٹ اٹیک انہیں ہوا تھا۔ کمرے میں سامان رکھ کر وہ لیٹ گئے۔ ڈاکٹر برہان کا جملہ یاد آنے لگا۔ عاشق ہونے کی کوئی خاص عمر نہیں ہوتی ہے۔ عجیب آدمی ہے۔ ان کے وجود کا لکڑ پچھتاوے کی آگ میں دھوں دھوں کر کے جل اٹھا۔ ساری جوانی ساوتری کی کالی زلفوں کی چھاؤں میں گزار دی ہے۔ سنہرے اخروٹی بھورے رنگ کے ملائم

گچھے دار بالوں کو اب تک انہوں ے صرف ریشم کی لچھیوں سے زیادہ اہمیت نہیں دی تھی۔ نیلی آنکھیں، سفید رنگ انہیں کبھی متاثر نہیں کر پائے تھے مگر آج—؟ روایت اور شرم کی ساری دیواریں گرا دینے کے لئے دل مچل رہا ہے۔ ساوتری کو کیا پتہ چلے گا کہ میں یہاں سات سمندر پار کیا کر رہا ہوں۔

ڈاکٹر پرتاپ نے کروٹ بدلی۔ تکیے کو بانہوں میں بھرا۔ اس دن شام کو ڈاکٹر برہان کی قسمت پر وہ مھگے سے رہ گئے تھے۔ بھورے بالوں اور شہد کی رنگت آنکھوں والی لڑکی کے ساتھ وہ ریستوران کے باہر پڑی کرسیوں پر بیٹھے زوردار ہنسی ہنستے شراب پی رہے تھے۔ اس وقت ڈاکٹر پرتاپ بس میں بیٹھے شانزالیجا سے گزر رہے تھے۔

ڈاکٹر برہان کو دیکھ کر کوئی کہہ سکتا تھا کہ وہ دکھی ہیں؟ ان کے دل کو کوئی درد بے چین کر رہا ہے؟ شراب کے ہر جام کو اٹھاتے ہوئے دھیرے سے کہتے تھے— 'خمینی کی موت پر— سلامتی—' کہہ کر ہلکی شیشے کی آواز جام ٹکرانے سے اٹھتی تھی۔

چیرز کی جگہ ڈاکٹر پرتاپ بھی سلامتی کہنے لگے تھے، مگر اس سوال کا جواب انہیں نہ مل پایا کہ کسی کے دل میں پیار اور نفرت کے جذبات ایک ساتھ کیسے پنپ سکتے ہیں؟ ڈاکٹر پرتاپ کی آنکھیں تھکان سے مندنے لگیں۔ بوجھل نیند سے ڈوبتے دماغ پر ماریہ کی تصویر ابھرنے لگی۔ ماریہ کے ساتھ وہ سومناتھ کی سیڑھیاں چڑھ رہے ہیں۔ اس کے نازک پیر پر ان کی...... بانہوں کا تکیہ پیروں کے پاس آ گیا۔

ان کے خراٹے کمرے کی دیواروں سے سر ٹکرانے لگے۔ خواب میں ڈوبا مضبوط جسم سلگتی آگ کی لپٹ میں جھلس رہا تھا۔

رات کو ڈاکٹر پرتاپ کی فلائٹ تھی۔ سارا سامان بندھ گیا تھا۔ تبھی دروازے پر دستک ہوئی۔ دروازہ کھولا تو سامنے ڈاکٹر برہان کو کھڑا پایا۔ چہکتے ہوئے ڈاکٹر پرتاپ بولے— 'کہاں تھے ڈاکٹر برہان؟ میں آپ کے لئے کافی پریشان تھا۔ سوچ رہا تھا، جانے سے پہلے ملاقات ہوتی بھی ہے یا نہیں۔ آیئے!' ڈاکٹر پرتاپ نے انہیں کمرے میں آنے کی دعوت دی۔

'میں کچھ کاموں میں مشغول ہوگیا تھا۔ آپ کا خیال مجھے برابر آتا رہا۔ آپ کے جانے کی تاریخ مجھے یاد تھی۔ آج رات آپ کی فلائٹ ہے نا؟' ڈاکٹر برہان نے ہنستے ہوئے کہا۔

'جی، رات کے بارہ بجے۔ یہ رہا میرا کارڈ۔ کبھی ہندوستان آنا ہو تو میرے غریب خانہ پر ضرور تشریف لائیے گا۔' بہت پر خلوص التجا کی ڈاکٹر پرتاپ نے۔

'جانے سے پہلے ایک ایک پیگ ہو جائے، ابھی تو کافی وقت ہے!' ڈاکٹر برہان نے کارڈ کو ماتھے سے لگا کر اسے جیب میں رکھتے ہوئے کہا۔

'چلئے! دعوت میری طرف سے ہوگی!' ڈاکٹر پرتاپ نے قلم اور رومال سوٹ کی جیب میں سجاتے ہوئے کہا۔

'آپ کی خواہش سر آنکھوں پر، ڈاکٹر پرتاپ!' ڈاکٹر برہان نے بڑی خندہ پیشانی سے کہا۔

ہوٹل کا بار لوگوں سے بھر رہا تھا۔ وہ دونوں ایک کونے میں بیٹھ گئے، جہاں سے شہر کی فلک بوس عمارتیں روشنی کے دیے بدن پر سجائے کھڑی تھیں۔ پیگ بنا کر دونوں نے سلامتی کہا اور سِپ لیا۔

'میں نے آپ کو جب پہلی بار دیکھا تو غلط فہمی میں پڑ گیا تھا کہ آپ ہندوستانی ہیں۔ سانولا رنگ، کالے بال، کالی آنکھیں، ایرانی زیادہ تر گورے اور بھورے بالوں والے ہوتے ہیں!' ڈاکٹر پرتاپ نے ہنستے ہوئے کہا۔

'میں شیراز شہر کا ہوں۔ وہاں کا سانولا پن پورے ایران میں اپنے نمک اور کشش کے لئے مشہور ہے۔' ہنستے ہوئے ڈاکٹر برہان بولے۔

'اچھا!'

'خمینی کی موت کے بعد تشریف لائیں، شیراز میں ہمارے پشتینی مکان میں ٹھہریں۔ آپ کو ایران کا اصلی چہرہ دکھاؤں گا۔' ڈاکٹر برہان نے پُر عزم لہجے میں کہا۔

'سر آپ کی کال ہے!' بیرے نے اطلاع دی۔

'ابھی آیا۔ میرے گھر سے فون ہوگا!' کہہ کر برہان چلے گئے۔

لگ بھگ آدھا گھنٹے کے بعد ڈاکٹر برہان لوٹے۔ لڑکھڑاتے، میز، دیوار، کرسی کا سہارا لیتے ہوئے، پکڑتے ہوئے۔ انہیں دیکھ کر ڈاکٹر پرتاپ حیرت میں پڑ گئے۔ آج پئے بغیر ڈگمگا رہے ہیں۔ ان کے چہرے پر شرارت آمیز مسکراہٹ ابھری۔ ڈاکٹر برہان کے نزدیک جانے پر وہ کوئی مزے کا جملہ کسنا چاہ رہے تھے۔ مگر ان کے چہرے پر نظر پڑتے ہی ڈاکٹر پرتاپ کی ہنسی اور شرارت غائب ہوگئی تھی۔ ڈاکٹر برہان کا چہرہ پسینے میں ڈوبا تھا۔ ڈاکٹر پرتاپ گھبرا گئے۔ اپنی جگہ سے اٹھ کر آگے بڑھے۔

'کیا بات ہے، ڈاکٹر برہان؟' ڈاکٹر پرتاپ نے ان کے چہرے اور آنکھوں سے ابلتے پانی کو دیکھ کر بےچینی سے پوچھا۔

'کچھ خاص نہیں، میرے دوست!' کہہ کر شکستہ دلی سے کرسی پر بیٹھ گئے۔ ان کی آنکھوں میں جما پانی گالوں پر بہہ نکلا۔

'فون تو تہران سے تھا نا؟ سب خیریت ہے نا؟' ڈاکٹر پرتاپ نے رومال سے ان کا چہرہ خشک کرتے ہوئے پوچھا۔

'مجھ جیسے یہودی سرگردان کی خیریت پوچھتے ہو؟' ڈاکٹر برہان نے آنکھیں کس کر بند کرتے ہوئے کہا۔ پانی کا ریلا آنکھوں سے نچوڑ کر گالوں پر پچھاڑیں کھانے لگا۔

'چاہیں تو کچھ بتائیں — من ہلکا ہوگا، ڈاکٹر برہان!' ڈاکٹر پرتاپ نے ان کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھا۔

'یہ دیکھو!' ڈاکٹر برہان نے یہ کہہ کر جیب سے پانچ ٹکٹ نکال کر میز پر رکھے۔

'بھیجنے والے تھے انہیں تہران......؟' ڈاکٹر پرتاپ نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے پوچھا۔

'ہاں، مگر......! وہ پانچوں شیراز کی سرزمین چھوڑ کر اوپر آسمان میں سما گئے ہیں!'

'آپ کا مطلب کیا ہے ان باتوں سے؟' ڈاکٹر پرتاپ بے چین ہو اٹھے۔

'ہیلو، ڈاکٹر برہان!' سامنے ماریہ آسمانی لباس پہنے کھڑی تھی۔ برہان اسے دیکھ کر بھی ویسے ہی لٹے لٹے سے بیٹھے رہے۔ ہاتھ ملانا بھی بھول گئے تھے۔

'کیابات ہے ڈاکٹر؟' ماریہ نے گھبرا کر پوچھا۔

'میرا گھر...... شیراز میں میرا خاندان...... سب کچھ ختم ہوگیا ہے۔ سب کچھ مذہب کی آگ میں جل کر راکھ ہوگیا ہے۔' ڈاکٹر برہان نے اپنے کو سنبھالتے ہوئے کہا۔

'گھر سے تار ملا تھا یا خط؟' ماریہ نے کانپتے ہوئے پوچھا۔

'فون آیا تھا۔ کل شام بم کے دھماکے میں پانچوں اڑ گئے۔' ڈاکٹر برہان نے دھیرے سے کہا۔

ماریہ اور ڈاکٹر پرتاپ پتھر کی طرح خاموش ہوگئے۔

'کل تک وطن نہ تھا، آج اپنا کوئی نہ رہا۔' ڈاکٹر برہان نے کہا اور تین پیگ بنانے لگے۔

ڈاکٹر برہان جتنا اپنے کو سنبھالنے کی کوشش کر رہے تھے، اتنا ہی ان کا چہرہ ان کے دکھ کا آئینہ ہو رہا تھا۔ گھڑی کی سوئی نو پر پہنچ گئی تھی۔ میرا رپورٹنگ ٹائم دس بجے تھا۔ میں نے اجازت لی اور کمرے کی طرف چل پڑا۔ سامان نیچے رکھوا کر میں نے ٹیکسی کے لئے کہا۔ سامنے بار میں بھیڑ لگی ہوئی تھی۔ میں نے کاونٹر پر چابی دی۔ بل ادا کیا۔

'ہارٹ اٹیک ہوا ہے۔' بیرا کہتا ہوا لپکا اور فون گھمانے لگا۔ میں نے چلنے سے پہلے ڈاکٹر برہان سے ملنا چاہا تھا۔ ٹیکسی کے لئے کہہ کر آگے بڑھا۔ ہماری میز کے چاروں طرف بھیڑ جمع تھی۔ کیابات ہے؟ ڈاکٹر برہان یہیں کہیں کسی کا معائنہ تو نہیں کرنے لگے ہیں؟ ماریہ—؟ ہاں، ٹھیک تو ہے، ڈاکٹر برہان ماریہ کا بھی علاج کر رہے تھے۔ کہیں اسے ہارٹ اٹیک نہ ہوگیا ہو؟ عورتیں نازک دل ہوتی ہیں۔ پھر ٹھہری مصور، احساسات سے جڑی۔ بھیڑ ہٹا کر میں آگے بڑھا۔ سوئی نو سے آگے بھاگ رہی تھی۔

کندھوں، ہاتھوں کے بیچ سے جیسے ہی میں آگے بڑھا، سامنے کا منظر میرے لئے کسی صدمے سے کم نہ تھا۔ ماریہ کی گود میں ڈاکٹر برہان کا سر تھا اور اس کی آنکھوں سے آنسو گر رہے تھے۔ پاس میں ڈاکٹر اپنا بیگ اٹھا کر خاموش کھڑا تھا۔

لاش اٹھانے کے لئے انتظام ہوگیا تھا۔ ماریہ کے کندھوں پر ڈاکٹر پرتاپ نے دھیرے سے ہاتھ

رکھے۔ اس نے ان کی طرف دیکھا۔ وہاں میں ہی تو تھا اکیلا جو ڈاکٹر برہان اور اس کی جان پہچان کا تھا، جس سے وہ اپنے دکھ کا اظہار کر سکتی تھی۔

ایرپورٹ کی طرف جاتے ہوئے ڈاکٹر پرتاپ کا من بھاری تھا۔ ایران کا ماضی اور حال ان کے سامنے کھلا پڑا تھا اور اس کھلی کتاب کے ہر صفحے پر ڈاکٹر برہان اور ان کے خاندان والوں کی لاشیں تھیں۔

جہاز پر بیٹھ کر ڈاکٹر پرتاپ نے کھڑکی سے نیچے دیکھا۔ فلک بوس عمارتیں سروں پر جلتی قندیلیں اٹھائے کھڑی تھیں۔ انہی فلک بوس عمارتوں کے بیچ بھٹکتا یہودی سرگردان یاد آیا— اپنے وطن کی گز بھر زمین ڈھونڈتا ہوا۔

گونگا آسمان

فرشید نے وفورے پر تریاق کا ٹکڑا لگا کر لمبا کش کھینچا۔ دروازے پر مہر انگیز کے ہاتھوں کی تھاپ پڑی، مگر فرشید کے کان پر جوں نہ رینگی۔ وہ اسی طرح لمبے لمبے کش بھرتا رہا۔ اس کے لئے نشہ کرنا بہت ضروری تھا۔ یہ مہر انگیز کیا جانے؟ ماہ پارہ بھی نہیں سمجھ سکتی ہے اور دلآرام اور شبنور تو ابھی بچیاں ہیں۔

پھولی آنکھوں سے فرشید جب حمام سے باہر نکلا تو دستر خوان پر بیٹھی چاروں عورتوں نے اسے اس طرح دیکھا جیسے کہنا چاہ رہی ہوں، ہمارے رہتے اسے تریاق کی لت کیوں لگ گئی؟

'کھانا نکالوں؟' مہر انگیز نے شوہر کی طرف دیکھ کر پوچھا، مگر فرشید بغیر جواب دیئے دوسرے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔

'میں بلا کر لاتی ہوں۔' ماہ پارہ نے تینوں کی طرف ترچھی نظروں سے دیکھا اور شوہر کے پیچھے گئی۔

'بہت بھوک لگ رہی ہے، میں شروع کر دوں؟' دلآرام نے ٹھنکتے ہوئے کہا۔

'بھوک تو اب مجھ سے بھی برداشت نہیں ہو رہی ہے۔' کہہ کر شبنور نے انگور کے چند دانے منہ میں ڈالے۔

'تم دونوں کھانا کھا کر سو جاؤ۔' مہر انگیز نے ان کے معصوم چہروں کی طرف دیکھ کر کہا۔

'ہاں۔' کہہ کر دلآرام نے پلیٹ میں پلاؤ نکالا اور شبنور نے سالن دونوں تیزی سے کھانا کھانے میں جٹ گئیں۔

مہر انگیز نے دونوں جوان لڑکیوں کے چہروں پر پھیلے الہڑپن کو دیکھا۔ اس میں گناہ کی جگہ معصوم

پاکیزگی تھی۔ اس نے ایک لمبی سانس کھینچی تاکہ گھٹن کا بوجھ کم ہو اور سینہ پھٹنے سے بچ جائے۔ دراصل، وہ ان تینوں سے بڑی تھی۔ فرشید کی اصلی شادی شدہ بیوی وہی تھی۔ یہ تینوں تو بعد میں آئی تھیں۔ ماہ پارہ تیس سال کی جوان عورت شوہر کے مرنے کے بعد فرشید کے ہتھے چڑھ گئی اور یہ دونوں لڑکیاں......

'وہ تو آنکھ بند کر کے پڑگئے۔' ماہ پارہ نے کہا اور قالین پر بیٹھ کر اپنی پلیٹ میں کھانا نکالنے لگی۔

رات کا سناٹا محلے میں پھیل گیا تھا۔ چاروں نے کھانا کھا کر دستر خوان سمیٹا اور اپنے اپنے کمرے کی طرف بڑھیں۔ مہر انگیز اپنے خواب گاہ میں داخل ہو کر فرشید کے پاس پلنگ پر لیٹ گئی۔ یہ اس کا حق تھا، جسے چھیننے یا کم کرنے کی فرشید نے کبھی کوئی ضرورت نہیں محسوس کی اور جب ضرورت محسوس ہوئی تو وہ رات کو اٹھ کر بے دھڑک کسی کے کمرے میں چلا جاتا تھا۔ آخر تینوں کے ساتھ اس نے نکاح کیا تھا۔

پہلے دن سے شبنور اور دلآرام نے ایک بستر پر لیٹ کر سونا شروع کر دیا تھا۔ وہ ایک دوسری کو پل بھر کے لئے اکیلا نہیں چھوڑتی تھیں۔ یہی ان کا احتجاج تھا—اپنے شوہر کی بے جا حرکتوں کے خلاف۔ فرشید ان کے اس اتحاد کو دیکھ کر دل ہی دل میں جتنا کھولا ہو، مگر اوپر سے خاموش رہا۔ منہ کھولتا، ہنگامہ ہوتا، دنیا کو پتہ چل جاتا کہ یہ جوان عورتیں حقیقت میں اس کی لڑکیاں نہیں، بلکہ منکوحہ بیویاں ہیں۔

اس دوران شرارے نام کی عورت بھی ایک دن پکڑ کر لائی گئی تھی۔ مگر نکاح سے پہلے اس نے اپنے بڑے بڑے ناخنوں سے فرشید کا منہ نوچا اور پاگلوں کی طرح چیخی تھی۔ وہ غضب کی حسین تھی۔ پوری آتش پارہ تھی۔ اسے ہاتھ لگانے کی ہمت جب فرشید نے کی تو اس نے اپنے تیز دانتوں سے کاٹ کھایا۔ وہ جسم فروش عورت تھی، یہی اس کا جرم تھا۔ مگر وہ اپنا پیشہ اپنی مرضی سے کرتی تھی، کسی کی زور زبردستی سے نہیں۔ آخر یہ اس کا خاندانی دھندا تھا، جس کے اپنے اصول اور حساب کتاب تھے۔ وہ کسی کی تابعدار نہ تھی، اس لئے جب فرشید بیمار پڑ گیا تو شرارے نے دروازہ کھول کر گھر سے باہر قدم نکالا۔ پہریداروں نے دروازے پر روکا نہیں۔ ماہ پارہ نے پکارا نہیں۔ دلآرام اور شبنور نے اسے اس طرح جاتے ہوئے دیکھ حیرت سے پلکیں جھپکائیں اور مہر انگیز نے ٹھنڈی سانس بھری جیسے

کہا ہو، چلو کسی کے پنکھ تو پھڑ پھڑائے۔

ماہ پارہ کا میاں، عباس خرم شہر میں پٹرول ریفائنری میں افسر تھا۔ شاہی راج میں اسے کسی چیز کی کمی نہیں تھی۔ وہ اقتدار میں کھڑے لوگوں کا داہنا ہاتھ تھا۔ اس بات کا جرمانہ حکومت بدلتے ہی اسے دینا پڑا۔ اس کے پکڑے جانے اور پھر مار ڈالنے کے بعد فرشید، پولس کا افسر ہونے کے سبب، اس کی خوبصورت بیوی اٹھانے میں کامیاب ہو گیا۔ ماہ پارہ اس سارے حادثے سے آج بھی نہیں نکل پائی ہے۔ مگر لوک لاج سے زیادہ مجبوری کے واسطے وہ اس گھر میں رہنے کو مجبور ہے۔ اس کا مائکہ، سسرال، پورا کنبہ قبیلہ جانے کہاں نئے گلے بان نے ہانک دیا ہے۔ اکیلی بھیڑ شکاریوں کے جنگل میں کدھر بھٹکے؟ جدھر ستانے کو کھڑی ہو گی، کسی کی گولی یا تیر سے زخمی ہو گی۔ در در بھٹکنے سے اچھا ہے کہ چند روز ظلم کی چھاؤں میں بسر کر لے۔

صبح ناشتہ پر فرشید کا چہرہ تر و تازہ دیکھ کر مہر انگیز نے دل کی بات زبان پر لانے کی ٹھانی اور فنجان میں چائے بھر کر ایک ادا سے شوہر کے سامنے رکھ کر ہلکے سے مسکرائی۔

'کہو کیا کہنا ہے؟' فرشید کی مخمور نگاہیں کھل کر ہشیار ہو گئیں۔

'خدا نے بہت دیا ہے۔ ان معصوم پرندوں کو اڑا دو، یہ گناہ ہے، دین و مذہب بھی اس کی اجازت نہیں دیتا ہے۔' مہر انگیز نے دھیرے دھیرے ایک ایک لفظ پر زور دے کر کہا۔

'ناممکن ہے۔' فرشید نے کہا اور بدلے چہرے کے ساتھ اٹھ کھڑا ہوا۔

'اس دنیا میں کچھ بھی ناممکن نہیں ہے...... اس سے تو کہیں اچھا ہے کہ مرد باہر حرام کاری کرے اور بھول جائے اس رانڈ کو، مگر ان شریف بچیوں کو ساری عمر قید کر رکھنا کہاں کا انصاف ہے؟' مہر انگیز کی آواز کڑوے بادام جیسی ہو گئی۔

'خاموش۔' فرشید کے منہ کا مزہ بدل چکا تھا۔ اس کے لہجے کا چابک سڑ سڑایا۔

مرد کے جاتے ہی گھر سناٹے میں ڈوب گیا۔ مہر انگیز غصے سے کانپتی اسی طرح سماور کے پاس بیٹھی رہی۔ پوری زندگی مردوں کو باہر منہ مارتے دیکھتی آئی تھی۔ ان بے وفائیوں کی باتیں سنتے سنتے اس

کے کان عادی ہو چکے تھے، مگر یہ نئی رسم تھی کہ سڑک اور گلی کوچے میں پھرتی بیکس مظلوم عورتوں کو، بیواؤں اور بے سہاروں کو سینہ زوری سے اٹھا کر گھر میں ڈال کر ان سے نکاح پڑھوا کر اپنے گناہوں کو ثواب میں بدلنا، غیر مناسب کو مناب بنانا، غیر قانونی حرکت کو قانون کے دائرے میں ڈالنا، روز جنت میں گھومنے کا دعویٰ کرنا اور حوروں کو بے موت مارنا ان کا مذہب اور ایمان ہو گیا ہے۔ کہاں گیا وہ بے لوث مدد کا جذبہ؟

'مجھے اب کچھ کرنا ہو گا...... پنجرے کا دروازہ کھولنا ہو گا اور......'

دلآرام اور شبنور حمام خانے سے شیشے کی طرح دمکتی ہوئی نکل آئی تھیں۔

ماہ پارہ ابھی بھی اپنے کمرے میں پڑی گہری نیند میں ڈوبی تھی۔ صبح ہوتے ہوتے اس کی آنکھ جھپکتی تھی، ورنہ اپنے شوہر، گھر اور رشتے داروں کی یادوں میں ڈوبی وہ پلک جھپکنا بھول جاتی تھی۔ مہر انگیز سے اس کی لڑائی نہیں تھی، مگر دوستی بھی کس لئے ہوتی؟ شبنور اور دلآرام اپنے میں ڈوبی رہتی تھیں۔

مہر انگیز خاموشی سے اٹھی۔ کالی چادر سر پر ڈالی ار دروازے کی طرف بڑھی۔ باہر کھڑے پولس پہریداروں کی پلٹن نے سلام کیا اور جانے کے لئے راستہ دیا۔ ڈرائیور نے کار کا انجن اسٹارٹ کیا، مگر مہر انگیز کار کے کھلے دروازے کو بند کرتی آگے نکل گئی۔ اس کے دل میں پڑی چنگاری آگ کی لپٹوں میں بدلنے کے لئے کالے کوئلے کو دہکانے میں جٹ گئی تھی۔

راستے میں جلوس، نعرے، پوسٹر اور جانے کون کون سے پڑاؤ پڑے، مگر وہ بغیر ان کی طرف دیکھے، رکے آگے بڑھتی چلی گئی۔ وہ ایک گھر کے دروازے پر جا کر رکی۔ گھنٹی بجائی اور اوپر چڑھ گئی۔ یہ اس کے بھائی کا گھر تھا جو اقتدار کا مخالف تھا۔ اس لئے اس کا رشتہ بہن بھائی، ماں باپ سے کٹا ہوا تھا۔

'کیسے؟' ایک ساتھ سارا گھر سوال بن گیا۔ ماں کے چہرے پر ہوائیاں اڑنے لگیں۔

'کچھ نہیں۔' مہر انگیز نے جس طرح کہا اس سے سب کے چہرے پھر کھل اٹھے، ورنہ انہیں اکثر وہ خطرے سے آگاہ کرتی تھی۔ ان کا گھر کئی بار اس کی دی گئی قبل از وقت اطلاع کے سبب تلاشی کے باوجود بچ گیا تھا۔

'گھر میں سب خیریت؟' بڑے بھائی نے پوچھا۔

'ہاں، مگر تم لوگوں پر ایک ذمہ داری ڈالنا چاہتی ہوں۔ فی الحال میرے گھر میں تین اور عورتیں سانس لے رہی ہیں۔' مہر انگیز نے یہ کہتے کہتے نظریں بھائی پر گاڑ دیں۔

'سمجھا۔' بھائی کی مٹھیاں بندھ گئیں۔ یہ کوئی پہیلی نہیں تھی جسے سلجھانے میں اسے دیر لگتی، بلکہ یہ کھلی اور صاف عبارت تھی جس کے معنی میں پوری داستان چھپی تھی، جہاں بے بس عورتیں مرغی کے ٹاپے کے نیچے حفاظت کے نام پر بند کی جا رہی تھیں۔

'دو لڑکیاں دلآرام اور شبنور ایسی پاک صاف کہ ان کے دامن پر نماز پڑھ لو...... چچا سے کہو کہ وہ عباس اور حیدر کے لئے مناسب ہوں گی۔ دونوں کے باپ کو مشہد اور اصفہان میں نشے کے الزام میں پھانسی پر چڑھایا گیا تھا، مگر ان دونوں کا کہنا ہے کہ یہ صرف الزام تھا۔ بات ان کی دولت ہتھیانے کی تھی، جو محلے کے غنڈے نے دین کے نام پر کر دکھائی اور لڑکیاں ادھر ہانک کر لائی گئیں تو......'

'وہاں سے انہیں نکالو گی کب اور کیسے؟' بھائی کے چہرے پر گہری الجھن چھا گئی تھی۔

'پرسوں شام کو چار بجے، کسی نیوتے میں جانے کے بہانے سے باہر نکلوں گی۔'

'فرشید؟' ماں بولی۔

'وہ صبح ہی شیراز جانے والے ہیں۔' کہتی ہوئی مہر انگیز اٹھی اور چادر لپیٹ کر تیزی سے سیڑھیاں اترتی سڑک پر چلتی بھیڑ میں گم ہو گئی۔

پھل پھول اور مٹھائی سے لدی جب وہ گھر پہنچی تو تینوں نے اسے غور سے دیکھا۔ مہر انگیز نے چیزیں ان کی طرف بڑھائیں اور خود کمرا بند کر کے فرشید کی الماری کھول کر فائلیں دیکھنے لگی۔ تینوں نکاح نامے اس نے پھاڑے اور باتھ روم میں آگ لگا کر انہیں بہا دیا۔ اسے بہاتے ہوئے دل ہی دل میں کہا، 'یہ کیسا نکاح ہوا جو لڑکی کی مرضی سے نہ ہو کر مرد کی ہوس سے ہو؟'

جب وہ کپڑے بدل کر باہر نکلی تو شبنور اور دلآرام نے پھولوں کو بڑے سلیقے سے گلدانوں میں سجادیا تھا۔ ماہ پارہ نے گنگناتے ہوئے بھاپ اڑاتے سماور پر چائے دان کی کیتلی نیچے اتار فنجان بھرے اور کیک مٹھائی سے پلیٹیں سجادیں۔ ایک سوغات نے کتنی ان کہی باتیں کہہ کر ان چاروں عورتوں کو ایک چوراہے پر کھڑا کر دیا تھا۔ لگ رہا تھا مانو آج مہینوں بعد گھر کی چہار دیواری میں زندگی اتری ہو۔

'میں نے پھاڑ ڈالا نا آخر۔' چائے کا آخری گھونٹ بھر کر مہر انگیز نے کہا۔

'آخر کیا؟' ماہ پارہ نے نظریں اٹھائیں۔

'تم تینوں کی قید کا پروندا۔' مہر انگیز دھیرے سے بولی۔

'یعنی؟' ماہ پارہ جملہ کے ختم ہونے سے پہلے ہی صبر کھو بیٹھی۔

'اب تم لوگ آزاد ہو۔' مہر انگیز نے کہا۔

'مگر کہاں جانے کے لئے؟' شبنور کی گہری آنکھیں خوف سے پھٹ گئیں۔

'خطرہ ہمارے لئے زیادہ بڑھ گیا ہے۔ بغیر کسی رشتے اور سند کے ہم کہاں جائیں گے؟' دلآرام یکایک پھپھک پڑی۔

'پہلے سنو تو۔' ماہ پارہ کی آواز ابھری، مگر اس کے دل کی بات چہرے پر پیلے رنگ سے رنگ گئی تھی کہ آخر اس عورت نے تینوں سوتنوں سے بدلہ لینے کی ٹھان لی ہے۔ آگے کا راستہ شہد کے چھتوں سے گزرنے والا ہوگا۔

'میرے چچا کے دو لڑکے ہیں۔ ان سے تم دونوں کا نکاح پرسوں رات کو ہوگا۔ تم یہاں کی بہ نسبت وہاں زیادہ سکھی رہو گی اور...... ' باقی باتیں مہر انگیز کے گلے کے رندھنے سے ادھوری رہ گئیں۔

دونوں لڑکیاں پہلے مہر انگیز کو حیرت سے تاکتی رہیں، پھر یہ سب کچھ سمجھ کر ایک ساتھ ایک آواز میں رو پڑیں۔ اس پنجرے سے وہ تال میل بٹھا چکی تھیں۔ چڑی مار کے خلاف محاذ بھی سنبھال رکھا تھا۔ اب انہیں کہاں، کس گھر میں، کن لڑکوں کی بیویاں بننا پڑے گا؟ ان کے کنوارے خوابوں کا کیا

ہو گا؟اسے دوستی سمجھیں یا نئی دشمنی؟

'تم ماہ پارہ! میرے گھر رہو گی۔ میری ماں ہے، ایک بھائی جس نے شادی نہیں کی، اس پر سماج، ملک کا بھوت سوار رہتا ہے۔ وہ گھر ایک سیاسی گھر ہے۔ اس میں جان ہتھیلی پر رکھ کر جینا پڑتا ہے۔ میری خواہش ہے کہ تم اس گھر کو اپنا سمجھو، دل ملے تو سب کچھ اپنالینا، چونکہ تم زندگی کا گرم وسرد دیکھ چکی ہو، اس لئے فیصلہ تم پر چھوڑا۔' اتنا کہہ کر مہرانگیز نے ماہ پارہ کی طرف دیکھا۔

ماہ پارہ چند لمحے سکتے کے عالم میں بیٹھی رہی۔ پھر یکایک مہرانگیز سے لپٹ کر رو پڑی۔ برسوں کا رکا باندھ جیسے اپنی راہ تلاش کر بیٹھا تھا۔ چاروں جب رو دھو کر ہلکی ہوئیں تو اگلے منصوبے کی تیاری میں جٹ گئیں۔ مہرانگیز کے پاس انقلاب کے بعد لٹے ہوئے گھروں کے سامان سے صندوق بھرے پڑے تھے۔ قیمتی سجاوٹی سامان، ہیرے پنے، موتی اور سونے کے زیورات......اس نے چابی اٹھائی اور تہہ خانے میں تینوں کے ساتھ اتر گئی۔

رات کے کھانے پر فرشید کو ماحول آرام دہ لگا۔ سب کے چہروں پر سکون اور صبر دیکھ کر اسے اچھا محسوس ہوا، مگر ساتھ ہی ساتھ بڑا عجیب سا لگا کہ شبنور اور دلآرام نے اسے کئی بار نظر بھر کر دیکھا۔ ماہ پارہ کھانا کھاتے وقت اپنے آپ ایک دو بار مسکرائی اور مہرانگیز اسی ٹھنڈی اور اعتماد سے بھری تھی کہ اسے شک سا ہونے لگا کہ یہ وہی عورت ہے یا...... ماں بھی تو پانچ بچوں کے ساتھ اس کے بچپن میں اسی طرح بیٹھ کر بغیر کسی کے کچھ مانگے، ان کی ضرورت سمجھ کر سب کی پلیٹوں میں کھانا نکالتی، روٹی بانٹتی، عجیب خوشی سے بھری رہتی تھیں۔ اسے صبح جانا نہ ہوتا تو وہ ان سب کو کسی پہاڑی کی طرف پکنک پر لے جاتا، مگر......

رات ڈھلنے لگی، مہرانگیز کے برتاؤ کو فرشید نے باندھے رکھا۔ اس کا دل چاہا ضرور کہ ایک بار وہ شبنور اور دلآرام کو بانہوں میں بھر لے یا ماہ پارہ کو کسی ہرنی کی طرح کشتی میں ہرا کر اپنے بس میں کر کے اپنی رگوں میں توڑتی ہوس شانت کر لے، مگر مہرانگیز نے اندر سے دروازہ بند کر کے خود اپنے کپڑے کم کرنے شروع کر دیئے تھے، جسے دیکھ کر اس کا ارادہ بدل گیا اور مہرانگیز کی لگائی آگ سے وہ اپنے کو زیادہ دیر بچا نہ سکا۔

دوپہر کو گھر پر موجود پہریداروں کو شک تو ہوا، مگر وہ پوچھتے کیا؟ سامان کے ساتھ چاروں خوش خوش نکلی تھیں۔ چونکہ گھر پر ایک ہی گاڑی تھی۔ اس لئے مہرانگیز نے ٹیکسی منگوا کر سامان لدوایا تھا۔ وہ دو گھنٹے بعد سالگرہ کی پارٹی سے لوٹنے کی بات کہہ کر نکلی تھی۔

مہرانگیز شام کے قریب لوٹی۔ وہ پہریدار جوان تینوں پر کڑی نظر رکھے ہوئے تھے، اسے خالی ہاتھ اکیلے ٹیکسی سے اترے دیکھ کر چونکے۔ مہرانگیز کے اندر جانے کے بعد انہوں نے ٹیکسی والے سے پوچھ تاچھ کی، مگر انہیں صرف اتنا پتہ چلا کہ مہرانگیز نے سڑک پر چلتی ٹیکسی روکی تھی۔ ایک پہریدار کو اندر جاکر مہرانگیز سے پوچھنا پڑا اور جب اسے پتہ چلا کہ تینوں راستے میں خریداری کے بہانے کہیں بھاگ گئیں تو اس کے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے۔

'کس بازار؟ کون سی دکان......؟' اس نے گھبرا کر پوچھا اور پورے عملے کے ساتھ انہیں ڈھونڈنے نکل پڑا۔ اس کو دو طرح کی گھبراہٹ تھی۔ ایک تو یہ کہ افسر کو کیا جواب دے گا؟ دوسرے یہ کہ اگر وہ کسی کے ہتھے چڑھ گئیں اور کچھ لوگوں کو اصلیت کا پتہ چل گیا تو خاصہ ڈرامہ ہو جائے گا۔

تیسرے دن جب فرشید شیراز سے لوٹا تو تحفوں سے بھرا ہوا تھا۔ جس چہل پہل کی اسے امید تھی، اس کی جگہ اس نے گھر میں سناٹا دیکھا۔ تینوں کے کمروں میں جھانکا تو بستر کو خالی پایا۔ اپنے کمرے میں البتہ مہرانگیز نماز پڑھ رہی تھی۔ اس نے باہر نکل کر دروازے پر یوں ہی نظر ڈالی، پھر اندر مڑنے لگا۔ تبھی باڈی گارڈ نے کہا، 'جناب، افسوس ہے کہ ان تینوں کا کہیں پتہ نہ چل پایا۔'

'کون تینوں؟' فرشید چونک کر بولا۔

'چاروں ایک ساتھ سالگرہ میں گئی تھیں، مگر شام کو بڑی خانم اکیلی لوٹیں۔ انہوں نے بتایا کہ خریداری کے بیچ دکانوں کی بھیڑ بھاڑ میں وہ ان سے بچھڑ گئیں۔ بہت ڈھونڈا مگر وہ نہ ملیں، تب شام ڈھلے انہیں لوٹنا پڑا۔'

'اف!' فرشید کا ادھیڑ چہرہ ہارے ہوئے جواری کی طرح سفید پڑ گیا۔ تھوڑی دیر وہ بت بنا کھڑا رہا، پھر یکایک چونک کر بولا، 'کوئی آیا تھا؟'

'نہیں، جناب۔' گارڈ نے مستعدی سے جواب دیا۔

'کسی کا فون آیا تھا؟' فرشید کی آنکھیں دور کہیں کچھ تلاش کر رہی تھیں۔

'تین دن تک کوئی فون کسی نے گھر سے نہیں کیا۔ آپ کے جانے کے بعد سے ٹیپ لگا دیا تھا جو خالی ہے۔'

'ہوں...... 'فرشید نے گہری سانس لی۔ گارڈ کو جانے کا اشارہ کر کے وہ خود اندر آیا۔

'تم کب آئے؟' مہرانگیز جائے نماز لپیٹتے ہوئے میٹھی آواز میں بولی۔

'ابھی۔' دھیرے سے ہونٹ بھینچ کر فرشید بولا۔

'ہاتھ منہ دھو لو، میں پھل لاتی ہوں۔' کہہ کر وہ بڑے اطمینان سے اٹھی۔

'ہوں...... 'گردن ہلاتا ہوا فرشید مہرانگیز کے چہرے پر کچھ پڑھنے کی کوشش کرنے لگا۔

مہرانگیز باہر نکل کر فوراً ہی پھل اٹھائے کمرے میں داخل ہو گئی، 'لو کھاؤ۔'

'یہ حرکت تمہاری ہے نا؟' جرم اگلوانے میں ماہر پولس افسر نے یکایک بیوی کی کلائی پکڑ لی۔

'کیسی حرکت؟' مہرانگیز نے کلائی چھڑانے کی کوشش کی۔

'تینوں کو پنجرے سے اڑانے کی...... 'پکڑ مضبوط ہو گئی اور آنکھوں میں ناچتی وحشت بڑھ گئی۔

'نہیں۔' خوفزدہ سی مہرانگیز کراہ اٹھی۔

'بولو...... سچ بولو۔' دانت پیستا ہوا فرشید اس کا ہاتھ مروڑنے لگا۔

'مجھے نہیں پتہ۔' مہرانگیز نے تڑپ کر کہا۔

'وہ میری منکوحہ بیویاں تھیں، سمجھی؟ ان پر میرا حق تھا۔ انہیں ڈھونڈنے کے لئے میں پورا شہر چھلنی کی طرح چھنوا دوں گا۔'

'تم کچھ بھی کرو، مگر مجھ سے اس طرح پیش مت آؤ۔ میرا بھی حق ہے، عزت ہے، میں تمہاری

منکوحہ بیوی ہوں۔'

'تمہیں نہیں چھوڑوں گا۔ تم نے میری غیرت کو للکارا ہے۔ میری عزت کا مذاق اڑایا ہے۔ تم میری بیوی نہیں، میرے مقابلے پر کھڑی میری حریف ہو اور اپنے مد مقابل کو ہرانا میری زندگی کا مقصد رہا ہے۔' کہتا ہوا فرشید اٹھا اور کمرے سے باہر نکل گیا۔

مہرانگیز درد سے دوہری ہو کر پلنگ پر لوٹ گئی۔ اس کا ہاتھ شاید اکھڑ چکا تھا۔ وہ بے سدھ سی پڑی تھی۔ اسے معلوم تھا کہ سب سے پہلا حملہ اس کے مائیکے پر اقتدار کے دشمن کے نام پر کیا جائے گا، مگر وہاں کوئی نہیں ملے گا۔ پروگرام کے مطابق چچا اور بھائی کا کنبہ اس وقت مشہد کے ایک گاؤں میں لمبی چھٹیاں منانے اپنے دوست کے یہاں پہنچ گیا ہوگا۔ ان کو پکڑ پانا اب فرشید جیسے مستعد افسر کے لئے بھی ناممکن ہوگا۔ اس نے چین کی سانس لی اور کسی طرح اٹھ کر اپنے ہاتھ پر بام ملنا شروع کیا۔

شام تک گھر میں چند جوان عورتیں اور پانچ چھ لڑکیاں پکڑ کر لائی گئیں۔ اسی کے بعد پولس افسر فرشید کی طرف سے مہرانگیز کی گرفتاری کا وارنٹ جاری ہوا جس میں اس پر عورتوں سے دھندا کرانے کا الزام تھا۔ اخبار والوں سے گھر بھر گیا۔ مہرانگیز کی تصویریں کھینچیں۔ وہاں جمع لڑکیوں کو ان کے گھر واپس بھیجنے کی اپیل اخبار کے ذریعے چھپی۔ ہر جگہ فرشید کی تعریف تھی۔ ان مغویہ لڑکیوں اور عورتوں کے ماں، باپ، شوہر، بھائی جاتے جاتے مہرانگیز پر آنکھوں سے نفرت اور منہ سے تھوکنا نہ بھولتے تھے۔

'پولس کے گھر میں یہ اندھیر؟'

'ہم سمجھتے تھے کہ پولس ظالم ہوتی ہے، مگر یہ گناہگار عورت...... سچ کہا ہے کسی نے — بد اچھا بدنام برا۔'

'ایسے شریف مرد کی بد چلن بیوی، خدا اسے کبھی معاف نہیں کرے گا۔'

'اسے تو طلاق دے کر، اس فرشتے کو اب دوسری شادی کر لینی چاہئے۔'

مہرانگیز چپ چاپ سارے طعنے سنتی رہی۔ اندر اندر خوش تھی کہ بدنام ہوئی تو کیا، گناہگار تو نہیں ہے وہ۔ اس نے ظلم کے پنجے سے کسی کو نجات دلائی، یہ کیا کم بہادری کا کام ہے؟

کئی دن گزر گئے مہرانگیز چپ چاپ گھر میں ایک اداس زندگی گزار رہی تھی۔ باہر نکلنے اور ملنے جلنے پر روک لگ گئی تھی۔ فرشید بھی اس سے سیدھے منہ بات نہیں کر رہا تھا۔ اب وہ باہر سے کھاپی کر آتا اور الگ کمرے میں پڑ کر سو جاتا تھا۔ مہرانگیز رات دن تنہائی میں گھٹنے لگی تھی۔ وہ تینوں کی خیریت کے لئے بھی بےچین تھی۔ وقت پنکھ لگا کر بھاگ رہا تھا۔

ایک رات اس نے دوسرے کمرے سے رونے اور چیخنے کی آواز سنی۔ وہ ہڑبڑا کر اٹھی، جیسے کوئی ڈراؤنا خواب دیکھ رہی ہو۔ نیند کا خمار جب ٹوٹا تو اسے کوئی آواز نہیں سنائی پڑی۔ اس نے گھبرا کر جائے نماز بچھائی اور سجدے میں گر گئی۔ شاید اس در پر اسے سکون مل جائے۔ پو پھٹتے ہی وہ کمرے سے باہر نکلی، مگر آگے بڑھتے قدم وہیں جم گئے۔

سامنے ایک خوبصورت جوان عورت فرشید کے کمرے سے نکل رہی تھی۔ وہ اسے دیکھ کر ایسی خوفزدہ ہوئی کہ الٹے پیر کمرے میں بھاگ گئی۔ مہرانگیز کو کاٹو تو خون نہیں۔ اسے ہلکا سا چکر محسوس ہوا اور وہ دروازہ تھام وہیں ٹک گئی۔ اس کے کانوں میں اس عورت کی لرزتی آواز گونج رہی تھی۔

'وہ تمہاری عورت ...... مجھے پکڑ لے جائے گی، مجھے گھر چھوڑوادو آغا...... تم نے ایک رات کی بات کی تھی۔ میرے ساتھ دھوکہ مت کرو۔ مجھے میرے بھائی کی آزادی چاہئے تھی...... میرے ساتھ دشمنی مت کرو۔' کہتے کہتے عورت فرشید کے قدموں پر اپنا سر رکھ کر وہیں روتے روتے نیم بیہوش سی ہو گئی۔

'اٹھو، ڈرو مت! میں ابھی تمہیں سیدھے تمہارے بھائی کے پاس بھیجتا ہوں۔ اس کے ساتھ خوشی خوشی گھر لوٹنا۔' کہہ کر فرشید نے اس عورت کو اٹھانا چاہا۔

'یہ سب کیا ہے؟' دہکتا آتش کدہ بنی مہرانگیز دروازے پر کھڑی تھی۔

'حرام کاری...... اسی کی بات تو تم جب تب دہراتی رہتی تھیں۔ کم سے کم یہ نکاح کر کے گھر کے قید

خانے میں ڈالنے والا ظلم تو نہیں ہے نا؟' فرشید نے نفرت سے کہا۔

'اسے اپنے ناپاک ہاتھ مت لگانا۔' مہر انگیز نے شوہر کو للکارا۔

'نہیں، نہیں۔' وہ عوت ہوش میں آکر اپنی طرف بڑھتی مہر انگیز کو دیکھ کر ڈر سے چیخی اور فرشید کے سینے سے لپٹ گئی۔

'عجیب بات ہے! یہ تم سے ڈر رہی ہے؟' فرشید نے ہنس کر کہا اور عورت کو چمکارا۔

اس وقت مد مقابل کو پچھاڑ کر اس کے سینے پر فاتح کی طرح پیر رکھ کر کھڑے ہونے کا سکھ فرشید کی آنکھوں میں نفرت کے سیلاب کے باوجود صاف چھلک رہا تھا۔ایک عورت کو دوسری عورت کے خلاف کھڑا کر دینے کی یہ سازش مہر انگیز کی سمجھ میں پوری طرح آچکی تھی۔ آخر اس کی آدم قد تصویریں یوں ہی تو اخباروں میں نہیں چھپوائی گئی تھیں۔ اس کے دونوں ہاتھوں کی تنی مٹھیاں دھیرے دھیرے ڈھیلی پڑ گئیں۔ فرشید سینے سے لپٹی عورت کو بانہوں کے گھیرے میں باندھے کمرے سے باہر نکل گیا۔

جانے کس انجانی طاقت کے تحت اس کے دونوں پیر فرشید کے پیچھے اسے لے گئے۔ گھر کے کھلے دروازے سے اس نے جیسے ہی پورٹیکو میں قدم رکھا، دو کراس بندوقوں نے اس کا راستہ روک لیا، جیسے شریف عورتوں کی عزت بچانا، وہ بھی اس جیسی عورت سے، ان رکھوالوں کا سب سے بڑا مذہب ہو۔

وہ بے بس سی کھڑی رہ گئی۔ پولس کی گاڑی فرشید اور اس عورت کو لے کر تیزی سے نکل گئی۔ مہر انگیز کے ہونٹ سب کچھ جاننے کے بعد اس عورت کی وکالت میں کھل نہ سکے۔ فی الحال کھلتے بھی تو اب اس کا یقین کون کرتا؟ اس نے جنگلے سے باہر جھانکا، جہاں گونگے آسمان پر سورج کا گولہ نکلنے والا تھا۔

زیتون کے سائے

میں ایک پرانی عمارت ضرور ہوں، مگر میرے سینے پر خط کوفی کے لفظوں کا ابھار آج بھی زندہ ہے۔ میرا سر وہ تاریخی گنبد ہے جس نے زمانے کی دھوپ چھاؤں کے بعد بھی اپنا رنگ وروغن کھویا نہیں ہے۔ میری پیشانی پر جھلملاتا سونے کا پنجہ دیکھ رہے ہو جو آج بھی سورج سے آنکھ ملانے کا حوصلہ رکھتا ہے، جس کے ایمان کی گرمی دلوں میں نور کی قندیلیں روشن کرتی ہے۔ جس کا دین انسان کو انسان سے محبت کرنا سکھاتا ہے اور جس کی آواز کا پیغام سورج کے نکلنے سے قبل چاروں سمت کے بند دروازے کھولتا ہے۔ تم اسے ایک ویرانہ سمجھ بیٹھے ہو؟ میں ایک پرانی تاریخی عمارت ضرور ہوں، مگر کھنڈر ہرگز نہیں۔ توفیق کی آنکھوں میں پھیلی دھوپ میں تڑپتی یہ سنہری عبارت صاف نظر آرہی تھی، جسے پڑھنا اسرائیلی کمانڈر کے لئے کوئی مشکل کام نہیں تھا۔

'میں دوستی کا ہاتھ تمہاری طرف بڑھاتا ہوں...... ہمیں تمہارے اگلے منصوبوں کا خلاصہ چاہئے...... اسے ہمارا معاہدہ سمجھو...... دوستی کی کسوٹی جو آگے پھل پھول سکتی ہے...... یادرکھو دوست! ہم سے چالاکی نہیں چلے گی۔ مت بھولو کہ تم نہتے ہو اور ہماری حراست میں ہو۔' ایک گہری نظر اسرائیلی کمانڈر نے توفیق کے چہرے پر ڈالی اور سگار کا آخری کش کھینچ کر اس کا لال سرا ایش ٹرے میں رگڑتے ہوئے اپنا داہنا ہاتھ آگے بڑھایا جو چند ثانیہ بعد ہوا میں ڈولتا ہوا واپس اس کی پینٹ کی جیب میں چلا گیا۔

'کمانڈر! تم اس تاریخی عمارت کے اندھیرے تہہ خانوں میں اترنا چاہتے ہو؟ تمہارے ہاتھ میں پکڑا ہوا تجسس سے لبریز چراغ کتنا ہی روشن کیوں نہ ہو مگر میرے اندھیارے تہہ خانوں میں اجالا نہیں بکھیر سکتا ہے۔ ان پیچ دار گلیاروں کی اپنی ایک تاریخ ہے جو غم کی روشنائی اور کشمکش کے قلم سے لکھی گئی ہے۔ اس عبارت کو تمہاری آنکھیں کبھی نہیں پڑھ سکتی ہیں، جسے گزرتے وقت نے اپنے ہاتھوں سے اس عمارت کی دیواروں پہ تحریر کیا ہے، جس کے ہر لفظ میں دھدکتے آتش فشاں سوئے پڑے ہیں۔'

توفیق کی گردن اسی طرح تنی رہی، جبڑے کسے رہے اور ہونٹ ایک دوسرے پر منجمد رہے۔

'تم کمانڈر کو ختم کرنے آئے تھے مگر کمانڈر کے جال میں پھنس گئے اور اپنے ساتھیوں کے ساتھ ساتھ ہیلی کاپٹر سے بھی ہاتھ دھو بیٹھے...... کمانڈر نے وحشیانہ قہقہہ لگایا۔

'کمانڈر! تم مجھ پر طنز کے جتنے تیر چاہو پھینک کر اپنا ترکش خالی کیوں نہ کر ڈالو مگر میں تمہارے اکسانے کے باوجود اپنی زبان نہیں کھولوں گا۔ چاہے میرے دل و دماغ میں اٹھتا غم وغصہ کا یہ اتھاہ سمندر مجھے پینا ہی کیوں نہ پڑ جائے۔ یاد رکھو، میری یہ خاموشی نہتی نہیں ہے اس میں تلوار کی دھار جیسی تیزی ہے جو تمہارے صبر کو چاک چاک کر کے تمہیں دیوانہ بنا دے گی۔' توفیق کی آنکھوں کی دھوپ اس کے چہرے پر چمکنے لگی تھی۔

'اگر تم کامیاب ہو جاتے تو ہمیشہ کی طرح تمہارے اس گوریلا حملے کا جواب تمہاری پوری بستی اجاڑ کر دیا جاتا، مگر دیکھو نا، میں بچ گیا...... اس کا انعام تمہیں یقیناً ملے گا...... میں بہادروں اور حوصلہ مندوں کی بڑی قدر کرتا ہوں اس لئے تمہاری جان بخشتا ہوں، مگر ایک شرط کے ساتھ کہ اب تم ہمارے لئے کام کرو گے اور اپنی تنظیم کے سارے راز کھولو گے جس کے عوض ہم تمہیں بحفاظت سرحد پار پہنچانے کا قول دیتے ہیں۔' کمانڈر کے مسکراتے چہرے پر ایک خطرناک سنجیدگی چھا گئی۔

'کمانڈر! تمہیں شاید علم نہیں ہے کہ ہم نے دنیا میں فتح کے پرچم لہرائے ہیں، اس لئے ہمارے اس آب و تاب کو مت للکارو ورنہ موت کی بازی ہم ہی جیتیں گے۔ جنہوں نے پیدا ہوتے ہی سر پر کفن باندھ لیا ہو، وہ زندگی کی بخشش قبول نہیں کرتے ہیں بلکہ سر کا نذرانہ پیش کرتے ہیں۔' توفیق کی بڑی بڑی شربتی آنکھوں میں کھڑکی سے جھانکتے زیتون کے درختوں کا عکس جھوم اٹھا۔

'تم شاید تھکے ہوئے ہو۔ آرام کرنا چاہتے ہو۔ تمہیں میں ایک بات بتانا چاہتا ہوں کہ ایک فوجی کی زندگی میں اس کا داہنا ہاتھ کتنا اہم مقام رکھتا ہے اور افسوس...... تمہارا داہنا ہاتھ کندھے سے اکھڑا ہے اور کلائی کی ہڈی ٹوٹ چکی ہے۔ علاج نہ ہونے پر تم زندگی بھر جھولتے ہاتھ کے مالک بن جاؤ گے ...... اپنی زندگی کو بنانا اور سنوارنا اب تمہارے ہاتھوں میں ہے۔ ویسے تم اس حقیقت سے آگاہ ہو گے کہ لنگڑے گھوڑوں کو گولی ماردی جاتی ہے، کیونکہ وہ فوج کے لئے ناکارہ ثابت ہوتے ہیں۔' کمانڈر دھیرے دھیرے مسکراتا ہوا توفیق کی طرف بڑھا اور اس کے شانوں کو ہلکے سے تھپتھپایا۔

'میرے یہ دونوں کندھے اس تاریخی عمارت کے دو چھوٹے گنبد ہیں، جن کے اندر سے اوپر جانے والی سیڑھی برسات کی رات کی طرح سیاہ ہے، جن پر چڑھنے کا حوصلہ تم میں نہیں ہے۔ تم شاید بھول گئے ہو کہ میرا وجود وقت کی تپش سے پگھل کر پہلے سے زیادہ مضبوط ہو گیا ہے، جس کی بنیاد فلسطین کی زمین میں گہری دھنس چکی ہے، جس کو اکھاڑنا تم اسرائیلیوں کے بس کی بات نہیں۔' توفیق کی پتلیوں میں جھومتے درختوں کی شاخ پر بیٹھے پرندے چہچہا اٹھے۔

'تم جوان ہو، سمجھ دار ہو، اچھی طرح سے جانتے ہو کہ فلسطین نام کا کوئی ملک دنیا کے نقشے پر باقی نہیں بچا ہے، پھر اس دھوکے میں پڑے تم اپنی جان گنوانے پر کیوں تلے ہوئے ہو؟ آخر تم یہ سب کس کے لئے کر رہے ہو؟ اپنی گوریلا تنظیم کے صدر کے لئے، جس کے پاس واپس لوٹنے کا راستہ بھی نہیں بچا ہے۔ لیکن تم کیوں بند گلی کے سفر پر نکل پڑے ہو؟ ایک انسان کی خواہش کبھی بھی پورے سماج کی بھلائی کی برابری نہیں کر سکتی ہے۔ کٹ رہے ہو، مر رہے ہو— آخر کس کے لئے؟ فلسطین صرف ایک نام ہے۔ ہوا میں تیرتا ہوا، جس کا زمین پر اب کوئی وجود باقی نہیں بچا ہے۔' نرمی سے سمجھاتے ہوئے کمانڈر آخر میں زور سے قہقہہ مار کر ہنس پڑا۔

'فلسطین کو کون مٹا سکتا ہے کمانڈر! فلسطین عظیم طاقتوں کا پھینکا ہوا سیاسی سکہ نہیں ہے، بلکہ زمین کا وہ جلا آبلہ ہے، جو ٹھنڈا ہو کر 'کنعانیوں' کی جائے پیدائش میں ڈھلا تھا۔ یروشلم دنیا کی سب سے پرانی بستی، امن کا گھر، تینوں مذاہب کی پیدائش کی جگہ درحقیقت تہذیب کا دل ہے۔ تم! عظیم طاقت کے منادی گو ادھار مانگی ہوئی بارودی طاقت سے کیا تاریخ بدل ڈالو گے؟ صدیوں سے پڑے خطوں خطوں پر نیا نام کھودو گے۔' توفیق کی آنکھوں میں جھومتے زیتون کے درختوں پر چہچہاتے پرندے کمانڈر کے خوف ناک قہقہوں کے شور سے پنکھ پھڑ پھڑا کر اڑ گئے اور توفیق کی آنکھوں کی عبارت کا سونا جھلملا اٹھا۔

'آج نہیں تو کل تمہیں منہ کھولنا پڑے گا ...... چاہے دوستی سے، چاہے دشمنی سے۔ اس کا فیصلہ تمہارے اوپر چھوڑتا ہوں، کیونکہ تم اپنے صدر کے دائیں نہ سہی بایاں ہاتھ تو ہو، یہ راز تو ہم پر کھل چکا ہے۔ کل صبح تک تمہیں سوچنے کا موقع دیتا ہوں۔' کمانڈر کے چہرے پر فیصلے کی سختی ابھر آئی۔

'فقط کل صبح تک کیوں؟ بلکہ کل کی طرح کئی ہزار صبح بھی کمانڈر، تم انتظار کرو گے تو بھی میرے ہر

انکار پر میری ایک ہزار جانیں قربان!' توفیق کی آنکھوں میں جھومتے درخت پکی زیتونوں کو زمین پر گرانے لگے۔

'مجھے پورا یقین ہے کہ تم ایک سمجھدار نوجوان کی طرح وقت کی نزاکت کو سمجھ کر ہمارے لئے مخبری کرنا منظور کرلو گے۔ بہرحال کل کے فیصلے کے لئے میری نیک خواہشات تمہارے ساتھ ہیں۔ اب تمہیں آرام کی ضرورت ہے۔' کمانڈر کے ابروؤں کے ہلتے ہی سپاہی آگے بڑھے۔ مشین گن تھامے فوجی توفیق کے دونوں طرف آکر کھڑے ہوگئے۔ توفیق کی آنکھوں میں پھیلے سوالوں کے جنگل میں ڈوبتے سورج نے آگ سی لگادی تھی۔ توفیق اسی سورج کو گردن پر اٹھائے کمرے سے باہر نکلا۔

ادھیڑ عمر کا اسرائیلی کمانڈر توفیق کے جاتے ہی گہری سوچ میں ڈوب گیا۔ چہرے پر پھیلی سنجیدگی نے اسے عمر سے زیادہ بوڑھا بنادیا۔ تھوڑی دیر وہ دیوار پر لگے نقشے کو گھورتا رہا، پھر آگے بڑھ کر اس نے دروازہ کھولا اور ایک نقشہ میز پر پھیلادیا۔ پھر سوچتی آواز میں سامنے بیٹھے افسروں سے بولا — 'کچھ دنوں کے لئے ہمیں اپنے دوسرے ٹھکانے پر چلا جانا چاہئے۔ یہ چھاؤنی خطرے کی نذر ہو چکی ہے۔ آج سے ہی کوچ کرنا شروع کردو، حفاظت کا سوال اہم ہے......!' کہتا ہوا کمانڈر پنسل سے کاغذ پر نشان لگانے لگا۔

مشین گن کی چھاؤں میں جب توفیق چلتا ہوا کمرے سے باہر نکل کر کھلے میں آیا تو سورج ڈوب رہا تھا۔ اس کی وداع ہوتی کرنیں درختوں کے سایوں کو زمین پر لمبائی میں پھیلا رہی تھیں۔ راستہ کچی پکی زیتونوں سے بھرا ہوا تھا۔ بہت سنبھال کر قدم رکھنے پر بھی زیتون اس کے جوتوں کے نیچے دب دب کر عجیب آوازیں پیدا کر رہی تھیں۔ ان کی اس طرح پھٹنے کی آواز کو سن سن کر اسے بڑی تکلیف پہنچ رہی تھی۔ یکایک اس کا دل بچوں کی طرح مچل اٹھا کہ وہ بھاگ کر جائے اور زمین پر بکھری زیتونوں کو چن چن کر اپنے منہ میں ڈال لے۔ ان سے اپنی قمیص کا دامن اور جیبیں بھرلے۔ مگر اس نے اپنی اس خواہش کو روکا۔ بھلے ہی یہ اس کی اپنی سرزمین ہے مگر فی الحال تو وہ اسرائیلی سرحد کے دائرے میں ہے اور وہ اپنے وطن کا شہری نہ ہو کر یہاں ایک قیدی ہے۔ اپنے ہی علاقے میں بس ایک قیدی۔

توفیق زیتونوں کو دیکھتا ہوا راستہ طے کر رہا تھا۔ تبھی اپنے چہرے پر آکر لگے کنکر کی چوٹ سے وہ چونک پڑا۔ ایک دو تین چار۔ اس نے اچک کر اپنا چہرہ بچاو کے لئے ادھر ادھر گھمایا۔ قہقہوں کو سن کر اس نے نظریں اٹھائیں۔ بیرک کے سامنے کھڑے چند فوجی زیتونیں کھا کر ان کی گٹھلی اس کے منہ پر تھوک رہے تھے۔ ایک گھنونی چپچپاہٹ چہرے سے گزرتی ہوئی اس کے سارے وجود میں سوزش کی طرح پھیل گئی، جیسے تیل کے کنویں میں فلیتہ لگ گیا ہو۔ ان کے قہقہے اس کے کانوں کے پردے پھاڑنے لگے۔ جیسے کہہ رہے ہوں: 'دیکھا، ہمارا نشانہ، خطا ہونے والا نہیں ہے۔ تبھی ہم دشمن کے شہروں کو ویرانی میں اور ان کے چہروں کو کوڑے دان میں بدل ڈالتے ہیں۔'

توفیق کے وجود میں بیٹھا عربی گھوڑا یکایک ہنہنا کر کھڑا ہو گیا۔ اس سے پہلے کہ فوجی کچھ سمجھتے توفیق اپنی جگہ سے اچھلا اور پلک جھپکتے ہی ایک سپاہی کی گردن کی نس بائیں ہاتھ سے دبا کر اسے گرا دیا۔ فضا ہوائی فائروں سے گونج اٹھی۔ ان کے آپس میں گتھم گتھا ہونے سے پہلے سپاہیوں نے توفیق کو گھیر لیا۔ اس فوجی نے توفیق کا داہنا ہاتھ مروڑ دیا۔ درد کا چشمہ ابل پڑا۔ سامنے سے سپاہی بھاگ کر آئے اور فوجیوں کو آگے بڑھنے سے روکنے لگے۔ اپنے کو سیدھا کھڑا رکھنے کی کوشش میں توفیق کی جان نکل گئی۔ سارا بدن پسینے سے نہا گیا۔

'یہ شور کیسا تھا؟' کمانڈر نے کمرے سے نکلتے ہوئے پوچھا۔

'نئے قیدی سے......' ایک فوجی نے اطلاع دی۔

'اس نئے قیدی کو کسی طرح کی تکلیف نہ دی جائے...... کل صبح تک وہ ہمارا مہمان ہے!' درمیان میں ہی کمانڈر نے رعب دار آواز میں سب کو خبردار کیا اور کچھ دور پر کھڑے ہیلی کاپٹر کی طرف بڑھا۔

ہیلی کاپٹر کے پنکھے گھومنے لگے، دھول کا غبار اٹھا۔ اپنے سر کے اوپر سے گزرتے ہیلی کاپٹر کو توفیق نے دیکھا۔ کمانڈر نے پہلے اپنا انگوٹھا اسے دکھایا، پھر دو انگلیاں امن کا نشان بنا کر دکھائیں۔ ہیلی کاپٹر پیڑوں سے اوپر اٹھتا دور آسمان کی اونچائیوں میں اڑنے لگا۔

توفیق کو پیدل چلتے ہوئے لگ بھگ بیس منٹ گزر چکے تھے۔ اس کے اندر دوڑتا گھوڑا تھک کر ست

پڑنے لگا۔ شام کا جھٹ پٹا پھیل چکا تھا جس میں دھیرے دھیرے زیتون کے درخت غائب ہونے لگے اور اسی پل پل بڑھتے اندھیرے میں کہیں اس کے وجود کا گھوڑا بھی گم ہو گیا تھا۔ اب وہ صرف توفیق تھا۔ زخموں سے چور تھکا ہارا ایک فوجی قیدی۔

'بے چارا فلسطینی! پہلی بار آج ہمارا مہمان بنا اور ہم اسے پیدل چلا کر لے جا رہے ہیں۔ فوجی زندگی بھی کوئی زندگی ہے۔ نہ اپنوں کی خاطر مدارت کر سکیں، نہ ان سے پیار کے دو میٹھے بول ہی بول سکیں، سوائے گولہ بارود کے۔' ایک سپاہی نے بڑے اداس لہجے میں کہا اور توفیق کے چہرے پر بہتے پسینے کو دیکھنے لگا۔

'سو تو ہے، کمانڈر کا حکم ہے اس لئے مہمان داری تو کرنی پڑے گی، چاہے ہمارے پاس کچھ ہو یا نہ ہو'۔ اسی ڈرامائی ڈھنگ سے دوسری آواز ابھری۔

'انسان کے پاس دل ہونا چاہئے، دل۔' تیسرے نے سینے پر ہاتھ مارتے ہوئے جذباتی لہجے میں کہا۔

'چل بھائی، آگے چل!' کہتے ہوئے دو سپاہیوں نے اسے پیچھے سے دھکا دیا۔

'آ جا میرے شیر...... یہ رہا تیرا کٹہرہ...... چھوٹا ہے تو کیا...... یہاں غرانے کی پوری آزادی ہوگی۔' پہلے سے اندر پہنچے سپاہی کی ہنسی گونجی۔

'یہ تو جنت ہے جنت، میرے یار! تھوڑی دیر بعد ہی حوریں شراب اور شباب کا جام لے کر آتی ہوں گی۔ غصہ تھوک دینا اور ان کی انڈیلی آب حیات کو غٹا غٹ پی جانا، پھر دیکھنا جلوہ۔ یہ کوٹھری محل بن جائے گی اور دیواریں حکم کی غلام...... پھر تمہارا کوئی بال بھی بانکا نہیں کر پائے گا پیارے!' لمبے قد کے سپاہی نے سلاخ دار دروازے میں تالا لگاتے ہوئے کہا۔

'گھبرانا نہیں میرے لال...... ابھی تمہارا باپ بھی آتا ہو گا۔' مذاقیہ انداز میں کہا گیا۔

'وہ کیا آئے گا؟...... ارے مانگ رہا ہو گا رحم اور پیسے کی بھیک دنیا سے...... بڑا مرد مجاہد بنا پھرتا ہے۔' قہقہوں میں گندی گالیاں بوٹوں کی دور ہوتی آواز کے ساتھ الجھ کر رہ گئیں۔ توفیق کے چاروں طرف ایک سناٹا سا پھیل گیا۔

'یہ سب کیسے ہو گیا؟' سوچ سوچ کر توفیق کا سر درد سے پھٹنے لگا۔ جب بھی اس کا کوئی ساتھی پکڑا جاتا تو وہ بڑے یقین سے کہتا، میں کبھی ان کے چنگل میں پھنسنے والا نہیں ہوں۔ قید کا مطلب ہے زندہ موت یعنی لڑائی ختم۔ بس ہاتھ پر ہاتھ دھرے قید خانے میں بیٹھے رہو...... لینن کیا کبھی جیل گیا تھا؟ ایک انقلابی کو ہمیشہ چوکنا رہنا چاہئے ورنہ......'

'یہ کیسے ممکن ہے، وہ بھی گوریلا لڑائی میں، کہ آدمی کبھی پکڑا ہی نہ جائے؟ کبھی کبھی ایک قیدی آنے والے انقلاب کا نعرہ بن کر پورے سماج کی طاقت بن جاتا ہے، جو ایک سپاہی اپنی جان کی قربانی کے بعد بھی نہیں بن پاتا ہے۔' کامریڈ اسد کہتا۔

'دیکھو بھائی! مجھے زندگی ایک ملی ہے، اسے میں بیٹھ کر نہیں گزار سکتا ہوں...... حرکت کرنا ہی میری زندگی ہے اور میری یہ جدوجہد ہی آج کے سماج کا نعرہ ہے۔' توفیق زوردار قہقہہ لگاتا۔ اپنی آواز کی بازگشت سن کر اس پر اداسی چھا گئی۔

صبح اندھیرے میں وہ تینوں نکلے تھے۔ ایک ماہ کی لگاتار کوششوں سے وہ اس حملے میں کامیاب ہو پائے تھے، مگر پل بھر میں سب کچھ ہو گیا۔ جب اسے ہوش آیا تو اپنے کو بڑی سی چٹان پر اوندھا پڑا پایا۔ جیسے ہی اس نے گھبرا کر اپنا سر اوپر اٹھایا، ٹڈی دل کی طرح اسرائیلی فوجی اس کی طرف لپکے۔ سامنے اس کے دونوں ساتھی مردہ پڑے تھے۔ ہیلی کاپٹر میں آگ لگ چکی تھی۔ اس نے تیزی سے ہاتھ جیب میں ڈالا تاکہ کیپسول نگل لے، مگر ہاتھ منہ تک پہنچا ہی نہیں اور کسی فوجی نے اس کے کندھے پر بھرپور بندوق کا کندا دے مارا۔ کیپسول چھٹک کر دور جا گری اور اس کا ہاتھ کندے کی لگاتار مار سے بھرتا بنا دیا گیا۔ وہ بیہوش ہو گیا تھا۔ جب ہوش میں آیا تو اس کی جیبوں کی زبانیں باہر نکلی ہوئی تھیں۔ اس کا شناختی کارڈ، ننھا سا چاقو، کمر پر بندھی پستول اور چیونگم کا پیکٹ غائب تھا۔

رات آدھی سے زیادہ گزر چکی تھی۔ توفیق کی آنکھوں میں نیند کا کوسوں پتہ نہیں تھا۔ ناامیدی کی گہری کھائی میں وہ یکا یک ڈوبنے لگا تھا۔ اسے یقین سا ہونے لگا تھا کہ جیسے وہ اس قید خانے سے کبھی آزاد نہیں ہو پائے گا۔

'اب یہ مٹی ہی میرا بچھونا ہے۔ اس زمین پر میں گھٹنوں کے بل چلا ہوں اور اسی مٹی کو چھپ چھپ کر کھانے کی عادت پر ماں کے ہاتھوں مار بھی کھائی ہے اور اسی سرزمین کو غیر ملکی ہاتھوں سے چھڑانے کے لئے میں نے ہاتھ میں ہتھیار بھی اٹھایا تھا۔ میرے ساتھ جانے کتنے اور ہاتھ اٹھے تھے اور وہ اٹھے ہاتھ لگاتار کٹ کر گرتے گئے۔ جیسے پانی کی نہیں، بلکہ ہاتھوں کی بارش ہو رہی ہو جس سے ندی نالے نہیں بھرے، بلکہ مادر وطن کے سینے پر اپنے بیٹوں کے جسموں سے بنے ٹیلے اور پہاڑ وجود میں آئے ہوں۔' سوچتے سوچتے توفیق نے اپنا دایاں ہاتھ سہلایا۔ درد کی تیز لہر نسوں میں دوڑ رہی تھی۔ اس نے دھیرے دھیرے زمین پر پھیلے اپنے جسم کو سمیٹا۔ بڑی مشکل سے کروٹ لی اور اوندھا زمین پر لیٹ گیا۔ اپنا چہرہ فرش پر ٹکایا۔ پھر گھٹنے اس طرح سے پیٹ کی طرف موڑے جیسے ننھا سا بچہ ماں کے سینے سے لپٹ کر سونا چاہ رہا ہو۔

ایسی ہی کسی ڈراونی رات کے سناٹے میں اس کا جنم ہوا تھا۔ اس کے رونے کی آواز سے فضا پر تنی دہشت کی چادر پھٹ گئی تھی۔ ماں کی درد بھری چیخوں سے مردہ گاؤں میں زندگی پھر خون سے تر آنچل نچوڑ کر اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔ ماں پورے دنوں سے تھیں۔ ان دنوں گاؤں میں مرد نہیں رہتے تھے۔ وہ لوگ مورچہ سنبھالتے تھے، عورتیں گھر اور بچوں کو...... مردوں کا بدلہ عورتوں اور بچوں سے چکانے کی اس رسم میں پہلے گاؤں کے سارے نئی عمر کے لڑکے گولی سے بھون دیئے گئے۔ پھر اوپر سے پھینکے گئے بموں سے گھر، کھیت کھلیان، کنواں، تالاب سب تباہ کر دیئے گئے تھے۔ جو چند عورتیں بچ گئیں تھیں، وہ جھٹ پٹے کو کسی کام سے جنگل کی طرف نکل گئی تھیں۔ ان میں ماں اور دونوں بڑی بہنیں بھی تھیں۔ جب وہ لوٹیں تو گاؤں کے قریب پہنچ کر اپنی آنکھوں کے سامنے گرتے گولوں اور دم توڑتے گاؤں کو دیکھ کر ماں کے بدن میں ایسی دہشت سمائی کہ ان کے کانپتے وجود نے وہیں کھلے آسمان کے نیچے بنا کسی انتظام کے توفیق کو جنم دیا تھا۔ دشمنوں کے نہ چاہنے پر بھی اس دن گاؤں میں ایک لڑکے کی ولادت ہوئی تھی۔

'مجھے کمانڈر زندگی کی بھیک دے کر خریدنا چاہتا ہے۔ وہ کیا جانے کہ جس کا جنم ہی دائروں اور بندشوں کے باہر کھلے آسمان کے نیچے ہوا ہو، اور جس نے ظلم کی چھاؤں میں ہی آنکھیں کھولی ہوں، وہ آزادی کا مطلب اچھی طرح سمجھ سکتا ہے۔ اسے کوئی بندھن باندھ نہیں سکتا، نہ کوئی لالچ اسے خرید سکتا ہے۔' توفیق کے دل پر چھائے کالے بادل چھٹنے لگے۔ اندھیرے تہہ خانوں میں روشنی کے

دیے جل اٹھے۔

جب کبھی بابا مورچے سے تھکے ہارے لوٹتے، اس وقت گھر کی رونق دیکھتے بنتی تھی۔ ماں خوش مزہ، خوشبودار کھانا بناتیں، سارے بھائی بہن رنگین پھول دار کپڑے پہن کر جشن منانے کے انداز سے اندر باہر بھاگتے رہتے۔ شام ڈھلے گھر کے احاطے میں اکلوتے زیتون کے درخت کے نیچے بیٹھ کر بابا ترانہ گاتے اور مدھم سروں میں ساز چھیڑتے۔ ہم بھائی بہن ان کے ساتھ کبھی کبھی کورس میں گاتے اور کبھی وہ نئے ترانوں کو ہمیں سکھاتے جو وہ مورچے پر سن کر یا سیکھ کر یا پھر گا کر آتے تھے۔ ماں پورے وقار و اطمینان سے سب کی چائے کے گلاس کو خالی ہونے سے پہلے بھرتیں اور کھانے کی چیزیں آگے بڑھاتی جاتی تھیں۔ ہم دیوانے، موت اور خوشی، رونے اور گانے کے ہر موقع پر انقلابی ترانہ گاتے تھے۔ یہ خیال مجھے آج آرہاہے کہ عرصہ بعد ملنے پر خوشی کی جگہ ہم شہادت کی دھنیں بجاتے تھے۔ شاید اس لئے کہ ہو سکتا ہے، یہ ہماری آخری ملاقات ہو۔ اپنا الوداعی مرثیہ ہم خود پڑھ لیں۔ بابا کے چلے جانے کے بعد ماں ایکدم بدل جاتیں۔ سارے دن کام میں مصروف رہتیں۔ آرام انہیں رات گئے نصیب ہوتا تھا۔ تب ہم تینوں بھائی بہن تاروں کی چھاؤں میں ایک دوسرے سے لپٹے ماں کے پاس گھسے ہوتے اور اس وقت وہ اپنے بچپن کی باتیں سناتیں۔ توفیق کو لگا کہ وہ ماں کی کمر میں ہاتھ ڈالے، اپنا بایاں پاؤں ان کے پیٹ پر رکھے ان کی بغل اور چھاتی کی خوشبو سونگھتا ان کی آواز میں ڈوبتا جارہا ہے......

'جب دیر یاسین گاؤں تباہ ہوا تو مرنے والوں میں دو سو چالیس لوگ تھے، جنہیں انگلی پر گنا جا سکتا تھا۔ وہ پہلا حملہ تھا اسرائیلیوں کا ہم پر...... پورے گاؤں کی تباہی دیکھ کر خود یہودیوں نے دانتوں تلے انگلی دبالی تھی کہ اس قتل عام اور نازیوں کے ذریعہ یہودیوں کے قتل عام میں کوئی فرق نہیں رہ گیا ہے۔ تاریخ اگر اپنے کو یوں دہراتی رہے گی تو اس طرح کی تباہیاں کبھی ختم نہیں ہوں گی...... اس وقت میں دس سال کی تھی، یہ بات میں ۱۹۴۸ کی بتارہی ہوں۔ تب سے آج تک ہم نے آٹھ نو جگہیں اور ٹھکانے بدلے ہیں۔ کتنی بار خیموں میں رہے، کتنی بار اسرائیلی فوجوں کی نگرانی میں قیدیوں کی طرح کئی سال گزارے۔ بس، سمجھو خانہ بدوش نہ ہو کر بھی ہم نے گھر کندھوں پر رکھ کر چلنا سیکھ لیا تھا۔'

'مگر ماں، آخر ہم کب تک یوں پھرتے رہیں گے؟' رابعہ گھبرا کر پوچھ بیٹھی۔

'یہ ہماری نہیں فلسطین کی تقدیر ہے۔ جو زمین اٹھارہ بار غیر ملکی حکومتوں کو جھیل کر بھی اپنی پہچان کو نہ کھونے کی قسم کھا بیٹھی ہو، اس کا مقدر تو بس جد و جہد کرنا رہ گیا ہے۔ کل اور آج کے کشمکش میں بنیادی فرق یہ ہے کہ پہلے فلسطینیوں کو جلاوطن نہیں کیا جاتا تھا بلکہ غیر ملکی ہم سے گھل مل جاتے تھے اور آج غیر ملکی حکومت کے ساتھ فلسطینیوں سے ان کی اپنی زمین سے ان کا حق بھی چھینا جا رہا ہے ...... بس یہی بدلاؤ آیا ہے اس لڑائی میں، جو ہم صدیوں سے لڑتے آئے ہیں۔' ماں ٹھنڈی سانس بھر کر کہتیں۔

'ماں، تمہیں یہ سب کس نے بتایا؟' توفیق بیچ میں گھبرا کر اٹھ بیٹھتا اور پلکیں جھپکا جھپکا کر ماں کو تکتا۔

'بیٹے! جس بد نصیب ملک میں مدرسے بند ہو جائیں، کتابیں غائب ہو جائیں، وہاں ماں باپ ہی بچوں کے مکتب اور استاد ہوتے ہیں ...... یہ باتیں میں نے اپنی ماں سے سنیں اور تم اپنی ماں سے سن رہے ہو ...... یہ حادثے تو ہمارے سینوں پر لکھی تاریخیں ہیں جو ایک زبان سے دوسری زبان تک اپنا سفر طے کرتی ہوئی ایک دوسرے کے سینوں میں دفن ہو جاتی ہیں ...... کون جانے یہ تاریخی اسناد، یہ تاریخی یادیں ہمارے وجود میں کب تک پھیلتی جائیں گی ...... کون جانے؟' ماں توفیق کا ماتھا چوم کر کہتیں۔

'آگے بتاؤ نا!' بےچینی سے توفیق کہتا۔ اسے محسوس ہوتا جیسے ماں کی باتیں اس کے اندر کئی راستے بنا رہی ہیں۔ ان راہوں سے بنے ڈیلٹا کے بیچ وہ الجھ کر کھڑا رہ جاتا اور اسے لگتا کہ آگے سب اندھیرا ہے، جہاں اسے جانا ہے، وہاں سب کچھ سیاہی میں ڈوبا ہوا ہے۔

'جب یروشلم کو بانٹا گیا، اس وقت بیرونی یہودی، ایک تہائی حصے پر قابض ہو گئے۔ اس وقت اس دیوار سے لپٹ کر صرف یہودی پچھتاوے کے آنسو نہیں بہاتے تھے بلکہ جانے کتنی فلسطینی عورتیں روتیں — ان کے گھر، ان کی زمین، ان کی یادیں دیوار کی دوسری طرف چھوٹ گئی تھیں ...... پھر بے چین دلوں نے دیوار میں چھید کرنے شروع کر دئے ...... نئی تقسیم شدہ سرحد پر کھڑی وہ دیوار چھلنی ہو گئی اور اسی سے جھانکتی پیاسی آنکھیں گھنٹوں اپنے گھروں اور عبادت گاہ کو تکتی رہتیں ...... تمہاری نانی ...... آنسو پونچھتے پونچھتے جن کی آنکھیں زخموں سے چور ہو گئی تھیں، مگر بے نور آنکھیں لئے وہ دیوار سے سٹی بیٹھی رہتیں جیسے ......' ماں کی آواز بھاری ہوتے ہوتے ان کے گلے میں پھنس

جاتی۔

ڈر کر توفیق اپنی آنکھوں پر ہاتھ رکھ لیتا۔ توفیق اکثر بیچ میں ہی سو جاتا تھا اور ساری رات خواب میں یروشلم، دیریاسین، مغربی کنارہ اور غازہ پر گھومتا رہتا۔ پھر مشین گن کی آواز سے ڈر کر چیخ پڑتا اور کانپتا ہوا اماں کے سینے سے لپٹ کر پھپک اٹھتا۔

وہ تخم جو ماں نے اس کے حساس دل کی زمین پر بویا تھا، وہ اب بڑی بھاری کیکٹس کی جھاڑ میں بدل گیا تھا، جس میں صرف انتقام کے کانٹے ہی کانٹے اگے تھے۔ ان کے بیچ جب کبھی سرخ پھول کھلتا تھا تو توفیق کا دل امید سے بھر اٹھتا تھا کہ ایک دن وہ اپنے وطن کو آزاد کرالے گا...... پھر کسی ایک دن گرتے بم، اڑتی ڈھہتی عمارتیں، اجڑتی بستی اس کی امید کے سرخ پھول کو مرجھا کر گرا دیتیں اور اسے لگتا کہ کبھی بھی فلسطین کی سرحد کو دوبارہ متعین نہیں کر پائے گا...... ٹکڑے ٹکڑے ہوئے فلسطین کو کبھی نہیں جوڑ پائے گا...... اور اپنے آنے والے کل میں...... جب برسوں بعد اداس بے گھر نسلیں اپنی سوچ میں صرف فلسطین کو دیکھ پائیں گی اور اس کے بعد کی آنے والی نسلیں صرف تاریخ کی کتابوں میں فلسطین کے بارے میں جان پائیں گی جہاں نہ زیتون کی مہک ہوگی نہ مٹی کی گندھ۔ وہاں صرف کاغذ کی پھڑ پھڑاہٹ پر کالے الفاظ اور رنگین لکیروں سے فلسطین کا مردہ نقشہ ہوگا۔ اس کے اندر کٹیلی جھاڑی میں اٹکی صرف تار تار اس کی روح ہوگی...... توفیق نے ٹھنڈی سانس بھری اور بائیں ہاتھ پر اپنے بدن کا بوجھ ڈال کر اٹھنے لگا۔

پو پھٹ چکی تھی۔ کوٹھری کے موکھے سے پھیکی روشنی کی پتلی لکیر اندھیرے کو چیرنے لگی تھی۔ توفیق نے ہاتھ منہ پر پھیرا۔ داڑھی بڑھ گئی تھی۔ اس نے زوردار جمائی کے ساتھ پیروں کو جھٹکا اور دیوار سے پیٹھ لگا کر بیٹھ گیا۔ تھوڑی دیر بعد دھوپ کا ننھا سا چکتا اس کے ہاتھوں پر آکر ٹھہر گیا۔ پہلے وہ اس ننھے سے اُگے سورج کی گولائی کو تاکتا رہا پھر سر جھکا کر اسے چوم لیا۔ جانے کب تک وہ سجدے میں گرا رہتا، اگر دروازہ کھلنے کے ساتھ بھاری آواز اسے چونکا نہ دیتی۔

'باہر نکلو!'

توفیق دیوار کا سہارا لے کر کھڑا ہوگیا، پھر لڑکھڑاتا ہوا سا آگے بڑھا۔ اس کا بدن پتھر کی اوبڑ کھابڑ ٹھنڈی زمین پر لیٹنے سے اکڑ گیا تھا۔

'تم عرب تو بڑے جنگجو مشہور ہو، لڑتے لڑتے اسپین تک پہنچ گئے تھے، مگر یہاں ایک رات میں ہی کمر کے سارے ٹانکے ڈھیلے ہوگئے۔' فوجی نے اس کی کمر پر دھول جمائی۔

'دوغلا ہے!' قہقہہ بلند ہوا۔

یہ جملہ سوئے کی طرح توفیق کی پیٹھ پر پڑا۔ اندر بیٹھا گھوڑا ہنہنا کر کھڑا ہو گیا۔ خون گردش میں آگیا۔ کان کی لویں گرم ہوگئیں۔ گالوں سے بھاپ اٹھنے لگی۔ دل چاہا کہ اپنے وحشی قدموں سے دشمن کا سینہ روند کر رکھ دے۔

'بیٹھو!' کمرے میں گھستے ہی بھرائی آواز گونجی۔

توفیق کسی اڑیل گھوڑے کی طرح اڑا رہا۔ کان میں صرف ایک جھنجھناہٹ گونج رہی تھی اور آنکھیں جیسے خون کا کٹورا بن گئی تھیں۔ کچھ دیر پہلے کہی گئی بات اس پر لگاتار کوڑے برسا رہی تھی۔

'کم سنتا ہے کیا؟' وہی آواز ابھری۔

'بیٹھ جاؤ!' کہتے ہوئے لمبے قد کے افسر نے توفیق کے شانوں کو دبایا۔ پیچھے سے فوجیوں نے دھکا دیا۔ توفیق اسٹول پر بیٹھ گیا۔ چٹ چٹ کر کے اس کے پاؤں کی ہڈیاں بول اٹھیں۔

'ہاں، تو تم نے کیا فیصلہ کیا ہے؟' سوال ابھرا۔

'فیصلہ ہمارا وہی پرانا ہے۔ مرو تو شہید کہلاؤ اور مارو تو غازی!' توفیق کی آنکھوں میں پتھر کی دیوار اس کے سر پر بندھے چار خانے کے رومال کی طرح خون میں تیر رہی تھی۔ ہونٹ ایک دوسرے پر جمے تھے، جیسے سب کچھ ٹھہر گیا ہو۔

'کیا سچ مچ تم نے مرنے کی ٹھان لی ہے؟' سامنے بیٹھا ہوا آدمی چنگھاڑا۔

'مگر ہم چاہیں تو تمہاری یہ خاموشی پل بھر میں غبارے کی طرح پھٹ جائے گی اور تمہاری وہ آخری چیخ ہمارے زخم پر مرہم کا کام کرے گی!' سرخ چہرے والے افسر نے اپنی خاموشی توڑی۔

'کوشش کر کے دیکھو!' توفیق کا وجود چیلنج میں ڈھل گیا۔

'ہم اپنے اوپر ہوئے ظلم کو بھولے نہیں ہیں۔ جس میں صرف ہٹلر کے نہیں، بلکہ تم عربوں کے ہاتھ بھی رنگے ہوئے ہیں۔ جب ہم زندہ جلائے جا رہے تھے، ہماری راکھ سے زمینیں زرخیز بن رہی تھیں۔ ہمارے عرق سے صابن اور چمڑے سے جوتے بنائے جا رہے تھے۔ ہماری نئی نسلوں کو گیس کے چیمبر میں بند کر دیا جاتا تھا۔ اس وقت تمہاری یہ دنیا کہاں تھی؟ جب ہم ادھر ادھر پناہ کی تلاش میں اپنے ہی خون سے نہائے بھاگ رہے تھے، اس وقت یہ ہمدرد لوگ کہاں تھے جو آج فلسطین سے ہمدردی دکھا رہے ہیں؟ کیا انسانیت کا پیمانہ ہر انسان کے لئے الگ ہوتا ہے؟ اب ہم یہودی حکومت کی مہر کو نہ صرف عربوں، بلکہ دنیا کے سارے ظالموں کے دلوں پر ٹھونکیں گے کہ اب ہم 'یہودی سرگرداں' نہیں رہ گئے ہیں جس پر آج تم ستم توڑ سکو۔ اب دربدر کی ٹھوکریں کھانے والی قوم کا بھی اپنا ملک ہے جس کا نام ہے اسرائیل......!' تانبے کی رنگت والا افسر نفرت سے توفیق کو دیکھتے ہوئے بولا۔

'اپنی زمین کو چھوڑ کر جگہ جگہ بسنے والے، طرح طرح کا نمک چکھنے والے ملعون تاجر! تم کس سرزمین کے حق دار بننے کا خواب دیکھ رہے ہو؟ بھول گئے کہ اسپین میں ہم نے تمہیں ظلم کے چنگل سے آزاد کرایا تھا؟' توفیق کے اندر اٹھتا دلیل کا طوفان اس کے حلق میں پھنسنے لگا۔

'پہلی آسمانی کتاب 'توریت' 'موسیٰ' پر نازل ہوئی تھی۔ اس میں لکھا ہے کہ خدا زمین دینے کا پابند ہے اور تم اس حکم کے خلاف بندوق اٹھاتے ہو؟ ہم کیوں مصر میں بسیں؟ ہم کیوں کینیا جائیں؟ ہمارا مذہب، ہماری عبادت گاہ یروشلم میں ہے، جہاں ہم نے ستر سال حکومت کی ہے اور اب تم کہتے ہو کہ پرانی توریت جل گئی ہے اور یہ نئی توریت لکھی گئی ہے، جس میں ہم نے وہ سب اپنے سے لکھ دیا ہے جو ہم چاہتے ہیں۔ یہ مت بھولو کہ یہودی اور مسلمان ایک ہی آئینے کے دو رخ ہیں...... جھلملاتا شفاف رخ وہ یہودی ہے جو اپنے کو پہچانتا ہے اور دنیا اسے پہچانتی ہے اور تم مسلمان عرب آئینہ کا وہ اندھا حصہ ہو جو یاقوتی رنگ کے باوجود اپنے کو نہ دیکھ پاتا ہے اور نہ پہچان پاتا ہے۔ تم ہم یہودیوں کی توسیع ہو کر بھی ایک بھٹکی ہوئی قوم ہو جو تیرہ سو سال سے فلسطین پر اپنی سلطنت جمائے ہوئے تھے!' وہ تانبے کی مورتی غصے میں تمتما اٹھی۔

'آج تمھیں ہزاروں سال بعد اپنے آباواجداد کا گھر یاد آرہا ہے، نمک حرامو! تم کیسے ثابت کرو گے کہ تم خالص عرب یہودی ہو؟ کیا بھول گئے کہ تم موسیٰ کے ساتھ ان کے مرید بن کر ہماری سرزمین پر آئے تھے! خیر پرانی بحث چھوڑو۔ آج تک جس زمین کا نمک برسوں سے کھاتے آئے ہو وہ کیوں نہیں تمہارا وطن بن پایا؟ مانا تمہارا غم بہت بڑا ہے، مگر ہمارے غم سے بڑا نہیں ہے۔ اگر صدیاں گزر جانے کے بعد نسلیں اپنے اجداد کے گھر آج تمہاری طرح ڈھونڈھنے اور ان مقامات پر جاکر بسنے کی ضد کر بیٹھیں تو جانتے ہو، کیا ہوگا؟ اس وقت یہ زمین صرف اداس نسلوں کا قبرستان بنے گی۔' توفیق کے خونی کٹورے چھلک پڑنے کو بے چین ہو اٹھے۔

'تم جاہلوں کے پاس آج ایک بھی نام ایسا نہیں ہے جو پوری صدی پر چھا سکے۔ آئن اسٹائن...... دوسرا نام جس نے دنیا کو ایک نیا فلسفہ دیا...... کارل مارکس۔ کالے سونے کے ٹھیکیدار! تمہارے پاس دوسری دولت بھی اتنی نہیں ہے جو ہماری طرح تم عظیم طاقتوں کو ناکوں چنے چبوا سکو۔ اگر آج ہم عظیم طاقتوں کے بینکوں سے اپنی دولت نکال لیں تو پورا نظام تباہ و برباد ہو جائے گا...... تم کیا ہو، صرف عیاش......! جواری...... جنگجو......! اپنا سب کچھ عظیم طاقتوں کے سپرد کر دینے والے احمقو! مشرق وسطی کی توسیع میں ہمارا ننھا سا وجود دیکھو، کل کیا گل کھلاتا ہے۔ دیکھتے جانا سمندری لٹیرو! دیکھتے جانا ......' سرخ چہرے والے افسر نے نفرت سے ایک ایک لفظ چبا کر کہا۔

'ولایتی خیالوں کے سمندر پر کشتی چلانے والے ولایتی یہودیو! تم ہم سب کو موت کے گھاٹ اتار کر بھی کنارے نہیں پہنچ پاؤ گے، بلکہ جس غلط دھارا پر تم سوار ہو تمھیں ہمارے بہتے خون میں ڈبو دے گی...... فلسطین تو ایک ایسا چوراہا تھا جس کی اہمیت سوئز نہر کے کھلنے سے پہلے بھی ولایتی سمجھتا تھا، کیونکہ اسے ہندوستان کو قبضہ میں کرنا تھا۔ تیل تو آج نکلا ہے۔ جب تیل نہیں نکلا تھا اس وقت سے بیرونی طاقتیں ہمیں غلام بنانے کے لئے بے چین تھیں۔ کیا تاریخ بھی نہیں جانتے تم؟ کیا یہ بھی نہیں سمجھتے کہ ہمارے دنوں اور سالوں کو کس طرح تباہ کیا جا رہا ہے، تاکہ ہمارا درخشاں ماضی خون آلود حال میں ڈوب جائے؟ ہمیں تو تم ہی پھوٹ ڈلوا کر بکھیر رہے ہو! صدی اور سرحدوں پر چھا جانے والے دماغوں کو نسل کے دائرے میں مت باندھو...... اس سے تمہارے گناہ ثواب میں نہیں بدل جائیں گے...... سنو یہودی کنجوس! اپنا گھر دوسروں کی زمین پر بناؤ گے تو وہ اپنا حق مانگیں گے اور تم ناحق بے گھر ہونے کا غم جھیلو گے۔ طاقت کے زور پر کہی گئی بات ضروری نہیں معقول بھی ہو اور

سچ بھی!' توفیق کے خاموش چہرے پر اس کی بولتی آنکھیں بجلی کی طرح تڑپنے لگیں۔

سامنے کا دروزہ کھلا۔ ایک لمبا چوڑا افسر داخل ہوا۔ سب سے سلام دعا کر کے وہ ایک طرف صوفے میں دھنس گیا۔ اس کے پیچھے ہی قہوہ کی سینی اٹھائے فوجی داخل ہوا اور سکوٹ کے بعد اس نے سینی سب کے آگے بڑھائی۔

'کچھ بتایا؟' نووارد افسر نے پوچھا۔

'نہیں!' تانبے کے چہرے والے نے نفرت سے کہا۔

'ہمارا دوستی کا معاہدہ صبح دس بجے تک تھا۔ اب گیارہ بج رہے ہیں۔' گھڑی دیکھتے ہوئے نووارد افسر نے کہا۔

'نمبر پانچ!' سرخ رنگت والے نے پوچھا۔

'ابھی نہیں۔' نئے افسر نے قہوے کی خالی پیالی رکھتے ہوئے کہا۔

'تمہارا اگلا منصوبہ کیا ہے؟' نئے افسر نے کھڑے ہو کر توفیق سے پوچھا۔

'تم لوگوں کی تباہی!' توفیق کے خاموش کسے ہوئے ہونٹ آپس میں پیوست ہو گئے۔

'تمہارا صدر، سربراہ کہاں ہے؟' لہجہ اس بار سخت ہو گیا۔

'ایک جگہ ہو تو بتاؤں...... جب پوری قوم بکھر گئی ہو تو اس کا صدر کیا ایک جگہ رہ سکتا ہے؟' توفیق کی آنکھوں میں چٹانوں کی سختی ابھر آئی تھی۔

'بتاؤ!...... ' کہہ کر ایک زناٹے دار طمانچہ توفیق کے منہ پر پڑا۔

خون کی پتلی لکیر ہونٹوں کے کونے سے نکل کر قمیص پر ٹپکنے لگی۔

'اچھی طرح خاطر کر کے...... اس کی لاش کو سرحد پر لٹکا دینا، تاکہ چیل کوؤں کی دعوت کے ساتھ دوسرے احمق بھی اپنے انجام کو جان سکیں'۔ یہ کہتا ہوا افسر توفیق کو گھورنے لگا۔

'تم میں سے کوئی بھی شخص اس تاریخی عمارت کے اندھیرے تہہ خانوں میں اتر نہیں سکتا...... یہ جگہ اسرائیلیوں کی لئے ممنوع ہے۔ ان راہداریوں میں صرف فلسطینی سفر کرسکتے ہیں، جن کی منزل آزادی ہے، جن کی پہچان فلسطین ہے!' سامنے دیوار پر ٹنگی رائفلوں کا کراس نشان توفیق کی پتلیوں پر ثبت ہوگیا۔

کل دوپہر سے توفیق کی ہر دو گھنٹے بعد پیشی ہوتی اور پوچھ تاچھ کا بھیانک اژدہا منہ کھول کر اس کے سامنے بیٹھ جاتا تھا۔ اپنے تیز نوکیلے دانتوں سے اس کی خاموشی کو توڑنے کی ناکام کوشش میں وہ توفیق کے اعصاب کے چیتھڑے چیتھڑے کر دیتا تھا اور توفیق اپنے کو مضبوطی سے پکڑے رہنے کی کوشش میں مر مر کر جیتا اور ہر بار سوچتا......

یہ لوگ مجھے موت سے کیا ڈرائیں گے جس نے دس سال کی عمر میں اپنے باپ کو پھانسی پر چڑھتے دیکھا ہو۔ جن کے منہ سے ابلتے خون کو زمین پر لوٹتی اپنی ماں اور بہن کے چہرے پر ٹپکتا دیکھا ہو۔ اسی دن سے میرے اندر غصہ کا بپھرا ہوا سمندر ہلوریں لے رہا ہے۔ جیسے میں ایک طاقت ور عربی گھوڑے میں بدل گیا ہوں جو ایک دن اپنی وحشی ٹاپوں سے دشمن کا سینہ کچل دے گا۔ اپنے مضبوط دانتوں سے دشمنوں کی گردن چبا جائے گا...... تب سے اب تک پورے بیس سال سے میں ایک دیوانے وحشی گھوڑے کی طرح دوڑ رہا ہوں...... ہر بار تھک کر شام کو لوٹتے ہوئے محسوس ہوتا تھا کہ میں منزل سے بہت دور ہوں۔ مگر ہر صبح سورج کی پہلی کرن پھر قاصد کی طرح میرا دروازہ کھٹکھٹا کر پیغام دے جاتی ہے کہ......

'اٹھو! سرزمین کو آزاد کراؤ...... اس کا جسم دشمن اپنی زنجیروں میں باندھ رہے ہیں'۔ اور میں سب کچھ بھول کر سرپٹ میدان جنگ کی طرف بھاگتا۔

'کل صبح کا سورج مجھے کیا پیغام دے گا؟ موت کا؟ موت سے اب کیا ڈرنا؟' سوچتا ہوا وہ آگے بڑھا اور کوٹھری کے موکھے نیچے جاکر کھڑا ہو گیا۔ باہر گونجتا شور دھیرے دھیرے کر کے کم ہو رہا تھا، شاید آدھے سے زیادہ سپاہی کوچ کر گئے تھے۔

'کاش! یہ موکھا تھوڑا بڑا ہوتا! تھکا تھکا سا توفیق سوچتا ہوا چبوترے پر بیٹھ گیا۔

رابعہ اور سمیرہ اس کی بڑی بہنیں تھیں اور رویاء سب سے چھوٹی۔ بابا کے پھانسی چڑھنے کے ٹھیک تین ماہ بعد پیدا ہوئی تھی۔ تینوں کے چہرے توفیق کے سامنے ایک ایک کر کے کوندھ گئے۔ جب سمیرہ کے سامنے کے دانت ٹوٹے تھے تو وہ اپنا چہرہ آئینے میں دیکھ دیکھ کر خوب روئی تھی۔ بڑی مشکل سے اسے یقین آیا تھا کہ دانت دوبارہ نکل آئیں گے۔ سمیرہ کا خیال آتے ہی اس کے چہرے پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ اپنی پیٹھ پر پڑتے گھونسوں کا خیال آیا جو ہر بار کھیل میں ہارنے کے بعد سمیرہ اسے مارتی تھی کہ توفیق نے بے ایمانی کی ہے۔

توفیق کے چہرے کی مسکراہٹ غائب ہو گئی۔ پیٹھ پر پڑتے گھونسوں کا درد شدید ہو کر سینے میں پھیل گیا۔ جہاں رویاء کا چہرہ کھل اٹھا تھا...... دو سال کی رویاء، سفید چہرہ اور سنہرے بالوں والی رویاء یکایک ہمیشہ کے لئے آنکھیں بند کر کے ماں کی گود میں سو گئی تھی۔ بمباری میں پارک میں کھیلتے دوڑتے بچے یکایک ٹھہر گئے تھے۔ ان میں رویاء بھی تھی۔ اس کے دونوں پاؤں جھلس گئے تھے۔ وہ بابا کی دوسری تصویر تھی۔ ماں اس کی لاش دفنانے کے بعد ایک دم سے ٹوٹ کر بکھر گئی تھیں، جیسے بابا ان سے اس بار سچ مچ ہمیشہ کے لئے بچھڑ گئے ہوں......

توفیق کی آنکھوں میں بستی کا آنگن پھیل گیا، جہاں گلیاں تھیں، گھر تھے، دیواریں تھیں، چھت اور زمین تھی۔ جہاں درختوں کے جھنڈ تھے۔ جہاں پکی انجیروں کو توڑ کر کھانے کا مقابلہ ہوتا تھا۔ جہاں کھیل کود، مار پیٹ کے ساتھ 'ملی' اور 'کٹی' ہوتی۔ جہاں سب کچھ بولتا تھا، چہکتا تھا، مگر کوئی ست بیٹھ کر اس طرح گزری باتوں کو سوچتا نہیں تھا، بلکہ سب زندگی کے بہاؤ میں بہہ رہے تھے۔

موت کسی وقت بھی آسکتی ہے۔ اس کی اچانک آمد کا خوف زندگی سے زیادہ محبت کرنا سکھاتا ہے۔ تبھی ہر لمحے امنگوں سے بھرپور سب ایک دوسرے کے دکھ سکھ میں ڈوبے ایک دوسرے کے لئے ہنستے مسکراتے تھے۔ ان کے لئے اپنا پرایا کچھ نہیں رہ گیا تھا۔ ابھی توفیق جانے کب تک سوچ میں ڈوبا رہتا، اگر سپاہی نے اسے پکار کر جنگلے سے اس کی طرف روٹی اچھال کر نہ پھینکی ہوتی۔

کل کی روٹی بھی پڑی سوکھ رہی ہے۔ وہ کیوں ان کا دیا ہوا اناج کھائے؟ اسے تو یہاں سے نکل بھاگنا چاہیے...... صبح سے پہلے...... ان کی پہنچ سے دور......! توفیق نے چاروں طرف نظریں گھمائیں، جیسے اندازہ کر رہا ہو کہ کیسے بھاگا جاسکتا ہے۔

دھڑام دھڑام...... دھڑ...... ہوائی جہاز شور کرتے گزر گئے۔ بم کے گرتے گولوں سے دھول اور بارود کے ذرے اندر کوٹھری میں آنے لگے۔ اپنی آزادی کی تلاش میں توفیق کے پتھر ٹٹولتے ہاتھ یکایک جم گئے۔ وہ ٹھٹھکا سا رہ گیا۔ پھر خوشی کے مارے اس کا دل زوروں سے دھڑکنے لگا۔ اس کے ہم وطن آخر آہی گئے...... دوسرے ہی لمحے وہ اچکا اور موکھے میں اپنا منہ ڈال کر باہر جھانکنے کی کوشش کرنے لگا۔ مگر وہی مٹھی بھر آسمان، دو شاخیں جو دھول کے غبار میں دھندلا گئی تھیں۔

جہاز گزر چکے تھے۔ چھاؤنی برباد ہو چکی تھی۔ اب صرف سناٹا تھا جیسے قدرت بھی سہم کر ٹھٹھک گئی ہو۔

میں کیسے بچ گیا؟ تعجب اور خوشی سے توفیق نے اپنے چاروں طرف دیکھا، جیسے یقین نہیں آرہا ہو......

'مجھے صبح گولی سے اڑانے والے تھے۔ خود اڑ گئے...... سب کے سب......' توفیق اٹھا اور دروزہ کی طرف بڑھا۔ اس کا سینہ ان وقت نئے حوصلوں سے چوڑا ہو گیا تھا۔ اس کے چہرے پر نئی امنگ کا رنگ بکھر گیا تھا۔

'یہ کیا؟' یکایک اس کی نظر چھت پر ٹک گئی۔ پتہ ہی نہ چلا کب کوٹھری کا کونا بم کے کسی ٹکڑے سے اڑ گیا تھا۔ اوپر سوراخ سے نیلا آسمان اور زیتون کی شاخیں جھانک رہی تھیں۔ دھول بیٹھ گئی تھی، مگر بارود کی بو ابھی فضا میں باقی تھی۔

'آہ نیلا آسمان!' توفیق کا دل خوشی کے مارے دھڑکنے لگا۔

چھت کا سوراخ اتنا بڑا تھا کہ وہ اس سے آسانی سے باہر نکل سکتا تھا، مگر وہاں تک پہنچے کیسے؟ پاؤں ٹکانے بھر میں پتھر کی دیوار نے گھٹنے اور انگلیوں کو چھیل کر رکھ دیا تھا۔ ابھی وہ ہمت نہیں ہارا تھا۔ اسے پوری امید تھی کہ وہ یہاں سے نکل بھاگے گا۔ خوشی سے وہ اچھلا اور کوٹھری کے کونے میں رکھے مٹکے کی طرف بڑھا...... اندر جھانکا...... پانی اوپر تک بھرا تھا۔

'اس کا پانی باہر نکال کر اگر میں مٹکے کو گھسیٹ کر سوراخ کے نیچے رکھ دوں تو چھت تک پہنچ سکتا ہوں۔' چمکتی آنکھوں سے توفیق نے سوچا اور برتن اندر ڈال کر پانی نکالنے لگا۔ تبھی اس کی نظر مٹکے کے نیچے جا کر ٹک گئی۔

'نہیں...... 'مایوسی میں ڈوبی آواز نکلی۔ مٹکا پتھر کی تھال میں گولائی سے جڑا ہوا تھا۔ توفیق نے لمبی سانس کھینچی اور نظریں چھت پر گاڑ دیں۔

سورج دھیرے دھیرے اوپر آ رہا تھا۔ چھت کی سوراخ سے پھوٹتی روشنی کوٹھری میں اجالا بھرنے لگی۔ وہ موکھے میں منہ ڈال کر چلایا۔

'فلسطین زندہ باد......!'

وہ پورے دم سے چیخا مگر...... صرف ہوا سانپ کی طرح رینگ کر موکھے کے بل میں گھسی اور اس کے لفظ نگل گئی۔ اس نے منہ نیچے کیا۔ گوں گوں...... گاں جیسی گرگراہٹ کے علاوہ اس کے گلے سے کوئی آواز نہیں نکلی۔ اس نے ساری طاقت جمع کر کے پکارا 'مدد...... مدد!'

'کیا وہ گونگا ہو گیا ہے؟ کیا اس کی بولنے کی طاقت جاتی رہی ہے؟ ہو سکتا ہے، وہ گونگا نہیں بہرا ہو گیا ہو؟ کیا ہو رہا ہے اسے؟' توفیق پسینے سے شرابور ہو گیا۔ اتنا تنہا، اتنا کمزور، اتنا بے چارہ اس نے اپنے کو کبھی محسوس نہیں کیا تھا۔ اداسی کے گہرے بھنور میں ڈوبنے سے پہلے پھر وحشت سے چیخا۔ مگر باہر ہوا کا چلنا اور اس کے اندر بڑھتا خاموش سناٹا سائیں سائیں کرتا ہوا اس کے شعور پر چھانے لگا۔

'میرے ساتھی مجھے ڈھونڈنے آئیں گے۔ مانا یہ حصہ چھاؤنی سے بہت دور ہے، تو بھی وہ مجھے ڈھونڈ لیں گے...... کوئی نہ کوئی آئے گا ضرور!' نیلے دھلے ہوئے آسمان کو دھیرے دھیرے اندھیرے میں گھلتے دیکھ کر توفیق نے اپنے کو دلاسہ دیا۔

اس کوٹھری میں توفیق کا آج ساتواں دن ہے۔ بھوک سے اس کی انتڑیاں خود اپنے کو کھانے لگی تھیں۔ کوٹھری میں رکھے گھڑے کا پانی کافی کم ہو گیا تھا۔ سوکھی روٹیوں کے ڈھیر پر بارودی گولے

نے گر کر ملبے کا ڈھیر بنادیا تھا، ورنہ توفیق ساری عزت وشرافت چھوڑ کر زندہ رہنے کے لئے وہ سوکھی روٹی چبا کر کچھ دن اپنی آزادی کی امید کی شمع جلائے رکھتا۔ آخر دشمنوں میں گھر کر 'تقیہ' کی اجازت مذہب دیتا ہے تو پھر مجبوری میں دشمن کی روٹی تو کھا ہی سکتا تھا۔ اور اب یہ طاقتور بدن بھی تو پچھلے سات دن میں گھل گھل کر توفیق کو پانی کے بل بوتے پر سنبھالے ہوئے ہے۔ مگر یہ سب کب تک چلے گا؟

ایک دن تیز ہوا نے بچے درختوں کی کسی ایک شاخ سے پکی کالی زیتون کو اڑا کر موکھے کی ڈھال پر رکھ دیا تھا۔ روشنی میں چمکتی کالی زیتون توفیق کو دنیا کی سب سے بڑی نعمت لگی تھی۔ وہ اپنی ساری طاقت بٹور کر اٹھا اور اس سے پہلے کہ اس کا ہاتھ موکھے تک پہنچتا، ہوا کے دوسرے جھونکے نے اسے جھٹکے سے باہر کی طرف گرا دیا۔ توفیق دل مسوس کر رہ گیا۔ پپڑی پڑے ہونٹوں پر سوکھی زبان پھیرتا ہوا وہ وہیں چبوترے پر بیٹھ گیا۔ تھوڑی دیر تک ہارا سا بیٹھا رہنے کے بعد وہ چبوترے پر لیٹ گیا اور پتھر کی دیواروں کو دیکھتا رہا۔

آج کل مجھے کھانے کے سوا کچھ بھی یاد نہیں آتا......! آخر مجھے کیا ہوتا جا رہا ہے؟ سوتا ہوں تو، جاگتا ہوں تو...... ماں کے ہاتھوں سے بنے پکوان......!

ماں کا خیال آتے ہی اسے اپنا گھر یاد آنے لگا۔ خبر سنتے ہی وہ بھاگا بھاگا گیا تھا۔ آدھا شہر اونچی اونچی عمارتوں کے ساتھ ڈھہ گیا تھا۔ وہ کیسی سیاہ رات تھی۔ بارش کی بوندوں نے ملبے کو دھو ڈالا تھا۔ ایمبولنس، فائر بریگیڈ اور ریڈ کراس کی بھاگتی گاڑیوں کی ہیڈ لائٹ میں ملبوں پر تھرتھراتی بوندیں چمک اٹھتی تھیں۔ فائر بریگیڈ اسٹور کی آگ پر قابو پا چکی تھی۔ ملبے پر چلتے ہوئے سڑک نام کی چیز ٹوٹی کھڑکیوں، دروازوں، دیواروں، سامانوں کے ڈھیر میں کہیں گم ہو گئی تھی۔ اسی ملبے کے ڈھیر پر چل کر اسے اپنا گھر ڈھونڈنا تھا۔

ابھی تھوڑی ہی دور چلا تھا کہ پاؤں کے نیچے کچھ نرم سی چیز آ دبی۔ سارے بدن میں جھرجھری سی دوڑ گئی۔ ماتھے پر پسینہ چھلک آیا۔ کسی مردہ جسم کا کوئی حصہ...... یہ اسی کا محلہ ہے...... ہو گا کوئی جان پہچان والا یا ساتھی سنگی...... ایک لمبی سانس لے کر اس نے ٹارچ روشن کی، اس کے جوتے کے نیچے ربڑ کی بہت بڑی سی گڑیا تھی۔ ٹھیک رویا، جیسی۔ سنہرے گھنگھرالے بال...... اس نے جھک کر گڑیا اٹھالی۔

پانی سے بھیگی ہوئی گڑیا مسکرا رہی تھی۔ جانے کس جذبے کے تحت اس نے گڑیا کو سینے سے لگا کر زور سے بھینچ لیا۔ پھر اس کے گالوں اور بالوں پر بے تحاشہ پیار کرنے لگا۔

اس کا گھر قریب آ چکا تھا۔ اس نے بہن کے لئے لائے تحفہ کو جیب میں ٹٹولا۔ ڈبیا موجود تھی۔ بڑی مشکلوں سے کئی جگہ کئی دکانیں دیکھ کر وہ اس بار اس کی فرمائش پوری کر پایا تھا۔ نازک زنجیر میں قید پرندہ اڑنے کو بے چین تھا۔ بہن کی گردن پر لٹکتا یہ پرندہ ہمیشہ اسے اپنے فرض کی یاد دلائے گا مگر وہ گردن...... سب کچھ...... آگے کا سب کچھ ٹوٹتے ستاروں میں بدلنے لگا۔

توفیق کا گھر صحیح و سالم تھا۔

ایک بار گاؤں تباہ ہوا تو میں پیدا ہوا، مگر ہمارے کھیت ہم سے چھن گئے۔ دوبارہ جب ہمارا آدھا شہر اجڑا تو میرا خاندان مجھ سے بچھڑ گیا اور آج جب دشمنوں کی چھاونی پوری طرح اجڑ گئی تو میں اپنی ہی سرزمین پر قیدی بنا اپنوں سے دور پڑا ہوں...... کیا یہاں سے میں کبھی آزاد ہو پاؤں گا؟ مجھے یہاں کوئی لینے آئے گا؟ ان اندھیری سرنگوں کا سفر کب ختم ہوگا؟ ہم فلسطینی کب گپھاؤں سے نکل کر انسانوں کی طرح زمین کو جوتیں گے، بوئیں گے، فصلیں اگائیں گے؟

اس سے تو اچھا تھا کہ میں اسی یہودی افسر کے حکم سے گولیوں سے چھلنی کر دیا جاتا۔ کم سے کم اس موت میں کوئی مقصد تو ہوتا...... اس طرح سے بے مطلب ایڑیاں تو نہ رگڑتا — بھوک، خوف، تنہائی، خالی پن کیسے بانجھ دن گزر رہے ہیں۔ توفیق کے اندر کا ست پڑا ہوا گھوڑا ایکا یک اچھل کر کھڑا ہو گیا۔ اس کی نسوں میں دوڑتا خون پچھاڑیں کھانے لگا۔ توفیق نے دروازے کو پوری طاقت سے جھنجھوڑا۔ اس پر دیوانگی سی چھائی تھی۔ اس نے سلاخوں پر سر دے مارا، مگر بے سود۔ سامنے پتھر کی دیوار منہ کھولے کھڑی تھی۔ اس کے اندر تڑپتے، بپھرتے طوفان سے بے پرواہ...... طیش میں آکر وہ کوٹھری کی دیوار پر اپنی بندھی ہوئی مٹھی مارنے لگا۔

مجبوری...... بے بسی اس کے وجود پر چھا گئی۔ سانسوں کے گرم الاؤ نے آنکھوں سے سوتے بہا دیئے۔ آنکھوں پر رکھی ہتھیلی کا خون کھارے پانی میں مل کر چہرے سے ٹپک ٹپک کر قمیص میں جذب ہونے لگا۔

ابھی سورج اوپر نہیں آیا تھا کہ آسمان گڑگڑاہٹوں سے بھر گیا۔ایک کے بعد ایک جہاز گزرنے لگے۔ توفیق نے جھٹ سے اپنی قمیص اتاری اور دروازے سے باہر ہاتھ نکال کر ہلانا شروع کر دیا۔امید کی لہر اس کے سارے بدن میں تھرتھراتی دوڑ رہی تھی...... سارے جہاز گزر گئے۔ اس کا ہاتھ ڈھیلا پڑنے لگا۔ آنکھوں کے سامنے تارے ٹوٹنے لگے۔نامراد، ناامید وہ چکراتا ہوا سا چبوترے پر بیٹھ گیا۔

'میرا ماضی آج پھر مجھے آواز دے رہا ہے۔اپنی سیاہ بانہیں پھیلا کر میرے وجود کو اپنی آغوش میں بھرنا چاہتا ہے، جو مستقبل کی طرف بھاگنا چاہتا ہے، جہاں آزادی کی چاندنی برس رہی ہے...... جہاں زندگی کا شور بکھر رہا ہے...... مجھے اتنی جلدی موت کی آرام گاہ نہیں چاہئے، بلکہ ایک ایسا سورج چاہئے جو مجھے روشنی سے نہلائے تاکہ میرے اندھیرے تہہ خانوں کی تاریخی عبارت کا سونا پھر سے جھلملا اٹھے، مگر اس قید خانے میں سورج کی کرنیں بھی نہیں پہنچ پاتی ہیں۔اوپر سے یہ بندشوں کا گھیرا جو جیتے جی میرا مقبرہ بن گیا ہے۔

اس کے حلق میں کانٹے سے چبھنے لگے۔ بدن میں ٹھنڈی سی سنسناہٹ، تھکن اس کی رگ رگ سے ٹپک رہی تھی۔ بڑی مشکلوں سے اٹھ کر کسی طرح وہ مٹکے تک پہنچا، برتن اندر ڈالا۔ تالاب میں پانی کی بوند بھی نہیں بچی تھی۔ برتن خالی مٹکے سے ٹکراتا، آواز کرتا اس کے ہاتھ سے چھوٹ گیا اور اس کا سر گھڑے کے ابھار پر ٹک گیا۔

توفیق کے اندر کا موسم بدل رہا تھا۔ وجود کے اندر چھٹکی دھوپ کا لاوا ٹھنڈا پڑتے پڑتے سخت چٹانوں میں بدلنے لگا تھا، جہاں بہاو اور ٹکراو کی جگہ ٹھہراو نے اپنا ڈیرا جما لیا تھا۔ ہر نیا دن پرانے دن کو نگلتا ہوا تیزی سے اس کے بچے سالوں کو دوگنی رفتار سے کھائے جا رہا تھا۔

'یہ میں ہوں؟' سوکھی شاخ کی طرح کمزور ہاتھ کو دیکھ کر توفیق نے جیسے اپنے سے پوچھا۔ پھر ویران آنکھوں سے پتھر کی ننگی دیواروں کو دیکھنے لگا۔

وہ میں تھا؟...... ہاں، وہ میں ہی تو تھا...... طاقت اور جوش سے بھرا آبشار، جسے کوئی بھی حادثہ نہ روک سکتا تھا، نہ باندھ سکتا تھا۔ وہ جوان ہوتا لڑکا میں ہی تو تھا، جو روٹی کھانے کے لئے اسرائیل جانے لگا تھا

اور ایک دن تھکن سے چور جب وہ سرحد پار نہ کر سکا اور وہیں راستے میں پڑ گیا تو اس جرم میں سرحدی حفاظتی پولس نے جوتوں اور لاتوں کی ٹھوکروں سے اسے فٹ بال میں بدل دیا تھا۔ تھکن کہیں بھاگ گئی تھی اور وہ لڑھکتا ہوا اندھیری رات کو پار کرتا گھر پہنچا تھا...... پھر اس لڑکے کی ماں نے اس کا باہر نکلنا بند کر دیا تھا...... بھوک مری، غریبی، بیکاری، مہنگائی...... کیسے برے دن تھے تو بھی وہ لڑکا مرجھا کر ٹوٹا تو نہیں تھا؟

اس وقت فلسطین کی زمین پر رہ کر بھی ہمیں ووٹ ڈالنے کا حق نہیں تھا، نہ سرکاری کانفرنسوں میں بیٹھنے اور بولنے کا حق تھا۔ جن کے پاس علم تھا، انہیں کچھ لکھنے کے جرم میں جیل کی سزا کاٹنی پڑتی تھی یا پھر اسرائیل کو تسلیم نہ کرنے کی پاداش میں جلاوطنی کا درد سہنا پڑتا...... پھر ایک دن ان ساری لڑائیوں اور کشمکش سے گھبرا کر خاموشی سے یہ طے پایا کہ فلسطین کی زمین سے باہر نکل کر جنگ کرنے میں زیادہ جان ہے...... بیروت، لبنان سب آگ میں جل اٹھے اور محسوس ہوا کہ جو وطن سے نکلا وہ کہیں کا نہ رہا۔

میرا خون اب ابلتا کیوں نہیں ہے؟ یہ پرانی یادیں بھی رگوں میں انگارے نہیں بھر پاتی ہیں...... میرے اندر کی جلتی آگ راکھ میں کیوں بدل رہی ہے؟ یہ قصور میرا ہے یا اس چہار دیواری کا ہے؟ میرے وجود کا گھوڑا ہنہنانا، ٹاپیں مارنا، دوڑنا کیوں بھول گیا ہے؟ اس طرح سے منہ ڈالے ست کیوں پڑا ہے...... کاش! میں اس اپاہج گھوڑے کو گولی سے اڑا سکتا۔

•

مشین گن کی لگاتار تگ تگ...... تگ...... توفیق کا پیچھا کر رہی تھی۔ وہ بھاگتا ہوا ڈھال کی طرف لپکا۔ ماں کا دیا آٹے کا تھیلا اس نے کس کر بغل میں دبا لیا اور ڈھلان پر انگوروں کی بیلوں کے نیچے رینگ گیا تو بھی ایک گولی اس کے بازو کو چھیلتی ہوئی نکل گئی۔ خون کی پتلی دھار درد سے پھوٹ کر تھیلے کو بھگونے لگی۔ دوسرے ہاتھ میں تھیلا لے کر وہ بازار کی طرف لپکا۔ پرچونیا فروش اس کی یہ حالت دیکھ کر چیخا۔

توفیق چونک کر اٹھ بیٹھا۔ اس کے کانوں میں اب بھی آوازیں گونج رہی تھیں، دل دھڑک رہا تھا۔

حلق میں کانٹے چبھ رہے تھے اور زبان سوکھ کر تالوں سے جا لگی تھی۔ کمزوری کے مارے اس کا برا حال تھا۔

کوٹھری سے باہر رات پتھروں پر پسر گئی تھی۔ توفیق کے اندر چھایا ہوا اندھیرا گہرا ہونے لگا تھا۔ ایک گھٹن سی اس کے اندر محسوس ہونے لگی تھی۔

'میں آج کسی سے باتیں کرنا چاہتا ہوں۔ اپنا دل خالی کرنا چاہتا ہوں...... مگر باتیں...... کس سے اور کیسے کروں؟ پتھر کی یہ بے زبان دیواریں مجھے دلاسا بھی نہیں دے سکتی ہیں۔ نہ میرے شکستہ وجود کا سہارا بن سکتی ہیں...... یہ موکھا...... اندھیرے کی آنکھ...... اس پر آج تک کوئی پرندہ آکر نہیں بیٹھا ہے...... میرا رشتہ ہر جاندار سے ٹوٹ چکا ہے اور ہر بے جان چیز میری ساتھی بن چکی ہے۔

'جب میں جنگ کے میدان میں موجود تھا تو سب کا تھا۔ آج اس بہاو سے چھٹک گیا تو کوئی میرا ہمدم، کوئی میرا دوست نہ رہا۔ مجھے سب بھول گئے...... اپنے بھی، پرائے بھی...... سچ ہے، اب مجھے موت کے علاوہ کسی کا بلاوا نہیں آئے گا، کوئی مجھے آواز نہیں دے گا...... کوئی مجھے لینے نہیں آئے گا......

رات خاموش قدموں سے پتھروں پر پاؤں جماتی صبح کی طرف بڑھ رہی تھی۔ ایسے ویرانے میں، دن، تاریخ، مہینے، سال کو کون گنتا ہے؟ یہاں قدرت کا پہیہ خاموشی سے انہیں نگلتا، گھومتا رہتا ہے۔ بس، گھومتا رہتا ہے......

اس بیچ کتنی بار سورج اگا، کتنی بار ڈوبا، توفیق کو کچھ یاد نہیں...... ہاں...... کال کوٹھری نے بھولی بسری بہت سی باتوں کو پھر سے دہرایا جنہیں نہ صرف وہ بھول چکا تھا بلکہ یہ سب کچھ اس کی زندگی میں روز ہوتے ہوئے حادثوں تلے دب گیا تھا۔ مگر آج پھر وہ سب کچھ یاد آکر اسے زندگی کا نیا نظریہ سمجھا رہے تھے۔

'کل جب اسرائیلی توسیع پسندی اور عرب قومی وحدت کا بخار دماغوں سے اتر جائے گا اس وقت کیا بچے گا؟ صرف لوگ بچیں گے...... مگر کہاں کے لوگ؟ کون سی سرحد؟ سرحدیں تو زمانہ قدیم سے تلوار کی جھنکار کے ساتھ اپنا رخ بدلتی آئی ہیں۔ مگر زمین پر بسنے والے تو وہی لوگ ہیں جن کی پیدائش کا سرچشمہ ایک ہے، جو ایک ہی طرح سے گڑھے جاتے ہیں...... پھر یہ روز نئی بنتی سرحدیں...... مذہبی

جنگ...... کیا سچ مچ پرانے کو مٹا کر نیا کچھ آتا ہے اور ہر انقلاب اپنے ہی بچوں کو نگلنے لگتا ہے؟'

'ایک اسرائیلی جو تل ابیب میں یہودی ماں باپ سے پیدا ہوا ہو اور پولینڈ کا پناہ گیر ہو...... ایک لڑکا جو عرب ماں باپ سے غازہ میں پیدا ہوا ہو اور یافا کا پناہ گیر ہو...... کیا ان کا کچھ بھی پیچھے نہیں چھوٹتا؟ اسرائیل کا وجود مٹ گیا تو پھر یہ بیرونی یہودی دوبارہ لوٹ کر کہاں جائیں گے؟ تب کیا پھر کسی اور سرزمین پر ٹینکوں کے دہانے انگارے اگلیں گے، لاشوں کا انبار لگے گا اور سرحدوں کا نیا دائرہ ناپا جائے گا؟'

'فلسطینی تنظیموں کا مختلف شاخوں میں بٹ جانا، پھر باہمی خیالات کے بکھراؤ میں اپنوں سے ٹوٹ کر مخالف ملکوں سے مل کر اپنے ہی مقصد کے خلاف اپنے لوگوں کی مخالفت میں کھڑا ہو جانا، یہ کس بات کی طرف اشارہ کرتا ہے؟'

'مان لو، کل ہمارا پیارا فلسطین ہمیں واپس مل جائے گا اور ساری دنیا میں بکھرے خانہ بدوش فلسطینی اپنے وطن کی طرف لوٹ آئیں تو کیا اس نئی نسل کی یاد کا حصہ لبنان، تیونس، اردن، بیروت نہیں رہیں گے، جہاں وہ پیدا ہوئے، پلے بڑھے اور جوان ہوئے؟ دوسری طرف عرب بھائی چارے کے باوجود اس چوٹ کو سہتے آئے کہ وہ فلسطینی پناہ گزیں ہیں۔ کیا وہ اپنے وطن فلسطین کی اجنبی سرزمین سے جڑ سکیں گے، جس سے وہ برسوں دور رہے اور پہلی بار اس سرزمین پر قدم رکھیں گے؟ دل و دماغ کے مابین جنگ انہیں بار بار یہ سمجھائے گی کہ سرحدوں کی بھی اپنی زبان ہوتی ہے۔ کیا انسان کی پہچان احساس اور فکر نہ ہو کر صرف سرحدوں کا گزرنامہ بھر ہوتی ہے؟'

توفیق کے دماغ کی کھڑکی کھل گئی تھی جس سے سرحدوں کا الجھا جال اسے زندہ سوالوں پر بکھرا نظر آرہا تھا۔ پوری دنیا نگاہوں میں اس طرح سے کھل کر گھوم رہی تھی، جیسے جمشید کا 'جام جہاں نما' اس کے ہاتھوں میں آگیا ہو اور وہ اس پیالے میں جھانک کر دنیا کی اصلیت کا نظارہ دیکھ رہا ہو۔

نیم بے ہوشی میں توفیق کی آنکھوں کے سامنے ایک پرانا شہر پھیلا ہوا ہے۔ چلتی ٹرین رکتی ہے اور وہ اس گاڑی سے اترتا ہے۔ بڑے بڑے بوڑھے درختوں کے سائے میں ریل کی پٹری تنہا خاموش رہ

جاتی ہے۔ وہ پٹری پر بکھرے پتھروں کو پھر درختوں کے بڑھتے اندھیرے کو پھیلتا دیکھتا ہے۔ ماحول کا جادو اسے اپنی بانہوں میں بھینچنے لگتا ہے۔ وہ ایک اجنبی کی طرح قدم آگے بڑھاتا ہے۔

دور میناروں سے پھوٹتی روشنی گنبد پر سنہرا رنگ پھیلا رہی ہے۔ وہ سحر زدہ سا اس طرف کھنچتا چلا جاتا ہے۔ سامنے پرانا بازار پھیلا ہے...... جہاں عجیب شکل کے برتن، مورتیاں اور موٹی موٹی کتابیں بھری پڑی ہیں۔ ایک دکان میں داخل ہو کر جب وہ کتاب اٹھاتا ہے اور اسے کھولتا ہے تبھی خط کوفی کی لکھاوٹ سے بھرا وہ خستہ کاغذ اس کے ہاتھوں کے لمس سے ننھے ننھے ٹکڑوں میں بدل جاتا ہے۔ وہ گھبرا کر کتاب واپس رکھتا ہے۔ کاغذ کی بوسیدہ مہک اس کے نتھنوں میں سنسنانے لگتی ہے۔

گلیاں کچے مکانوں سے بھنچی اپنے میں دبکی سہمی سی کھڑی تھیں۔ وہ ان کے اندر داخل ہوتا ہے۔ سوچتا ہے کہ حضرت عیسیٰ کو بھی صلیب پر لٹکانے کے لئے اسی طرح کے کسی گھر سے نکال کر لے جایا گیا ہوگا۔ یہیں آسمان کے نیچے ان کا شکوہ گونجا ہوگا کہ خدا، کیا تو بھی مجھے بھول گیا؟ یہیں اسی دھرتی پر سقراط نے زہر کا پیالہ پی کر الفاظ کا دریا بہایا تھا اور منصور حلاج نے روح کی کس گہرائی میں ڈوب کر 'انا الحق' کا نعرہ لگایا تھا۔

سامنے اونچے مینار اس تنگ گلی سے بھی نظر آرہے تھے۔ مجھے وہیں پہنچنا ہے۔ توفیق پیچ دار گلیوں کی بھول بھلیوں میں کھو گیا۔ اسی کوفہ کی زمین پر حضرت حسین پانی سے بھرے دجلہ اور فرات ندیوں کے باوجود کیوں پیاسے شہید ہوئے؟ ان سب کی نگاہیں کون سے وقت پر کس نکتے پر ٹکی تھیں؟ حق کی لڑائیاں لڑ کر انہوں نے کون سی اقدار و روایات ہمیں دی ہیں؟

اب تنگ گلی کھلے میدان میں آکر ختم ہو گئی جہاں مٹی، مٹی کو کھا رہی تھی اور اس سے وقت کی مہک کا پرانا پن پھوٹ رہا تھا۔ گرتی ہوئی عبادت گاہوں کے بیچ دھول اور غبار کے پرے نئی اونچی عبادت گاہوں کی نئی تراش نظر آنے لگی۔ خستہ عمارتوں کے بیچ گھومتے ہوئے توفیق کو یاد آیا کہ اسی سرزمین پر توریت، بائبل، قرآن — تین آسمانی کتابیں نازل ہوئی تھیں — تین فکر، تین مذہب، تین سماجی انقلاب۔ بڑی بڑی مذہبی جنگوں کا پھیلتا دائرہ......! پھر کمیونزم اور استعماریت کی رسہ کشی...... وقت نے ہمیشہ انسان سے اس کے جینے کی قیمت مانگی ہے۔ کسی نے ادا کی اور کسی نے قرض چھوڑ کر اپنی آنکھیں موند لیں۔

نئی عبادت گاہوں کی کاشی کاری اور فانوس سے جگمگاتی محراب کے نیچے آکر توفیق رک گیا۔ شیشہ کاری، گچ بری کی نقاشی اور جالی کے گل بوٹے پر اس کی نظر ٹھہر گئی۔

'کیا میرا وقت بھی مجھ سے میرے جینے کی قیمت مانگ رہا ہے؟' توفیق نیند سے چونک کر اٹھ بیٹھا۔ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر چاروں طرف دیکھا۔ پرانا شہر غائب تھا، نئی عمارتیں غائب تھیں، بس سامنے پتھر کی دیواریں تھیں۔

ہلکی ہلکی بارش شروع ہو گئی تھی۔ بڑی بڑی بوندیں زمین پر پہنچنے سے پہلے ہی ہوا کے ڈولے پر سوار ہو کر درختوں کی شاخوں سے لپٹ کر جھوم اٹھتی تھیں۔

توفیق کے احساس کی دنیا ابھی مری نہیں تھی۔ اس کے کان اپنے چاروں طرف چھائے ماحول کی مختلف آوازوں کے سر و تال کو پکڑنے کی صلاحیت رکھتے تھے۔ اس وقت بنا دیکھے ہی اسے سب کچھ نظر آرہا تھا کہ ہوائیں پکی زیتونوں کو زمین پر گرا رہی ہیں۔ ٹپ...... ٹپ...... ٹپ...... تالو سے لگی سوکھی زبان زیتون کی لذت کی یاد سے نرم سی پڑنے لگی تھی۔

'خدا تجھے اتنی توفیق دے کہ تو ہماری کھوئی ہوئی منزل کو پا سکے...... اسی امید پر میں نے تیرا نام توفیق رکھا ہے!'

ماں کی آواز کے ساتھ سینہ کوبی کرتی، نوحہ کرتی عورتیں کالے کپڑوں اور سفید اسکارف کے ساتھ دل کی سرنگ سے ہو کر گزر جاتی ہیں۔ محسوس ہوتا ہے کہ زیتون کے سائے اس پر چاروں طرف سے جھک آئے ہیں۔ شاخوں کے ہلنے میں ماں کے ہاتھوں کا لمس ہے۔ ایک گرمی سے بھرپور مہک کے غبار میں توفیق ڈوبنے لگا۔ گرتی زیتونیں اس کے مردہ ہوتے بدن کو ڈھنک رہی ہیں۔ موت کی آمد سے توفیق کے ماتھے پر موت کا پسینہ چھلک آیا۔ آنکھیں ڈھلکنے لگیں۔ ہاتھ پاؤں ڈھیلے پڑنے لگے۔

'کیا اس گنہ گار سر زمین کو پھر کسی نئے پیغمبر کی آمد کا انتظار ہے؟'

باہر طوفان کا جھکڑ تیز ہو گیا تھا۔ بوچھاریں چھت کے سوراخ سے توفیق تک پہنچ رہی تھیں۔ اس کے

بالوں، داڑھی اور بھنووں پر بکھری ننھی ننھی بوندیں الماس کی طرح جھلملا رہی تھیں۔

آسمان سے گرتی بارش کی لڑیوں کو چیرتی آواز وقت کے رتھ پر سوار صدیوں کا سفر طے کرتی کسی پیغام کی طرح چہار سمت کے دروازے کھولتی ہے۔ مقدس قبلہ کے آگے سجدے نے اندھیرے تہہ خانوں میں نور کی قندیل روشن کردی۔ خط کوفی کے سنہرے لفظوں کے پھیلتے ہالے سے روح کا پرندہ امن کی فاختہ کی طرح چونچ میں زیتوں کی شاخ پکڑے موکھے سے اس طرح اڑا جیسے حضرت نوح کو خشکی کا پتہ چل جائے۔

کاغذی بادام

دھیرے دھیرے رات اپنے سیاہ کپڑے اتار رہی تھی اور پختون خانم ایک دردناک خواب دیکھتی کھری پر تڑپ رہی تھی۔ ایک کھلا میدان ہے جہاں خالی پالنے بکھرے پڑے ہیں اور وہ ہر پالنے میں جھانکتی کچھ ڈھونڈتی گزر رہی ہے۔ راستہ ہے کہ ختم ہونے کا نام ہی نہیں لے رہا ہے۔ اس کو کس کی تلاش ہے؟ وہ ان خالی پالنوں میں کیا ڈھونڈ رہی ہے؟ سوچتی ہوئی پختون وہیں ایک سوکھے پیڑ کے تنے سے ٹک کر کھڑی ہو جاتی ہے۔ پو پھٹنے لگتی ہے اور سارے پالنے خون سے بھرنے لگتے ہیں۔

'گل بانو...... گل بانو......' گھبرا کر چیختی ہوئی پختون خانم آگے بڑھتی ہے۔ ہر پالنے میں بچوں کے کٹے سر پڑے ہیں۔ کوئی بھی چہرہ گل بانو سے نہیں ملتا۔ پختون خانم وحشت زدہ سی چاروں طرف دیکھتی ہے۔ سورج کی چمکیلی روشنی میں سارے پالنے قبروں میں بدل جاتے ہیں اور وہ دانہ چگتی چڑیوں اور قبروں پر لگے لال، ہرے، کالے جھنڈوں کی قطاروں کے بیچ اکیلی کھڑی رہ جاتی ہے۔

'بدبخت، کیوں رو رہی ہے سوتے میں؟' ڈنگروال نے پختون کا کندھا ہلایا۔ ایک تڑپ کے ساتھ گھبرائی پختون نیند سے جاگی اور گھبرائی نظروں سے اپنے چاروں طرف دیکھا۔

اتنے سارے سال کب اور کیسے بیت گئے، پختون کو پتہ ہی نہ چلا۔ گل بانو کا چہرہ دھندلا پڑا اور نہ کاغذی بادام کے درخت ہی آنکھوں کے سامنے سے اوجھل ہوئے۔ گل بانو کا گلابی چہرہ اور کاغذی بادام کے گلابی مہکتے پھول اس کی آنکھوں کے سامنے ناچتے رہے۔ جب تک وہ جاگتی، چین سے رہتی۔ سونے سے اسے ڈر لگتا، مگر کب تک جاگتی؟ جانے کب آنکھ لگ جاتی اور پھر وہی خواب کا سلسلہ اسے پسینے سے شرابور کرتا، خوف سے جھنجھوڑتا طوفان کی طرح گزر جاتا تھا۔

سورج جب سر پر سوار ہوا تو تھکا تھکا سا عبدالعزیز ڈنگروال اپنی جگہ سے اٹھا اور تھیلا اٹھا کر باہر نکلا۔ لنگڑاتے لنگڑاتے سڑک خوشحال خاں کھٹک پر نہر کے کنارے پہنچ گیا۔ وہیں ایک سائے دار درخت

کے نیچے روز کی طرح اس نے اپنا ڈیرا جمایا اور انگوچھا جھاڑ کر اسے زمین پر بچھایا اور بڑے قرینے سے اس پر دکان سجانے لگا۔ چند سگریٹ کی ڈبیاں، لیمن چوس کا ڈھیر اور جڑی بوٹیاں، اسی کے بیچ میں دو پھولدار پلاسٹک کی پلیٹیں سجا کر وہ چین کی سانس لیتا۔

سڑک پر سے کسی دوسرے افغانی کو اچھی حالت میں گزرتا دیکھتا تو حسد سے اس کی جان جل جاتی اور اچھے دنوں کی یاد میں اس کا کلیجہ منہ کو آنے لگتا۔ اگر کوئی سیاسی لیڈر کالے شیشوں کی وین میں سامنے سے فراٹے بھرتا نکل جاتا تو روتے بچوں کی ماؤں کو لیمن چوس دینا بھول جاتا اور دل ہی دل میں بیشمار گالیاں دے ڈالتا۔ اس بیچ غلطی سے کوئی اس پھولدار پلیٹ کے دام پوچھ لیتا تو پھر وہ آپے میں نہ رہتا۔ پھپھکارتا زخمی سانپ کی طرح اس گاہک کا گریبان پکڑ کر لٹک جاتا اور پھر زبان ایسا زہر اگلتی کہ سننے والوں کا دماغ پھٹنے لگتا۔

'عزیز، یوں کیوں الجھتے ہو میرے بھائی؟' آخر ایک دن یوسف بزاز نے پھیری سے لوٹتے ہوئے گٹھر پیڑ سے لگا کر، اس کے پاس بیٹھتے ہوئے کہا۔

'تو کیا کروں، زبان بھی کاٹ دوں؟' بے بسی سے عزیز ڈنگر وال نے بچپن کے دوست کو جواب دیا۔

'مجھے دیکھو، کتنا بڑا خاندان تھا اپنا...... کوئی نہیں بچا، مگر اپنے اوپر قابو رکھتا ہوں۔'

'میری یہ ٹانگ...... مجھے قابو میں نہیں رہنے دیتی ہے...... کیسے بتاؤں تمہیں میرے یار!' عقدہ سے بھرے لہجے میں عزیز نے اپنے مڑے پیر کو دیکھا۔

عزیز ڈنگر وال کے چہرے پر ایک بیچارگی پھیل گئی۔ اسے دیکھ یوسف چپ ہوگیا۔ آخر اپنے محلے کے سب سے خوبصورت جوان کو وہ کیسے بھول سکتا تھا جو بہار کے موسم میں ڈفلی کے ساتھ لَٹّئی ایسا ناچتا کہ اس کے قدم کی مستی پر جوان لڑکیاں ہی نہیں، بلکہ بزرگ بھی واہ واہ کر بیٹھتے تھے، مگر اب وہی عزیز بھری جوانی میں بوڑھا، لنگڑا، چڑچڑا ہو کر رہ گیا ہے۔ گانا بجانا، ناچنا تو دور، سیدھے منہ بات کرنا وہ بھول چکا ہے۔ یہ دو پلیٹیں، جن میں اس کی جان اٹکی ہے، اس کے اچھے دنوں کی یاد ہیں۔ وہ سب کچھ دے سکتا ہے مگر وہ گزری یادیں نہیں، یہ یوسف جانتا ہے کیونکہ نیا حاصل ہو جاتا ہے مگر گزرا واپس نہیں آتا ہے۔

'چلو گھر چلیں، شام ڈھل رہی ہے۔' کہتا ہوا یوسف کھڑا ہوا۔

'گھر...... ہاں...... چلو۔' کہتا ہوا عزیز اپنا سامان تھیلے میں ڈالنے لگا۔

دونوں پیڑوں کے سائے میں چلتے رہے۔

'کیا تمہارے سبھی پیڑ جل گئے عزیز؟' یوسف نے چپّی توڑی۔

'ہاں، خبر تو یہی ملی ہے۔' عزیز نے چلتے چلتے ٹھہر کر کہا۔

'میرا تو پہلے ہی سب کچھ بمباری میں ڈھہہ گیا تھا...... کچھ بچا نہیں...... لوٹ کر جاؤں بھی تو کس کے لئے جاؤں وہاں؟ نہ گھر، نہ گھر والے، نہ کھیت نہ پھل کے درخت، کچھ نہ بچا......' یوسف نے دھیرے سے کہا۔

'وطن بیچ کھایا...... ہمیں دربدر کیا...... وہ دن، وہ اچھے دن، اب نہیں لوٹیں گے...... کبھی نہیں لوٹیں گے......' عزیز نے بدبداتے ہوئے کہا۔

'سب اوپر والے کا کرشمہ ہے......' یوسف نے کہا اور ٹھہر کر عزیز کے کندھے پر ہاتھ رکھتا دوسری گلی کی طرف مڑ گیا۔ عزیز خاموشی سے لنگڑاتا آگے بڑھنے لگا اور دل ہی دل میں کہنے لگا کہ یہ اوپر والے کا نہیں، سیاست دانوں کا چکر ہے۔

جاڑے کی ہوائیں ڈنگروال کے بدن سے ٹکرا کر واپس جا رہی تھیں۔ اس جاڑے میں بھی عزیز ڈنگروال کا بدن پسینے سے نہایا ہوا تھا۔

'او لنگڑے بابا، بچ کے!' پیچھے سے تانگے والے نے کہا اور ڈنگروال کے ہٹنے کی پرواہ کئے بغیر وہ اسی رفتار سے آگے نکل گیا۔

'خدا انہیں برے دن دکھائے۔' اس نے پلٹ کر جاتے تانگے والے کو گالی دی۔

'اچھے بول منہ سے نکالو۔' پاس سے گزرتے حاجی نے کہا۔

ڈنگروال جب چلتے چلتے تھک گیا تو سڑک کے کنارے ستانے بیٹھ گیا۔ رات اتر آئی تھی۔ بجلی کے

کھمبوں نے اپنی روشنی بکھیرنی شروع کر دی تھی۔ ڈنگروال نے اداسی سے اپنے پیر کو دیکھا اور ٹھنڈی سانس بھری۔ پہاڑوں سے اترتے ہوئے اس کے پیر پر پتھر گر گیا تھا۔ بھاگتے لوگوں کے پاس تھا کیا جو عزیز کے پیر میں لگاتے۔ دو دن، تین راتیں اس زخمی پیر کے ساتھ اس نے گزاریں اور تب جا کر وہ صوبہ سرحد پہنچنے میں کامیاب ہوئے تھے۔ تب تک پیر ہمیشہ کے لئے خراب ہو چکا تھا۔

ایسا نہیں تھا کہ وہ پہلے پہاڑوں سے اترے نہ ہوں، آخر ہر جاڑے میں وہ بادام کے بورے اٹھائے نیچے اترتے تھے۔ عورتیں، بچے گھر گھر جا کر بادام، جڑی بوٹیاں بیچنے لگتے اور جاڑے بھر مرد کھیتوں کی مینڈ اور کچی دیواروں کو بنانے میں مصروف ہو جاتے تھے۔ موسم بدلتے ہی برف پگھلنے کے ساتھ وہ میدان سے پہاڑوں کی طرف لوٹ جاتے تھے۔ مگر اس بار یہ کیسا آنا ہوا کہ موسم پر موسم بدل رہے ہیں، مگر وہ اس گرم تپتے میدان میں سوکھے پتوں کی طرح اڑتے پھر رہے ہیں؟

پختون کے پیٹ کا درد اب سارے بدن میں پکے پھوڑے کی طرح پھٹ کر پھیل گیا۔ رات دن کی تپکن نے اس کو گھر والوں سے بیزار بنا دیا تھا۔

'میرا کہنا مانو تو گل بانو کو بھیج دو، کم سے کم وہ دو وقت پیٹ بھر کر کھا سکتی ہے نا...... اس کی تنخواہ سے پختون خانم کا علاج ہو سکتا ہے۔ جب مالی حالت سدھرے تو گل بانو کو واپس بلا لینا۔' لال زاد نے اس کی پریشانیاں دیکھ کر رائے دی۔

'لوگ کیا کہیں گے؟' عزیز نے اداس آنکھیں اٹھائیں۔

'جن کا ڈر ہے تمہیں، وہ کون سی تمہاری مدد کر رہے ہیں؟' لال زاد نے پھبتی کسی۔

'کہتے تو ٹھیک ہو، مگر...... 'اتنا کہہ کر عزیز چپ ہو گیا۔

'فیصلہ ٹھنڈے دل سے کرو، صلاح مشورہ پختون خانم سے بھی لو، جیسا ہو مجھے دکان پر بتا جانا۔' کہہ کر لال زاد چلا گیا۔

عزیز گھٹنوں پر سر رکھے بڑی دیر تک اپنی مایوس برباد زندگی کے بارے میں سوچتا رہا، جس میں امید کی کوئی روشنی نہیں تھی۔

عزیز ڈنگر وال کو دل ہی دل میں خدا سے بہت شکایتیں تھیں۔ جیسے اس کی قسمت میں انہوں نے صرف ایک بیٹی ہی لکھی۔ عورت کو ایسا بیمار ڈال دیا کہ وہ دو گھڑی چین سے بیٹھ کر کوئی کام نہیں کرسکتی ہے۔اس سے بیٹے کی امید کرنا بیکار ہے۔ بیٹا ہوتا تو بڑھاپے کی لاٹھی بنتا، کچھ نہیں تو محنت مزدوری کر کے ان کا ہاتھ بٹاتا۔

دوسری شکایت اسے یہ تھی کہ خدا پر ایمان رکھنے والوں کا وطن ملحدوں کے ذریعہ چھینا گیا اور اس ناانصافی کو دیکھ کر خدا خاموش رہا۔ جب کوئی سمجھانے کے لئے جھوٹی تسلی دیتا کہ خدا کے گھر میں دیر ہے اندھیر نہیں، تو اس کا دل چاہتا کہ کہنے والے کا سر پھوڑ ڈالے، مگر خدا کے لئے وہ کسی بھی طرح کے توہین آمیز الفاظ برداشت نہیں کرسکتا تھا۔ اس پر لڑنے مرنے کو تیار ہو جاتا اور سیدھے اسے وطن فروش کا نام دے بیٹھتا اور کہتا کہ وہ خدا کو آپس میں بانٹ تو سکتا ہے، مگر اس ایمان کو کوئی چھینے یہ وہ کیسے برداشت کرے؟

غرض کہ ڈنگر وال اپنے حالات کی بیڑیوں میں اس طرح جکڑا ہوا تھا کہ وہ کوئی ایک راستہ نہیں پکڑ سکتا تھا۔ نماز پڑھنا، روزہ رکھنا وہ جانتا نہیں تھا۔ قرآن اس نے پڑھا ہی نہیں تھا۔ پھل کے باغ کا مزدور بن کے ساری زندگی گزاری تب کہیں روٹی اور زمین کی حقیقت جانی۔ جب پیٹ بھر کھانا مل جاتا تو خدا کا شکرادا کرتا اور جب فاقے کرنے پڑتے تو جی بھر کر خدا کو برا بھلا کہتا۔ بھوک سے بلبلا کر کہہ اٹھتا کہ یہ اوپر والا اندھا ہے تبھی حساب میں کمزور ہے، کہیں اناج کی بارش کرتا ہے تو کہیں کسی کو دانے دانے گن کے دیتا ہے۔

ساری رات اپنے سے لڑتے گزری۔ آخر صبح ہوتے ہوتے عزیز نے فیصلہ کرلیا۔ دس برس کی گل بانو کا ہاتھ پکڑ لال زاد کی دکان پر پہنچ گیا۔ اسے دیکھ کر لال زاد نے کہا— 'ٹھہرو ابھی آتا ہوں۔'

'چل گل۔' کہہ کر عزیز دکان کے سامنے والے پیڑ کے نیچے بیٹھ گیا۔

آتے جاتے لوگ، کیا مرد کیا عورت، گل بانو کے خوبصورت چہرے کو دیکھنا نہیں بھولتے تھے۔ یہ سب عزیز کو برا لگ رہا تھا مگر جی مار کر بیٹھا رہا۔

'چلو بھائی ڈنگر وال، بڑی مشکل سے چھٹی ملی ہے۔' کہتا ہوا لال زاد آیا اور پھر تینوں بس لینے سڑک کو

پار کرنے لگے۔

گھر کے دروازے پر پہنچ کر عزیز کا دل گھبرانے لگا۔ دروازہ جیسے ہی کھلا، لال زاد نے سلام دعا کی اور عزیز اور گل بانو کے بارے میں بتایا۔

'اندر آؤ، بیٹھ کر بات کرو۔' دروازہ کھولنے والے جوان آدمی نے کہا۔

تینوں اندر پہنچ کر کمرے میں بیٹھ گئے۔ لال زاد نے بات طے کرادی۔ کھانا، کپڑا، دو سو روپے تنخواہ...... سن کر عزیز خوشی سے بیٹی کے چھوٹنے کا غم تھوڑی دیر کے لئے بھول گیا۔

چلتے وقت گل بانو منہ پھاڑ کر رونے لگی۔ عزیز ڈنگروال بیچین ہو اٹھا۔ لال زاد نے ڈنگروال کا شانہ تھپک کر ہمت بندھائی، مگر وہ بیٹی کو اپنے سے الگ نہ کر سکا۔

'بابا، مجھے چھوڑو مت بابا۔' گل بانو سسک رہی تھی۔

یہ سارا منظر دیکھ کر گھر کی مالکن نے صاحب کو اشارہ کیا۔ انہوں نے سو کا نوٹ عزیز کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا— 'بچی ہے، ایک دو دن میں اس کا دل لگ جائے گا۔'

'یہ دیکھو۔' جوان مالکن پانچ برس کے بیٹے کو کمرے میں لے کر داخل ہوئی۔

'ایک چھوٹا بھائی اور ہے!' مالک نے جلدی سے کہا۔

'ان کے ساتھ کھیلنا۔' مالکن کی آواز گونجی۔

گل کا رونا بند ہوگیا۔ آنسو بھری آنکھوں کو پونچھتے ہوئے سامنے دیکھا۔ عزیز کا دل سنبھلا اور مالک نے لمبی سانس کھینچی۔

'صاحب، یہ آپ کی زبان سیکھ جائے گی۔' لال زاد نے دھیرے سے کہا۔

'ٹھیک ہے...... دھیرے دھیرے اپنا گھر سمجھنے لگے گی...... بچی تو ہے۔' مالکن نے پیار سے گل کے سر پر ہاتھ رکھا۔

عزیز اور لال زاد باہر نکلے اور گل بےچین ہو کر ان کے پیچھے بھاگنا چاہا، مگر مالکن نے پیار سے اس کا ہاتھ پکڑا اور اندر کمرے میں لے جا کر اسے کچھ کھانے کو دیا۔ کچھ دیر گل آنسو بھری آنکھوں سے ان بسکٹوں کو دیکھتی رہی پھر بڑی ناامیدی سے اس نے چاروں طرف دیکھا اور سسکی بھری۔

'یہ لو گی......' لڑکے نے جیب سے ٹافی نکال کر ہتھیلی اس کے سامنے کر دی۔

گل بانو نے گردن سے نہیں کا اشارہ کیا مگر ہلکی سی مسکراہٹ اس کے بھیگے چہرے پر پھیلی جب لڑکے نے آنکھ جھپکاتے گردن ہلا کر ٹافی اٹھانے کا اصرار کیا۔

زبان دونوں کی جدا تھی۔ ایک پنجابی بول رہا تھا، دوسرے کو صرف پشتو زبان کی سمجھ تھی۔

'میٹھی ہے نا؟' گل نے ٹافی جیسے ہی منہ میں رکھی، لڑکے نے پوچھا۔

'ہاں۔' گل نے ہلکے سے کہا اور آنکھیں پونچھی اور ہنس پڑی۔

مالکن کے پیار سے زیادہ بھر پیٹ کھانا گل کو سکھ دینے لگا۔ کام تو جی توڑ کر وہ گھر میں بھی کرتی تھی، مگر تھکنے پر کبھی سوکھی روٹی اور بھوک لگنے پر پانی پی کر سونا پڑتا تھا۔ یہاں دودھ، دہی، انڈا، پنیر جانے کون کون سا کھانا، جو اس نے کبھی نہیں کھایا تھا، کھانے کو ملتا۔ شروع شروع میں کھاتے وقت بابا اور ماں کی بہت یاد آتی تھی۔ جانے انہوں نے کچھ کھایا یا نہیں، پھر اسے عادت سی ہونے لگی۔

پندرہ دن بعد یکایک عزیز بیٹی کے پاس پہنچ گیا۔ اسے دیکھتے ہی کام کرتی گل عزیز سے لپٹ کر رونے لگی اور گھر جانے کی ضد کرنے لگی۔

'تمہارا جلدی جلدی آنا ٹھیک نہیں ہے۔' مالکن نے کہا۔

عزیز روتی بیٹی کو پیچھے چھوڑ کر آگے بڑھا۔ سارے راستے اندر ہی اندر گھٹتا رہا۔ پختون سے وعدہ کر کے آیا تھا کہ وہ آج بیٹی کو دو تین گھنٹے کی چھٹی لے کر اسے دکھانے لائے گا، مگر......

'کیا ہوا؟' دروازے پر پختون کھڑی تھی۔ اکیلے عزیز کو دیکھ کر پریشان ہو اٹھی۔

'لڑکی دوسروں کی چاکری کر رہی ہے۔' عزیز نے جیسے اپنے سے کہا اور زمین پر بچھی دری اٹھا کر خوب

زور سے جھاڑی، پھر چیزیں پٹک پٹک کر سلیقے سے لگانے کی کوشش کرنے لگا۔

پختون پھر کچھ نہیں بولی اور چپ چاپ آنکھوں میں آئے آنسو آستین سے پونچھ کر کام میں لگ گئی۔

گل بانو کا رنگ دو مہینے میں کھل کر گلاب ہو گیا تھا۔ اس بار عزیز پختون کے علاج کے لئے کئی ماہ کا ایڈوانس لینے گیا تھا۔ روپئے لے کر جب لوٹنے لگا تو گل باپ کے شانے سے چپک گئی۔ مالک کے روپیوں کا احسان، کہیں وہ پھر کچھ کہہ نہ بیٹھیں، اس لئے اس نے گل کو جھٹک دیا۔

'بابا، مجھے بھی ساتھ لے چلو۔'

'ماں اسپتال سے جب لوٹ آئیں گی تب لے چلوں گا۔' دھیرے سے عزیز نے کہا۔

'تب میں یہاں نہیں رہوں گی۔' ماں کی بیماری کا تو نہیں، ہاں، اسپتال کا نام سن کر ضرور گل گھبرا سی گئی اور رونے لگی۔ عزیز نے اپنے کو چھڑایا۔ جب گل دوبارہ باپ کی طرف بڑھی تو عزیز ڈنگر وال نے جھنجلاہٹ میں اس کے گال پر چپت مار دی۔ مار کھا کر گل چپ ہو گئی، رونا بھی بھول گئی۔ عزیز تیزی سے لنگڑاتا ہوا باہر کی طرف لپکا۔

راستے بھر وہ اپنے کو کوستا رہا کہ آخر اس نے پھول سی بچی پر ہاتھ کیوں اٹھایا؟ اس کی آنکھوں میں کیسی بے چینی تیر رہی تھی۔ پھر دل کو سمجھانے لگا، سب ٹھیک ہو جائے گا۔ جیسے ہی پختون ٹھیک ہوئی وہ گل بانو کو گھر واپس لے آئے گا۔ ماں بیٹی ساتھ ساتھ محنت مزدوری کر کے پیٹ بھرنے بھر کو کما لیں گی۔

اس گھر میں گل بانو کا وقت کٹ رہا تھا۔ اچھا یا برا، وہ یہ نہیں جانتی۔ صبح سے پھرکی کی طرح وہ کام میں جٹی رہتی ہے مگر جب مالکن بچوں کو پیار کرتی انہیں لپٹاتی، روتے ہوئے ان کے آنسو پونچھتی، انہیں مناتی تو اسے ماں بابا بہت یاد آتے تھے۔ اب وہ ایک ایک دن گن گن کر کاٹ رہی تھی کہ کب ماں اسپتال سے واپس آئے اور بابا اسے لینے آئیں۔

پختون جب صحت یاب ہو گئی تو نذر کی مٹھائی لے کر عزیز مالک کے گھر کی طرف چلا۔ اس نے طے

کر لیا تھا کہ آج گل بانو کو لے کر ہی لوٹے گا۔ گھر میں بھی چار لوگوں کو پختون نے بلا رکھا ہے۔ عرصے بعد خوشی کا منہ دیکھا ہے۔ اپنے میں مگن وہ مالک کے دروازے کی طرف بڑھا۔ وہاں بڑا سا تالا لٹک رہا تھا۔ اداس دل سے اس نے آس پاس والوں سے پوچھا تو پتہ چلا کہ انہیں گئے پندرہ دن ہو گئے ہیں اور اس مکان میں کل نئے کرائے دار آ رہے ہیں۔

عزیز کا سر چکرانے لگا کہ وہ کیا سن رہا ہے۔ دوڑا دوڑا لال زاد کی دکان پر گیا تو پتہ چلا کہ لال زاد کام سے پنڈی گیا ہوا ہے، مہینے بھر بعد آئے گا۔ عزیز کو لگا، چاروں طرف گھپ اندھیرا چھا گیا ہے۔ اب کس منہ سے وہ پختون کے سامنے جائے۔

لنگڑاتا عزیز ڈنگروال نہر کی طرف مڑا۔ شاید خوشحال خاں کھٹک کی طرف یوسف مل جائے۔ اس سے مدد مانگیں۔ اسے تو مالک کا نام بھی پورا نہیں معلوم تھا۔ کیا کرتے ہیں، کہاں کے رہنے والے ہیں، یہ سارے سوال اس وقت اس کے دماغ میں نہیں آئے جب وہ بیٹی چھوڑ رہا تھا اور آج وہی سوال اس کی زندگی کے اہم حصے بن چکے ہیں کہ آخر دس سال کی اس پھول سی بچی کو لے کر وہ کہاں چلے گئے؟

'تو نے کہیں...... 'یوسف نے گھبرا کر پوچھا۔

'نہیں، نہیں...... میری بات کا یقین کر میرے یار!' عزیز پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔

'مجھے یقین ہے کہ انہوں نے سمجھنے میں غلطی کی ہے۔ تو نے ایڈوانس دو ہزار مانگے، وہ سمجھے کہ تو بیٹی بیچ رہا ہے۔' یوسف نے دھیرے سے کہا۔ اس کے چہرے کا رنگ بھی اڑ چکا تھا۔

عزیز تو ٹوٹ کر رہ گیا۔

پختون رو دھو کر بیٹھ گئی، مگر عزیز ڈنگروال کو جیسے خاموشی کھا گئی۔ چلانا، خدا سے لڑنا، کھاتے پیتے لوگوں کو گالی دینا اس نے چھوڑ دیا تھا۔ سارے دن منہ لپیٹے گھر میں پڑا رہتا اور پختون ادھر ادھر مزدوری کر کے پیٹ بھرنے کا انتظام کرتی۔ عزیز کبھی کھاتا اور کبھی دو دو دن تک بھوکا پڑا رہتا تھا۔ اس کے سر کے بال اور داڑھی بڑھ گئی تھی۔ اس کی آنکھوں میں کبھی اتنا اجنبی پن ابھرتا کہ پختون کو ڈر محسوس ہوتا جیسے وہ کسی غیر مرد کے ساتھ رہ رہی ہو۔ اکثر رات کو جب پختون کی سانسیں تیز

ہوتیں تو عزیز کی آنکھوں میں اس کے لئے پہچان کی کوئی چمک نہیں ابھرتی۔ وہ اس کے پاس رہ کر بھی کہیں کھویا رہتا۔

'گل بانو کو بھول جاؤ عزیز، ایک نیا گل محمد ہماری گود بھر سکتا ہے۔' تنگ آ کر ایک دن پختون نے دل کی بات زبان پر لا دی۔

'اب میرا دل اس دنیا سے اُچٹ گیا ہے پختون!' بہت بھاری، اجنبی آواز میں ڈنگر وال نے کہا۔

'ایسا مت کہو۔ یہ عمر ہے دنیا سے منہ موڑنے کی؟' جوان پختون نے روتے ہوئے کہا، مگر عزیز اس کی طرف سے کروٹ بدل کر لیٹ گیا۔

چند مہینے بعد آخر پختون کو یہ سچائی ماننی پڑی کہ اس کا شوہر پیر اولیا بن گیا ہے، جس میں اپنے عزیز کو ڈھونڈنا اب مشکل ہو چکا ہے۔ سارے دن اس کے گھر میں تعویذ لینے والوں کا تانتا بندھا ہوتا۔ خدا بھی شاید ڈنگر وال سے مذاق کر رہا تھا۔ اس سے سب کچھ چھین کر اس کے منہ سے نکلی بات کے جادو سے دوسروں کی مرادیں پوری کروا رہا تھا۔ اب گھر میں روپیہ، پیسہ، کپڑا لتا، کھانا پینا سبھی کچھ تھا۔ یہ حالت دیکھ کر پختون اپنے آپ سے پوچھتی:

'عزیز کو تو خدا مل گیا، مگر مجھے تو کچھ بھی نہ ملا۔ شوہر، بیٹی، وطن، گھر سب چھن گیا۔ خدا کے سامنے سجدے میں گرے بھی تو کس بات کا شکر ادا کرے؟' پختون تعویذ کے لئے سوکھے موم جاموں کو سمیٹتی ہوئی سوچتی رہی۔ موم جاموں کو چوکور چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں کاٹنے کے بعد اس نے مڑی ہوئی تعویذوں کو اٹھایا اور ایک ایک کر کے موم جاموں میں سینے لگی۔

'کھول کر دیکھوں، آخر عزیز ان پر لکھتا کیا ہے؟' پختون نے آخری تعویذ ہاتھ میں اٹھاتے ہوئے سوچا۔ وہ تو پڑھا لکھا بھی نہیں، پھر......؟ تعویذ کا پہلا ہی موڑ کھولا تھا کہ دل دہل گیا کہ کہیں گناہ اس پر نہ پڑے۔ سب کہتے ہیں کہ خدا کے کام میں دخل نہیں دینا چاہئے۔

دھوپ کا پیلا ٹکڑا زمین سے سرک کر دیوار پر چڑھنے لگا۔ ہاتھوں میں ریشم اور کپڑا اٹھائے آس پاس

کی عورتیں کھانے پینے سے نپٹ کر پختون کے آنگن میں جمع ہونے لگی تھیں۔

'اپنے گل بانو کے لئے پیر سے تعویذ کیوں نہیں لیتیں؟' لال پری نے ایک دن پختون سے دھیرے سے کہا۔

'خدا سب جانتا ہے۔' پختون نے آہ بھری۔

'وہ تو ہے، مگر سب کا دکھ دور کرنے والا اپنا بھی تو دکھ دور کرے۔' لال پری اتنا کہہ کر کڑھائی میں لگ گئی، مگر پختون کے دل میں لاکھوں سوئیاں ایک ساتھ چبھ گئی تھیں۔

پختون دل، دماغ اور جسم کے دکھوں سے سمجھوتہ کر چکی تھی۔ اس کی زندگی سے مرد خارج ہو چکا تھا۔ نازائیدہ بچے کا خواب بھی ٹوٹ چکا تھا، مگر جس شئے کو اس نے نو مہینے کوکھ میں رکھا ہو اور دس سال تک اسے پالا پوسا ہو آخر اسے وہ کیسے بھول جائے جو زندہ ہے، مری نہیں، مگر اپنے سے دور جانے کہاں بھٹک رہی ہے؟

محلے کی جوان لڑکیاں ایک ایک کر کے بیاہ گئیں اور پختون ہر ایک کے بیاہ کے دن گل بانو کی عمر جوڑنے بیٹھ جاتی۔ جب آخری لڑکی بیاہی تو اسے یاد آیا، ہاں، اب وہ پورے چودہ سال کی ہو گئی ہوگی۔

موسم بدل رہا تھا، مگر پختون خانم کی قسمت نہیں بدل رہی تھی۔ عزیز ڈنگروال اپنی دھند میں کھوتا جا رہا تھا۔ پختون آخر کتنا کھائے پیے، پہنے اوڑھے؟ ہر آنے جانے والے سے وہ جس طرح گل بانو کا ذکر لے کر بیٹھ جاتی، اس سے سبھی کا تعارف گل بانو سے ہو گیا تھا۔

'عزیز، تم لوگوں کے لئے پیر اولیا ہو تو پھر میری بیٹی کے لئے بھی ایک تعویذ لکھ دو۔' ایک دن تنگ آکر پختون الجھ پڑی۔

'یہ سب دوسروں کے لئے ہے۔ اسی میں برکت ہے۔' دھیرے سے ڈنگروال نے جواب دیا۔

'ایسی برکت سے کیا فائدہ جب اپنی اولاد اپنے پاس نہ ہو۔' پختون نے روتے ہوئے کہا۔

'سب کچھ بھول جاؤ۔ اس دنیا میں کوئی کسی کی اولاد نہیں۔ سب خدا کے بندے ہیں۔ اپنی راہ خود چنتے

ہیں۔ ڈنگر وال نے دھیرے سے کہا۔

'مجھے پتہ تھا تمہارے پاس میرے دکھوں کی کوئی دوا نہیں ہے۔' پختون غم اور غصے میں پھوٹ پڑی۔

گرم ابلتے موم میں پکتے کپڑے کو نکال کر پختون نے سامنے الگنی پر ڈالا اور ڈبے میں مڑی تعویذوں کو موم جامہ میں سلنے لگی۔ جانے کیسے اس نے ایک تہہ کیا کاغذ یکایک کھول لیا۔ اس پر کاغذی بادام کی تصویر دیکھ کر وہ دنگ رہ گئی۔ بڑبڑاتی ہوئی اٹھی کہ عزیز سے پوچھے مگر پھر ٹھہر گئی۔

'کاغذی بادام کے وہ پیڑ ہی تو پشتوں سے ان کی روزی روٹی تھے اور آج بھی وہی...... 'سوچ کر پختون سناٹے میں آگئی اور سوچنے لگی، 'مرادیں پوری کرنے والا تو کوئی اور ہے، یہ تو صرف بہانہ ہے۔'

پختون دھیرے دھیرے خاموش سی ہوتی جا رہی تھی۔ عرصے سے اسے وہ ڈراؤنا خواب بھی نظر نہیں آیا تھا۔ لگتا تھا، جیسے اس کے اندر کا ایک بند دروازہ کھل گیا ہو جہاں صبر، سکون کا دریا ٹھاٹھیں مار رہا ہو۔ جہاں دوسروں کا دکھ اپنا اور اپنا دوسروں میں بٹتا نظر آنے لگتا ہے۔ جہاں زمین بم کے دھماکوں سے یکایک پھٹ جاتی ہے، درخت راکھ ہو جاتے ہیں، اپنے دور چلے جاتے ہیں اور گھر بار لٹ جاتے ہیں، اس فانی دنیا میں کس کس کے لئے آنسو بہائے جائیں؟

صبح کا سورج اپنی نارنگی روشنی لئے نمودار ہو رہا تھا۔ پرندوں نے چہچہانا شروع کر دیا۔ عزیز ڈنگر وال ناشتہ کر کے اپنی مسند پر بیٹھ گئے ہیں اور پختون کے ہاتھ جلدی جلدی کام نبٹا رہے ہیں۔

'ابھی مریدوں کی بھیڑ آنے لگے گی۔' کہتی ہوئی پختون تیزی سے تعویذوں کی تھلے دانی اٹھاتی ہے۔ تبھی دروازے پر تیز تھاپ پڑتی ہے۔ دونوں چونک اٹھتے ہیں۔۔ ایسا کون ہے جو اتنی صبح آکر دروازہ پیٹ رہا ہے؟

آگے بڑھ کر پختون نے دروازہ کھولا، سامنے اونچے قد کی جوان لڑکی کو کھڑا پایا۔ دل ہی دل میں پختون نے سوچا: اس نامراد پر کون سا قہر ٹوٹا جو بھری جوانی میں پیر کے پاس مدد لینے آئی؟

وہ لڑکی جس کی آنکھیں کاغذی بادام کی طرح بڑی کھنچی اور کٹاؤدار تھیں، حیرت سے پختون کو تاک رہی تھیں۔ پھر ان میں پانی جمع ہونے لگا۔ آنسوؤں کی بڑی بڑی بوندیں دونوں آنکھوں کے بیچ اس طرح اٹک گئیں جیسے بادام کے ادھ کھلے منہ میں دانہ۔

'کون ہے؟' پیچھے سے ڈنگروال کی آواز سے پختون چونکی۔ اس کے پیٹ میں رحم نے گھومنا شروع کر دیا تھا۔

'ماماں!' کانپتے ہونٹوں سے کسی طرح لڑکی نے کہا۔

'گل...... گل بانو۔' پختون پھسپھسائی اور سینے سے آ لگی لڑکی کو زور سے بھینچا، جیسے محبت سے ویران دل کو ایک بار میں شرابور کرنا چاہ رہی ہو۔

عزیز ڈنگروال داڑھی کے بالوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے سمجھ گئے کہ آنے والی پختون کی جاننے والی ہے۔ وہ سر جھکا کر بیٹھ گئے۔ آنکھیں بند کر لیں۔ گل بانو اندر آئی باپ کو ڈھونڈتی۔ اس کی آنکھوں میں تیرتے سوال کر دیکھ کر پختون دھیرے سے بولی — 'یہ تیرے بابا ہیں گل......'

گل بانو جھجکی...... داڑھی، شانوں پر پھیلے بال، بند آنکھیں اور...... پھر لپک کر باپ کے سینے سے جا لگی۔

اس کا یہ برتاؤ دیکھ اپنے میں کھوئے عزیز چونکے۔ اس لڑکی کے لمس میں ایسا کیا ہے جو میرے وجود کا درخت ہل گیا؟

'عزیز، یہ تمہارے پاس مراد لے کر نہیں آئی ہے، یہ تو ہمارے دل کی مراد بیٹی گل ہے۔' پختون نے جیسے عزیز کے جمود کو جھنجھوڑا۔

'گل...... کون؟' عزیز نے جیسے ماضی کو آواز دی ہو۔ پھر بیٹی کو دیکھا، دھیرے سے ہونٹ ہلے اور دونوں ہاتھوں میں بیٹی کا چہرہ اٹھا اسے غور سے دیکھا۔ عزیز کی آنکھوں میں پتھریلی کیفیت دھیرے دھیرے کر کے چھٹنے لگی جیسے جے پانی کے تالاب میں یکایک ڈھیروں مچھلیاں ایک ساتھ تیرنے لگ جائیں۔ پختون کو اتنے سالوں بعد عزیز زندہ انسان لگا۔

'بابا...... 'اتنا ہی کہا گیا گل بانو سے، مگر اس آواز میں اتنی گہری پکار تھی کہ پختون اور عزیز کی سوکھی آنکھیں برسنے لگیں۔

'بابا...... مجھے کیوں چھوڑ آئے تھے اکیلا...... بولو بابا؟'گل کی آواز جانے کس اندھے کنویں سے ماں باپ کو پکار رہی تھی۔

ڈنگروال کو لگا کہ کوئی ان کی چھاتی پر تیز خنجر بیدردی سے مار رہا ہے۔ وہ خون کو پیتے ہوئے اپنی جگہ سے اٹھے اور آسمان کی طرف نگاہ اٹھا کر بولے —'رب! تیرا شکر!'

پختون نے ناشتے کی سینی سجائی، چائے پیالوں میں ڈالی اور بیٹی کو اپنے ہاتھ سے نوالے بنا کر کھلانے لگی۔

ادھر عزیز مریدوں سے گھرے تھے۔ ان کے چہرے پر آج ایسی روشنی تھی جو پہلے کبھی مریدوں نے نہیں دیکھی تھی۔ ان کے برتاؤ میں ہمدردی کی جو شدت آج تھی، اس گرمی کو انہوں نے پہلے کبھی محسوس نہیں کیا تھا۔

پختون اور عزیز نے جی بھر کر بیٹی کو دلارا مگر بہت چاہ کر بھی کوئی سوال زبان سے نہیں نکالا، جبکہ دونوں کا یہ حال تھا کہ وہ بیٹی سے جلد سے جلد داستاں سن لینا چاہتے تھے۔

دوپہر کے کھانے کے بعد جب تینوں لیٹے تو گل کچھ اداس لگی۔ چپ چاپ لیٹی کچھ سوچتی رہی، پھر اس کی آنکھیں بھر آئیں۔

'کیا بات ہے گل؟'پختون نے بیٹی کے کندھے پر دھیرے سے ہاتھ رکھا۔

'وہاں سب مجھے ڈھونڈ رہے ہوں گے ماں...... 'گل نے ڈری سہمی آواز سے کہا۔

پختون اور عزیز اٹھ کر بیٹھ گئے اور اس طرح گل کو تاکنے لگے جیسے سمجھنا چاہ رہے ہوں کہ اب وہ کیا کہیں؟

'اس وقت شوکت گھر لوٹتا ہے۔ اسے میرے ہاتھ کا پکا دوپیازہ بہت پسند ہے اور شمیم کو حلوہ...... پورے گھر کی ذمہ داری مجھ پر تھی اور...... بہت کام تھا، مگر آپ دونوں بہت یاد آتے تھے۔'اپنے کو

سنبھالتی سی گل بانو بولی۔

دونوں کے دل میں ایک خوف نے پھن پھیلایا: کیا گل واپس جانا چاہتی ہے، مگر بولا کوئی کچھ نہیں۔

'یہاں پہنچنے میں تکلیف تو نہیں ہوئی؟' آخر عزیز نے خاموشی توڑی۔

'ڈر لگا تھا بابا...... ان سب کی یاد بھی آئی تھی۔ دل چاہا تھا کہ لوٹ جاؤں، مگر......' اٹھ کر بیٹھ گئی گل اور گھٹنوں پر ٹھڈی رکھ لی۔

'کیا سوچ رہی ہے بیٹی؟' دھیرے سے سہلایا پختون نے بیٹی کے سر کو۔

'وہاں سب پریشان ہوں گے میرے لئے......' پھر کچھ دیر چپ رہنے کے بعد بولی — 'ایک بار میں سخت بیمار پڑ گئی تھی، تو سبھی نے میری دیکھ بھال کی تھی۔ شوکت اور شمیم نے کچھ نہیں کھایا۔ مگر جب میں گھر لوٹنے کی ضد کرتی روتی تو وہ صرف ایک جواب دیتے، 'اب یہی تیرا گھر ہے بیٹی، ہم ہی تیرے ماں باپ ہیں' ...... یہ جواب سن کر میں ان سے غصہ ہو جاتی اور اپنے گھر لوٹنے کو زیادہ بیقرار۔ پھر آپ دونوں سے روٹھ جاتی کہ مجھے اس طرح اکیلا کیوں چھوڑا...... کیوں چھوڑا۔'

'کیا انہیں بتا کر نہیں آئی بیٹی؟ آخر وہ تیرے......' عزیز نے تشویش آمیز آواز میں پوچھا۔

'نہیں...... وہ میرا گھر نہیں تھا۔ مجھے وہاں نہیں رہنا تھا۔' دھیرے سے گل بانو بولی۔ اس کے چہرے پر پھیلی یادیں پیچھے چھٹک گئیں اور ان پر فیصلے کا ایک نیا رنگ چڑھ گیا۔ وہ دل ہی دل میں سوچنے لگی کہ 'اگر وہ میرا گھر ہوتا تو وہ میری کہانی دوسروں کے سامنے کبھی نہ دہراتے......' دھیرے سے جیسے اپنے سے کہا ہو گل نے۔

پھر تینوں چپ ہو گئے۔ اپنی اپنی جگہ بیٹھے رہ گئے۔

'ان کا قرض تو اتارنے ہمیں جانا ہو گا ایک بار۔' دھیرے سے پختون نے کہا۔

'بے شک!' عزیز نے جیسے اپنے سے کہا ہو۔

'جانے بابا، اس دن کہاں سے ہمت آ گئی مجھ میں، پیر کے دن جو دکان سے سامان لینے گئی تو ایک

عورت کو دکاندار سے کہتے سنا کہ مجھے پیشاور جانا ہے، سامان جلد پیک کر دو۔ بس، میرے منہ سے بھی نکل پڑا کہ مجھے بھی جانا ہے، آپ اپنے ساتھ مجھے بھی لے لیں، میں اکیلی جا رہی ہوں..." وہ پہلے جھجکی اور پھر راضی ہو گئی اور بابا...... میں آ گئی...... سب کچھ چھوڑ کر......" کہہ کر گل بانو پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ اس کی رلائی میں اپنے اس گھر کی کھٹی میٹھی یادیں تیر رہی تھیں یا اپنے اس گھر لوٹنے کی خوشی یا ماں باپ سے بے وجہ جدائی کا شکوہ گونج رہا تھا — کچھ نہ سمجھ پائے وہ دونوں، سوائے اس کے کہ آنکھوں میں بندھے باندھ کو کھل کر آج بہہ جانے دو۔ اسی کے بعد فضا صاف ہو گی۔

رات آئی، آسمان پر پورا چاند دمکا، دھیمی دھیمی ہوا بہنے لگی۔ تینوں نے کھانا کھایا اور پلنگ پر لیٹ گئے۔ سچ پوچھا جائے تو یہ رات ایک خوبصورت خواب بن کر اس گھر کے آنگن میں اتری۔ بیٹی گھر لوٹی تو انہیں اپنے گھر کی شدت سے یاد آئی۔

عزیز اور پختون نے اس رات ایک ہی خواب دیکھا کہ پورا ملک پھر سے پھلوں کے درختوں سے بھر گیا ہے۔ کاغذی بادام کے سفید گلابی پھول درختوں کی شاخوں پر لدے ہیں۔ گھر گھر پالنوں میں نوزائیدہ بچے کلکاری مار رہے ہیں اور عزیز ہاتھ میں ڈفلی لئے تیز قدموں سے تھئی ناچ رہا ہے۔ ناچنے کے ساتھ اس کی درد بھری گانے کی آواز ہندوکش پہاڑ پر جمی برف کو پگھلا رہی ہے۔ بہار کا موسم ہے اور لوٹتے قافلوں کی قطاریں میدانوں سے اوپر پہاڑ کی طرف چڑھ رہی ہیں، جہاں قدرت نے درختوں کی شاخوں پر نئے اکھوئے پھوڑے ہیں۔

موم جامہ

'یہ بھی کوئی وقت ہے بچے کی پیدائش کا؟' بدیع نے پریشان آنکھوں سے زبیہ کو دیکھا اور شرم سے گردن جھکالی۔

'تم کیوں اپنے کو مجرم سمجھ رہے ہو! خدا کو شاید یہی منظور تھا۔' زبیہ نے تیزی سے لڑھکتے آنسوؤں کو پونچھتے ہوئے کہا۔

'ہاتھ تنگ، وطن سے دور، ہم خود سر کے اوپر چھت تلاش کر رہے ہیں، اوپر سے یہ نئی پریشانی۔ ایسی حالت میں کیسے آنکھیں ملا پاؤں گا میں دوسروں سے؟ کون یقین کرے گا کہ ہم بچہ نہیں چاہتے تھے، بلکہ یہ محض ایک اتفاق ہے۔' بدیع نے ماتھے پر چھلک آئے پسینے کو پونچھا اور زبیہ کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔

زبیہ نڈھال سی بدیع کے سینے سے جالگی اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

'اب کچھ نہیں ہو سکتا بدیع، یہ چوتھا مہینہ ہے۔ پریشانی میں مجھے کچھ یاد نہیں رہا، ورنہ یہ مصیبت ٹل سکتی تھی۔' ہچکیوں کے بیچ زبیہ نے بڑے مجرمانہ لہجے میں کہا۔

'اب جو ہے اسے مصیبت مت کہو، شاید تمہارے رات دن کی تڑپ دیکھ کر خدا نے ہمیں یہ تحفہ دیا ہو۔ اس لئے غم نہ کرو۔ ہو سکتا ہے، اس کا آنا ہمارے لئے مبارک ثابت ہو۔' بدیع نے امید بھری آواز سے کہا، مگر اس کا دل فکر کے بوجھ تلے ڈوب گیا تھا۔

'پتہ نہیں...... کہہ کر زبیہ زمین پر پھیلی توشک پر لیٹ گئی۔

شام ڈھل رہی تھی۔ کمرے میں اندھیرا گھس آیا تھا۔ دونوں میاں بیوی ایک دوسرے کو تسلی دیتے دیتے سو گئے۔ بدیع لبنان سے انجینئر بننے اور زبیہ شام سے ڈاکٹر بننے ہندوستان آئی تھی۔ دونوں کی

ملاقات علی گڑھ جیسے چھوٹے سے شہر میں، جہاں یونی ورسٹی کا اپنا ایک دائرہ تھا، بار بار ہوتی تھی۔ ایک دن کسی پروفیسر کے گھر تھوڑی بہت بات چیت ہوئی اور اس کے بعد سیاست پر ایسی بحث ہوئی کہ دونوں ایک دوسرے کے ملکوں کے لیڈران کی کھل کر تنقید کرنے لگے۔ اس کڑوی بحث کے بعد جب تب ملاقات ہونے پر وہ ایک دوسرے کا استقبال طنز بھری مسکراہٹ سے کرتے تھے۔ ایک وقت ایسا آیا کہ اس مسکراہٹ میں طنز کی جگہ مٹھاس ابھرنے لگی اور بدیع نے ایک دن کہہ دیا— 'میرا وطن تمہارا وطن نہیں بن سکتا کیا؟'

'ناممکن ہے۔ تمہارا وطن کبھی بھی میرا وطن نہیں بن سکتا، کیوں کہ ہم دونوں کی اپنی الگ الگ پہچان ہے۔' زبیہ نے تمک کر کہا تھا۔

'کوئی بات نہیں، مگر ہم ایک مذہب کے ماننے والے تو ہیں نا! اتنا کافی نہیں ہے ایک دوسرے کو قریب سے جاننے کے لئے؟' بدیع نے زبیہ کی تمک کو اپنی میان میں ڈال لیا۔

'مگر عیسائی اور مسلمان کا فرق ایک ایسا سیاسی بٹوارہ ہے جس کو تاریخی نظر سے بھولا نہیں جاسکتا۔' زبیہ کی تیوریوں پر بل پڑگئے۔

'اتنا پڑھ لکھ کر تم اس طرح سوچتی ہو؟' بدیع کو یکایک ہنسی آگئی۔

'یہ میں نہیں، بلکہ ہمارے ملک میں اٹھے طوفان ہمیں بتا رہے ہیں کہ نسل، زبان ایک ہونے کے باوجود ہم ایک نہیں ہیں۔ ہماری پہچان ہمارے ملک کی حدوں سے ہوتی ہے اس لئے ہم ایک ہیں کی خیالی اڑان آپ جیسے انجینئرنگ پڑھنے والے شاگرد پر کچھ جچتی نہیں ہے۔ مجھے ڈر ہے، کہیں آپ ڈگری لینے کے بعد اسی طرح کے خیالی نقشے کے ذریعہ اپنے ملک میں ہوائی عمارتوں کی بنیاد نہ ڈال بیٹھیں۔' زبیہ نے مذاق اڑایا۔

'ہم انسان ہیں، انسانیت ہمارا مذہب ہے۔ اس کے بارے میں آپ کیا کہیں گی؟' بدیع نے زبیہ کو لاجواب کرنے والے انداز سے کہا۔

'آج کے دور میں انسان کا مذہب انسانیت نہیں سیاست ہے اور یہی آج کی حقیقت ہے جس سے آپ آنکھ نہیں چرا سکتے۔' زبیہ نے بدیع کو بری طرح شکست دے دی۔

'اس چھٹی میں شام جانے کی جگہ لبنان آیئے۔' بدیع نے اسی طرح ہنستے ہوئے کہا، جیسے اس پر زبیہ کی چھینٹا کشی کا کوئی اثر نہ ہوا ہو۔

'اس جنگ کے میدان میں مجھے جا کر کیا کرنا ہے جہاں بمباری کے بعد ایک شہر دوسرے شہر سے اور ایک محلہ دوسرے محلے سے مہینوں کے لئے کٹ جاتا ہے۔ جہاں ایک ملک کے تین حصے ہو گئے ہوں اور اسے مسلمان، عیسائی اور یہودی نے بانٹ لیا ہو۔ اس قید خانے میں جا کر بھلا میں کیا کروں گی؟ وہ تو پورا جہنم ہے جہنم۔' اپنی دھن میں زبیہ کہتی چلی گئی۔

اس کے آخری جملے نے بدیع کے چہرے کی چمک پونچھ ڈالی۔ اس کی گردن تن گئی۔ چہرے پر سختی ابھری اور اس نے گہری نظروں سے پل بھر زبیہ کو گھورا، پھر بغیر کچھ بولے آگے بڑھ گیا۔

اس حادثہ کے بعد زبیہ چین سے نہ رہ سکی۔ زنانہ غرور اجازت نہیں دے رہا تھا کہ وہ بدیع کے پاس جا کر اپنے لگائے زخم پر مرہم رکھے اور اس کے وطن کو اپنا آدھا وطن ماننے کا اقرار کرے۔ اسی ادھیڑ بن میں کئی ماہ گزر گئے۔ پھر امتحان کی تیاری میں زبیہ ایسی ڈوبی کہ اسے کچھ ہوش نہ رہا اور لمبے عرصے تک دونوں کا ملنا نہ ہو سکا۔ گرمی کی چھٹیوں میں زبیہ شام چلی گئی۔ گھر کا نقشہ بدلا ہوا تھا۔ بھائی اور باپ کو جیل میں ڈال دیا گیا تھا۔ ماں اور چھوٹی بہن اس غم میں بری طرح ٹوٹ چکی تھیں۔ اس کو یقین نہیں آیا کہ یہ گھر اس کا ہے جہاں اب غم کے سائے جھک آئے تھے۔ جس پر اب کوئی چڑیا خوشی کا گانا نہیں گاتی تھی۔

ماں کے بہت سمجھانے پر وہ اس امید کے ساتھ علی گڑھ لوٹی کہ دو برس بعد جب ڈاکٹر بن جائے گی تو حالات کا مقابلہ کر سکے گی اور چھوٹی بہن اور ماں کی دیکھ بھال کسی مرد کی طرح کرے گی۔ علی گڑھ لوٹ کر زبیہ کا دل پڑھنے میں نہیں لگتا تھا۔ گھر کا دہشت زدہ ماحول اور ماں بہن کی اداس صورتیں اسے یاد آتیں۔ رات کے ڈھلنے کے ساتھ جب فلسطینی لڑکے گٹار پر کوئی دھن نکالتے یا شام کو ایرانی لڑکے موٹر سائیکلوں پر بیٹھے فراٹے بھرتے گزر جاتے اس وقت وہ کتاب پٹک کر بڑبڑاتی کہ کیسے لوفر ہیں یہ لڑکے جو سیاست کے غم کو آوارگی کی شکل میں مناتے ہیں۔ مگر آج فلسطینی طلباء کے گٹار سے نکلے سروں میں اس کا غم شامل ہو گیا تھا۔ فراٹے بھرتی موٹر سائیکلوں کو اور تیز دوڑانے کا

اس کا دل چاہ رہا تھا۔ اسی اندر کی بے کلی نے ایک دن بدیع سے یہ کہنے پر مجبور کر دیا کہ کل تک میں آپ کے ملک کو جہنم کہتی تھی۔ کیا پتہ تھا کہ آج میری زندگی جہنم بن جائے گی۔

سال بھر بعد زبیبہ کی ماں اور بہن کو بھی پکڑ لیا گیا اور زبیبہ کے لئے شام کے دروازے ہمیشہ کے لئے بند ہو گئے۔ سفارت خانہ نے اس کو جب ملک لوٹنے پر مجبور کیا تو اپنے اتنے نزدیک موت دیکھ کر اس نے ریفیوجی بن جانا بہتر سمجھا۔ وظیفہ کی چھوٹی سی رقم اس کو سخت حقیقت کے نزدیک لے آئی اور اسے محسوس ہونے لگا کہ اب باقی زندگی اس کو اپنی ذمہ داری پر جینا ہوگا، کیونکہ سیاسی مجرم موت کے منہ سے واپس نہیں لوٹتے اور نہ ان کے رشتے داروں کو معاف کیا جاتا ہے۔

بدیع اور زبیبہ دوسرے کئی طلباء کی طرح ڈگریاں لے کر بیکار سے ٹہل رہے تھے۔ بدیع کو لوٹنے کے لئے لبنان میں جاری جنگ موقع نہیں دے رہی تھی مگر اس کو روپے کسی نہ کسی شکل میں گھر سے برابر مل رہے تھے۔ نوکری کو لے کر ایک سہانا خواب بدیع کے دماغ میں موجود تھا۔ بس، لبنان لوٹنے کی دیر تھی۔ اسی درمیان دونوں نے لمبی بیکاری سے تنگ آکر شادی کر لی اور پہلی بچی جب دو برس کی ہوئی تو ان کو لبنان لوٹنے کا موقع ملا۔

پوتی وفورہ کو پاکر بدیع کے ماں باپ پھولے نہیں سما رہے تھے۔ کویت سے بدیع کا بڑا بھائی بھی مع خاندان کے لبنان چلا آیا اور گھر خوشیوں سے بھر اٹھا۔ بدیع کی نوکری کی بات طے ہو گئی۔ بھائی نے کسی غیر ملکی فرم میں اس کے لئے بات طے کر رکھی تھی۔

رات گئے تک باتوں کا دور چلتا رہا۔ بدیع کو نیند نہیں آئی۔ سوتے گھر میں جاگتا بدیع ایک عجیب خوشی سے بھرا اپنے نئے گھر، نئی نوکری کے بارے میں سوچتا رہا۔ پو پھٹتے ہی وہ کمرے سے نکل کر گلی میں آیا جہاں بھائی کی لمبی سی سرخ نئی کار کھڑی تھی۔ جس کو دیکھ کر بدیع نے سوچا، وہ بھی اسی ماڈل کی کار لے گا اور......

'یہ کیا؟' بدیع کہتا ہوا آگے بڑھا اور شیشوں پر چپکے اسٹیکروں کو اکھاڑنے لگا اور منہ ہی منہ سے چپکانے والے کو گالی بھی سناتا جا رہا تھا۔ بدیع اس بات سے بالکل بے خبر تھا کہ ایران کے جس لیڈر کی تصویر کو وہ پھاڑ رہا ہے، اسی کا اسلامی انقلاب لبنان کی گلی کوچوں میں رگوں میں دوڑتے خون کی

طرح پھیل چکا ہے۔

بدیع کو جیل سے چھڑانے میں باپ نے اپنی زندگی بھر کی جمع پونجی رشوت دینے میں خرچ کردی اور راتوں رات دونوں کو دوبارہ ہندوستان بھیج دیا گیا۔ بنی وفورہ دادا دادی کے پاس رہ گئی، کیونکہ ان سب کا خیال تھا کہ اگر کسی طرح کی پریشانی ان دونوں کو پیش آئی تو بچی کے ساتھ اس کو جھیلنا بہت مشکل ہوگا۔

دونوں جعلی پاسپورٹ پر دہلی پہنچ گئے تھے۔ اس بار زبیہ کے ساتھ بدیع بھی ریفیوجی وظیفے کے لئے اقوام متحدہ کے دفتر کے سامنے کھڑا تھا۔ علی گڑھ لوٹنے کا کوئی معنی نہیں رہ گیا تھا۔ اتنے کم پیسوں میں کرائے کا کمرا تو دور، پورے مہینے پیٹ بھر کھانا ممکن نہیں تھا۔ بدیع نے نوکری تلاش کرنی شروع کردی تھی۔ گھر سے کسی طرح روپیہ پانچ چھ مہینے بعد پہنچتا تو وہ قرضداروں کو دینے میں ختم ہو جاتا۔ انجینئرنگ اور ڈاکٹر کی ڈگری لے کر بھی وہ دونوں بیکار بیٹھے کبھی تاش کھیلتے، کبھی سڑکوں پر آوارہ گھومتے اور کبھی خالی پیٹ کو قہوہ پی پی کر بھرتے تھے۔ دونوں لبنان لوٹنے کے لئے ہر لمحہ بےچین تھے، مگر لبنان ان سے مہینوں اور برسوں کی رفتار سے دور ہوتا چلا گیا اور لڑکی کی جدائی میں آنسو بہاتے ہوئے انہوں نے پورے چھ برس گزار دیئے۔

اس دوران خاندان کے ایک دوست کی ایمبیسی میں تقرری کے سبب بدیع کو بھی ایک معمولی سی نوکری وہاں مل گئی جس سے ان کی زندگی سہل ہونے لگی اور انہیں محسوس ہونے لگا کہ وہ بھی زندہ ہیں اور کچھ کر سکتے ہیں۔ ان میں زنگ نہیں لگا ہے۔ ان کے پاس بھی کام کرنے کو ہے۔ اس خوشی کو ملے ابھی پانچ چھ مہینے ہی گزرے تھے کہ نیا سفیر آیا اور آنے کے کچھ دنوں بعد اس نے عرب ملازمین کی جگہ پر عیسائیوں کی تقرری شروع کردی اور اس چھٹنی میں بدیع کا نمبر پہلا تھا۔ بدیع کو محسوس ہوا، عیسائیوں اور مسلمانوں کے درمیان ہونے والی لڑائی لبنان کی حدوں کو توڑ کر اب ہندوستان میں بھی لڑی جانی لگی ہے۔ ایمبیسی کی چہار دیواری میں اسکوٹر گیراج کے نام سے پتلا کمرا، جس میں وہ دونوں رہ رہے تھے، اس کو فوراً چھوڑنے کا حکم ملا اور ایک بار پھر وہ کھلے آسمان کے نیچے سڑک کے کنارے کھڑے تھے۔

گھر کے سامان کو بیچ کر کرائے پر کمرا لیا گیا اور زمین پر بستر ڈال کر دونوں سر جوڑ کر یہی سوچتے رہے

کہ ایک طرف گھر اور خاندان، دوسری طرف یہ صحرانوردی؟ اتفاق سے کچھ دنوں پہلے بھائی کے بھیجے روپیوں کے ساتھ یہ پیغام بھی ملا کہ وہ بدیع کا کیس سنبھال رہا ہے۔ امید ہے، جلد ہی وہ ٹکٹ کا انتظام کرے گا۔ خبروں میں گھماسان جنگ کی خبریں ملنے لگیں اور اس طرح سے بھائی کے پیغام کو بھی آج دو ماہ گزر گئے۔ پیسہ ختم ہونے لگا اور ایک دن جب زبیہ یکایک بیمار پڑ گئی تو ڈاکٹر نے نئے مہمان کے آنے کی خبر دی جس نے دونوں کو سر سے پیر تک ہلا دیا۔ اس سے نجات پانے کے سارے راستے بھی بند تھے۔ انچاہا بچہ ایک گناہ کا احساس دے رہا تھا، جس کے بوجھ سے دونوں دب سے گئے تھے۔ گھر والے سن کر کیا کہیں گے؟ اس شرم سے دونوں کا برا حال تھا۔

زبیہ نے تھک کر ان سارے ملکوں میں جانے کی کوشش کرنی شروع کر دی، جہاں پر وہ دونوں ڈاکٹر، انجینئر نہ سہی کوئی دوسرا کام تو کر سکتے تھے۔ اس نے اپنا من لبنان سے کاٹنا شروع کر دیا تھا۔ جب اپنا ملک نہ سہی تو پھر پیٹ کی خاطر کسی بھی مغربی ملک میں زندگی گزار لیں گے، بیٹی کو بھی وہیں بلا لیں گے، یہ سب سوچ کر اس نے بدیع کو بھی سمجھانا شروع کر دیا۔ مگر بدیع لبنان جانے میں ہی دونوں کی بھلائی دیکھ رہا تھا۔ ادھر خاندان کے لوگ زبیہ کی حالت سے فکرمند تھے۔ راستے بند ہونے کے باوجود کسی نہ کسی طرح وہ دوسرے ملکوں میں رہ رہے لبنانی دوستوں سے بیٹی وفورہ کی خیریت اور روپئے بھیجنے کی برابر کوشش کرتے جس سے بدیع اور زبیہ مالی طور سے کچھ دنوں کے لئے سنبھل گئے تھے۔

کویتی ایرلائنس میں دونوں کے ٹکٹ پہنچ گئے اور بھائی نے جیسے تیسے سارا انتظام کر دیا۔ لڑکی کو دیکھنے کی تمنا میں زبیہ نے بیٹی کے لئے ڈھیروں کپڑے خریدے۔ ساس سسر کے لئے سوغاتیں لیں اور سامان باندھ کر ہوائی اڈے پر پہنچ گئے۔ خوشی کے مارے زبیہ کی ہنسی رک نہیں رہی تھی اور بدیع بڑے پھرتیلے انداز سے سامان لے کر آگے بڑھ رہا تھا۔ ان کی باری جب آئی تو انہیں روک لیا گیا اور جب پوچھنے پر زبیہ نے بتایا کہ اس کا ساتواں مہینہ ختم ہو رہا ہے تو ایرلائنس والوں نے صاف انکار کر دیا۔ خوشامد، آنسو، جھوٹ، غصہ، بحث کچھ بھی کام نہیں آیا۔ لٹے لٹے سے دونوں پھر سڑک کے کنارے کھڑے تھے۔ پاس میں نہ پیسے تھے، نہ کمرا، نہ سامان اور ان سوغاتوں کو وہ کھا نہیں سکتے تھے۔

زبیہ اور بدیع نے ایک بار پھر زندگی کو جوڑا اور رہنا شروع کیا۔ اس بار ان کے غم میں دوسرے

ملکوں کے ریفیوجی بھی شامل تھے۔ کمرا، سامان، اسپتال کا خرچ اور بیٹے کی پیدائش تک کا سارا خرچ دوسروں نے اٹھایا اور بدیع سر سے پیر تک قرض میں ڈوب گیا۔ کویت سے بھائی کبھی کبھی ٹیلیفون پر بات کر تا تھا۔ وہ سلسلہ بھی ختم ہوگیا۔ خبروں سے احساس ہو رہا تھا کہ جنگ ایک بار پھر خطرناک شکل اختیار کر چکی ہے اور اس کا شہر یا محلّہ ضرور ایک جزیرہ بن گیا ہو گا جہاں سے رابطوں کے سارے ذرائع کٹ گئے ہوں گے۔

نئے بچے نے دنیا میں آکر ان کی زندگی ضرور بدل دی تھی۔ ایک انجان خوشی اس کو دیکھ کر ان دونوں کی رگوں میں دوڑنے لگتی تھی۔ اس کے بڑے ہونے کے ساتھ ساتھ بدیع کا ذہنی تناؤ بڑھ رہا تھا۔ ایک باپ کا فرض اس کے سامنے کھڑا ہو کر اس سے پوچھتا کہ بیٹا تو تم نے پیدا کر لیا مگر اس کا مستقبل کیسے سنوارو گے؟ تم تو پڑھ لکھ کر بیکار ہو، پھر اس کو کیسے پڑھاؤ گے؟

بدیع عرب لڑکوں کے ٹیوشن کر کے گرہستی کی گاڑی تو چلا رہا تھا، مگر اسے یہ بات کچوٹنے لگی تھی کہ یہ سب کتنے دن اور کھینچے گا۔ کسی دوسرے ملک میں جا کر بھی کیا ملے گا؟ جانا تو اپنے ہی ملک ہے، چاہے وہ جیسا ہو، کم سے کم دکھ سکھ، موت زندگی کو مل کر تو بانٹیں گے۔

لبنان کے لئے ہوائی اڑانیں کھلنے لگیں مگر بدیع کے پاس کرائے کے پیسے نہیں تھے، پھر قرض داروں کو بغیر ان کا قرض چکائے وہ کیسے جا سکتا ہے۔ بھائی سے کوئی رابطہ بن نہیں پایا۔ گھر سے کوئی خط نہیں آیا۔ پہلے کی طرح اس علاقے سے کوئی مسافر بھی نہیں آیا جو زبانی اس کے گھر خاندان کی خبریں دیتا۔ ویران اور مایوس دن بدرنگ سے گزر رہے تھے۔ ان دونوں میں تنہائی کا احساس کسی ریگستان کی طرح اپنی بانہیں پھیلا رہا تھا۔

بدیع اور زبیبہ کو ہندوستان میں رہتے ہوئے پورے دس سال گزر گئے تھے۔ دھیرے دھیرے کر کے ان کے رہن سہن اور خورد و نوش پر ہندوستانی ذائقے کا رنگ چڑھنے لگا تھا۔ دال چپاتی ان کی پسندیدہ خوراک بن چکی تھی۔ وہ کس طرح دل و دماغ سے بٹ رہے تھے، انہیں اس کا ذرا بھی احساس نہیں تھا۔ اوپری طور سے جو بات انہیں کھائے جا رہی تھی وہ یہ تھی کہ کب وہ ریفیوجی زندگی کو چھوڑ کر اپنے ملک میں رہیں گے۔ ان کی سوچ اسی ایک نکتے پر مرکوز ہو چکی تھی۔ اس لئے پیٹ کاٹ کر بدیع واپسی کے ٹکٹ کا پیسہ جوڑ رہا تھا۔ اس کے برعکس زبیبہ شام اور لبنان سے کٹ کر کسی دوسرے

ملک کی طرف اڑنا چاہتی تھی جہاں اس کا خاندان محفوظ رہے۔ اس طرح دونوں شوہر بیوی اپنی اپنی سمت کی طرف کوشاں تھے۔

ٹکٹ خریدنے سے پہلے یہ بحث لڑائی میں بدل گئی کہ لبنان کے لئے ٹکٹ خرید کر رکھنے کی ضرورت کیا ہے۔ زبیہ کا کہنا تھا کہ روپئے بینک میں رہیں۔ اگر کسی بھی مغربی ملک میں جانے کی سہولت مل گئی تو ٹکٹ وہاں کا خریدا جائے۔ اس کا کہنا یہ بھی تھا کہ ان ملکوں کی طرف جاکر بچوں کی تعلیم بھی ہوتی رہے گی اور وہ دونوں بھی اپنے اپنے علاقے میں آگے کچھ کر پائیں گے۔ زبیہ کے پاس واضح جواز تھا۔ بدیع نے ہار مان لی اور گھر خط بھیجا کہ بیٹی کو اگر وہ لوگ ہندوستان کی طرف بھیج سکیں تو اچھا رہے گا ورنہ کسی دوسرے ملک کی جانب انہیں جانا پڑ گیا تو بیٹی کو وہاں بھیجا جا سکتا ہے۔ زبیہ خط کے جواب کو پانے کے لئے اتنی بے چین ہوا تھتی کہ اٹیچی کھول کر وفورہ کے کپڑے پھر سے تہہ کر کے سجانے لگتی۔ دو سال پہلے خریدے کپڑے بیٹی کو چھوٹے ہوں گے، یہ فکر اسے نہیں ستاتی تھی، بلکہ اس کی دلچسپی یہ تھی کہ جلد بیٹی ملے اور اس کے سامنے یہ سامان کھول کر رکھ دے۔ اس کے سسر نے تین سال پہلے لکھا تھا کہ وفورہ سوتے میں تم لوگوں سے باتیں کرتی ہے اور جاگتے میں کبھی کبھی اس پر غصے کا ایسا دورہ پڑتا ہے کہ وہ بغیر رکے بولتی جاتی ہے۔ اس لئے ڈاکٹروں کا کہنا ہے کہ اس کی ذہنی کیفیت کے توازن کے لئے ماں باپ کے ساتھ رہنا ضروری ہے۔

چھ ماہ گزر گئے مگر جواب نہیں آیا۔ نہ بھائی کا کوئی فون۔ بدیع اور زبیہ کے لئے اب صبر کرنا مشکل تھا۔ مغربی ملکوں کا ویزا ملا نہیں تھا اس لئے مجبور ہو کر دونوں لبنان لوٹنے کی سوچنے لگے تھے۔ تھکی سی زبیہ بھی اب بیٹی کو گلے لگانے کے لئے تڑپ اٹھتی تھی۔ کئی مہینے جب اور گزر گئے تو تھک ہار کر بدیع نے لبنان جانے کی ٹھان لی۔ دونوں نے سوچا، بہت سوچا اور اس نتیجے پر پہنچے کہ اس پار یا اس پار، موت یا زندگی جو قسمت میں لکھا ہوگا، پورا ہو کر رہے گا۔ بہت وقت گزر گیا ہے۔ بدیع کا معمولی سا جرم بھلایا جا چکا ہوگا۔ وہاں تو روز کچھ نہ کچھ ہوتا ہے۔ اس لئے واپس جانے میں اب کوئی خطرہ نہیں ہوگا۔ قسمت کی بات کہ نیا سفیر، جو بدل کر آیا، وہ عرب مسلمان ضرور تھا مگر ایرانی انقلاب سے نفرت رکھتا تھا۔ مسئلے کا حل ہو گیا۔ بدیع نے اس کو اپنی مشکلات بتائیں اور بھروسہ دلایا کہ وہ میاں بیوی کسی سیاسی جماعت سے نہیں ہیں۔ انہیں ویزا ملا، ٹکٹ خریدے گئے اور لبنان کا ہوائی اڈا کھلتے ہی انہوں نے سیٹیں بک کرا لیں۔ چونکہ اس بار ان کا دل پوری طرح سے لبنان جانے کا بن چکا تھا، اس

لئے وہ بڑے حوصلے سے سامان باندھ رہے تھے۔ جاتے وقت جب آس پاس کے لوگوں کے چہروں پر جدائی کا دکھ دیکھا تو چونک پڑے۔ ہر لمحہ ان کے دکھوں میں برابر کے شریک پڑوسی دوستوں کو وہ گھر جانے کی خوشی میں بھول ہی گئے تھے۔ کتنی یادیں تھیں جو پچھلے دس برسوں میں ان سب سے جڑی ہوئی تھیں۔

ہوائی جہاز پر بیٹھ کر ان دونوں کا دل اور دماغ کئی طرح کی الجھنوں میں الجھ گیا۔ جیسے جیسے لبنان قریب آرہا تھا، ان کے دلوں کی دھڑکنیں تیز ہونے لگیں۔ اس میں خوشی اور خوف دونوں کی ملاوٹ تھی۔ زبیدہ کا دل بھٹک کر شام پہنچ گیا تھا۔ ہندوستان، شام، لبنان کے درمیان گھری زبیدہ جذباتی سطح پر اتنی بھٹک گئی تھی کہ جب جہاز لبنان ہوائی اڈے پر اترنے لگا تو شدت جذبات میں اس نے اپنی پکڑ بدیع کے ہاتھ پر مضبوط کردی۔ بدیع خود اتنا زیادہ ذہنی تناؤ میں تھا کہ اس کو محسوس ہی نہیں ہوا کہ زبیدہ کے لمبے ناخن اس کی کھال میں دھنس رہے ہیں اور خون چھلک آیا ہے۔

کسٹم وغیرہ سے نپٹ کر دونوں نے اطمینان کی سانس لی کہ خیریت سے آخر دونوں پہنچ گئے۔ بدیع کا چہرہ چمک رہا تھا۔ زبیدہ کے چہرے پر بیٹی کو ایک نظر دیکھنے کی بےچینی صاف جھلک رہی تھی۔ ٹیکسی میں بیٹھ کر دونوں کے بیچ باتیں شروع ہوگئیں کہ یکایک آیا انہیں دیکھ کر سارے گھر والے کیسا چونکیں گے اور جوانی کی طرف بڑھتی ان کی بیٹی وفورہ انہیں دیکھ کر کتنا خوش ہوگی۔

ٹیکسی کی تیز رفتار کے ساتھ ان کے چہکنے کی رفتار میں بھی تیزی آرہی تھی۔ بدیع راستہ بتانا بھی بھول گیا۔

'گھر کا نمبر کیا ہے؟' ٹیکسی ڈرائیور نے پوچھا۔

'بس، آگے والی گلی کے موڑ پر ہمارا گھر ہے۔' بدیع نے کہا۔

'اس گلی کے موڑ پر؟' ٹیکسی والے نے تعجب سے پوچھا۔

'ہاں۔' بدیع نے جواب دیا۔

'مگر وہاں تو...... 'ٹیکسی والے نے اتنا کہہ کر بریک لگائی۔

'کیوں کیا بات ہے؟' بدیع نے تعجب سے پوچھا۔

'خود چل کر دیکھ لیں۔' کہتے ہوئے ٹیکسی والے نے ریڈیو پر بجتے گانے کو بند کر دیا۔ بدیع تیزی سے ٹیکسی سے اترا اور آگے بڑھا تاکہ گھر پہنچ کر سب کو چونکا دے، مگر سامنے صرف کھنڈر تھے۔ ایک نہیں، کئی مکانوں کے ملبے ایک دوسرے کے اوپر پڑے تھے۔ زبیہ تو تقریباً بیہوش سی ہوگئی اور بدیع صرف منہ ہی منہ میں بڑبڑاتا رہا...... نہیں...... نہیں......

'مجھے اجازت دیں۔' ٹیکسی والے نے کافی دیر انتظار کے بعد آگے بڑھ کر کہا۔

'ہاں...... ابھی ٹھہرو۔' بدیع نے چونک کر آنسوؤں کا بڑا سا گھونٹ بھرا اور پیچھے کی طرف لوٹا۔

'کہاں جائیں گے ہم؟' زبیہ نے بیٹے کو سینے سے لگا کر اپنے سے پوچھا۔ اس کی آنکھوں سے موٹے موٹے آنسو گر رہے تھے۔ اس کا سارا بدن کسی اندرونی زلزلے سے کانپ رہا تھا۔

بدیع کو ساری دنیا گھومتی سی لگ رہی تھی۔

ادھر ادھر کے گھروں کی کھڑکیاں کھلنے لگیں۔ دروازوں سے بچے اور بزرگ نکلنے لگے۔ سناٹا پڑی گلی یکایک شور سے نہا گئی۔

'کہاں سے آئے؟ کس سے ملنا تھا؟' ایک ادھیڑ عمر کے مرد نے آگے بڑھ کر پوچھا۔

'چودہ نمبر میں حسن...... 'ابھی بدیع اتنا ہی کہہ پایا تھا کہ اس مرد نے آگے بڑھ کر بدیع کا بازو پکڑ لیا۔

'آپ خوش قسمت ہیں، آپ کے یہاں ایک لڑکا زندہ بچا ہے۔ بم گرنے کے وقت وہ شہر کی طرف گیا ہوا تھا۔ ان پانچوں گھروں میں کوئی نہیں بچا۔ کوئی بھی نہیں۔' اس مرد کی بات کے ساتھ ہی اس حادثہ پر چرچا کرتی ہوئی کئی طرح کی آوازیں ابھرنے لگیں جو دونوں کے کانوں تک نہیں پہنچ رہی تھیں۔ ان کے کانوں میں تو وفورہ کی آواز، ماں باپ کی باتیں اور بھائی بھابھی کے قہقہے گونج رہے تھے۔

اتنے بڑے صدمے سے بدیع کی کمر ٹوٹ چکی تھی۔ اپنا غم چھپا کر وہ زبیدہ کو ہمت بندھانے لگا، جو بار بار بیہوش ہو رہی تھی۔ بدیع نے ٹیکسی والے کو پیسے دیئے۔ اپنا سامان ایک کنارے لگا کر سوتے بچے کو اٹیچی پر لٹا دیا، پھر زبیدہ کو سنبھالا جس کی آنکھوں سے صاف پتہ چل رہا تھا کہ وہ فورہ کی پرچھائی کو پکڑنے کی کوشش میں اس کھنڈر کے ملبے میں بھٹک رہی ہے۔ دھیرے دھیرے کر کے بچوں اور عورتوں کا تجسس خاموش ہو گیا اور بھیڑ چھٹنے لگی۔ اپنے پاس خاموشی سے کھڑے ایک جوان لڑکے سے بدیع نے پوچھا—'جو لڑکا بچا تھا، وہ کہاں ہے؟ کچھ پتہ ہے آپ کو؟'

'مجھے یہ تو پتہ نہیں، مگر چالیس نمبر میں رہنے والے آپ کو سب کچھ بتا دیں گے۔ ویسے آپ چاہیں تو میرا گھر حاضر ہے۔ وہاں آپ کو کوئی تکلیف نہیں ہو گی۔ حادثے والے دن میں یہاں موجود تھا۔ اس لڑکے احمد کو میں نے ہی دیکھا تھا دروازے کے نیچے دبا ہوا۔' اس لڑکے نے اتنا کہہ کر بدیع کے چہرے کو تاکا۔

'آپ کا شکریہ، ہم مسافر......' اتنا کہتے ہوئے بدیع کا گلا رندھنے لگا۔ اس نے پتھرائی زبیدہ کو دیکھا اور پل بھر میں فیصلہ کر لیا۔ لڑکے نے اٹیچی پر سے سوتے دو برس کے لڑکے کو اٹھایا اور بدیع نے زبیدہ کو سنبھالا۔ ادھر ادھر کھڑے لڑکوں نے بدیع کا سامان اٹھایا اور سامنے والے گھر کی طرف سب چل پڑے۔

پچھلے ڈیڑھ سال سے گھر سے خط یا فون نہ آنے کا سبب دونوں سمجھ چکے تھے۔ اب ان کے آگے اندھیرا ہی اندھیرا تھا۔ اسی اندھی گلی میں انہیں اپنا راستہ ڈھونڈنا تھا۔

دو دن کیسے نیم بیہوشی میں گزرے اس کا پتہ زبیدہ اور بدیع کو نہیں چلا۔ تیسرے دن جب طبیعت کچھ سنبھلی تو بدیع بھتیجے کے بارے میں جاننے کے لئے چالیس نمبر کی طرف چل پڑا۔ وہاں جا کر پتہ چلا کہ عباس کو ایک سال تک اپنے پاس رکھنے کے بعد جب کوئی لینے یا پوچھنے نہیں آیا تو مجبوراً فوجی ٹریننگ میں بھیجنا پڑا۔ اس کے بعد پھر کوئی اطلاع نہیں ملی کہ وہ کس فوجی دستے میں کہاں پر لڑ رہا ہے۔ یہ سن کر بدیع کی آخری امید کی شمع بھی بجھ گئی۔

کئی دن روتے گزر گئے۔ جب بدیع کو اپنی بدحالی پر یقین ہو گیا تو اس نے اپنی نئی زندگی کے بارے

میں سوچا، جس میں اس کی بیوی اور بیٹا تھے۔ زبیہ کا شامی ہونا دوسروں سے چھپایا اور زبیہ کو بھی سمجھایا کہ وہ اپنا عیسائی ہونا کسی سے نہ کہے۔ جب ہم کسی سیاسی جماعت سے نہیں ہیں تو پھر ہم کو سیاست سے کچھ ملنا ہی نہیں ہے۔ پچھلا سب کچھ بھول کر اب آگے کی سوچنی ہے۔ اچھا کام ملنے سے رہا۔ اس لئے پیٹ بھرنے کے لئے جیسا کام ملے گا کرنا پڑے گا۔ دونوں نے آپس میں بیٹھ کر نئی زندگی کا خاکہ کھینچا اور بدیع نے صمد سے کہا— 'اب ہمیں چلنے کی اجازت دیں۔'

'کہاں جائیں گے؟' صمد کی گہری آنکھیں اٹھیں۔

'پتہ نہیں۔ کام بھی تلاش کرنا ہے اور...... ' بدیع کہتے کہتے رک گیا۔

'یہیں ہمارے ساتھ رہ کر کام تلاش کریں، میری بیوہ ماں کی بھی یہی خواہش ہے۔ ہم دو ہی تو ہیں اس بڑے گھر میں۔ آپ لوگوں کے رہنے سے چہل پہل سی ہے۔' صمد نے کہا۔

'سوچتا ہوں، کب تک بوجھ بنوں گا۔' بدیع نے کھوئے انداز سے کہا۔

'ہمسایوں کا بھی کوئی فرض ہوتا ہے۔ آخر پڑوسی کس دن کے لئے ہوتے ہیں؟' صمد ہلکے سے ہنسا۔

بدیع نے اس کے دونوں ہاتھوں کا بوسہ لے کر ان کو اپنی بھیگی آنکھوں سے لگایا۔

'ہمارا گناہ کیا ہے، یہی میں سمجھ نہیں پا رہا ہوں۔ آخر کب اس صحرا نوردی سے آزاد ہو پاؤں گا؟' بدیع نے رندھے گلے سے کہا۔

'سبھی بھٹک رہے ہیں۔ مجھے اپنے بڑے دو بھائیوں کا پتہ نہیں ہے کہ وہ کہاں ہیں؟ قید خانے میں ہیں یا قبر میں ہیں اور...... ' صمد آگے کچھ نہ کہہ سکا۔

'اپنا یہ ملک کتنا بدل گیا ہے۔ پہچان میں ہی نہیں آتا ہے کہ آخر یہاں کون سی زبان اب بولی جانے لگی ہے جو ہماری سمجھ میں نہیں آتی ہے۔' بدیع نے بھاری آواز سے کہا۔

'ایک دن اس سرزمین کی بھی تقدیر بدلے گی اور اس دن تک کا ہمیں انتظار کرنا پڑے گا۔' صمد نے معنی خیز لہجے میں کہا۔

بدیع نے اس کی گہری آنکھوں میں ان کہا پیغام پڑھا اور پھر کمرے میں خاموشی چھا گئی۔

رات ڈھل رہی تھی۔ دونوں کی پیشانی پر پسینہ چھلک آیا تھا۔ ہوا بند تھی۔ آسمان پر نکلا دوج کا چاند کسی تیز نشتر کی طرح ان کے سینوں کو چاک چاک کر رہا تھا۔

شہر کی حالت ٹھیک نہیں تھی۔ ہر طرح کی سیاسی جماعتیں ایک دوسرے کی تلاش میں پھر رہی تھیں۔ اقتدار اور دشمنی کا جنون سروں پر سوار تھا۔ ایسی حالت میں بدیع نے کام کی تلاش کے ساتھ پرانے رشتے داروں کے ذریعہ عباس کا پتہ لگانا بھی شروع کر دیا تھا۔ زبیہ کی خاموشی بھی دھیرے دھیرے کر کے ٹوٹنے لگی تھی۔ اب وہ صمد کی ماں کے ساتھ رسوئی میں ان کا ہاتھ بٹانے لگی تھی۔ پاس پڑوس کے لوگوں نے بھی اپنی کہانی سنا کر زبیہ کے دکھوں کو کافی حد تک کم کر دیا تھا۔ زبیہ کو تسلی سی ہونے لگی تھی کہ اس لبنان میں کوئی ایسا گھر نہیں بچا ہے جہاں اپنوں کی موت کا سایہ منڈلا نہ رہا ہو۔ یہاں زندگی، خاندان اور موت کا مطلب کچھ اور ہے۔

بدیع کو نوکری تو نہیں ملی، مگر ایک چھوٹی سی دکان کھولنے میں ضرور کامیاب ہو گیا، جہاں پر وہ بیٹھے بیٹھے لوگوں کی مشینیں بہت کم دام پر ٹھیک کرنے لگا۔ یہ کونا بھی صمد کے ایک دوست کے والد کی پرچونیا کی دکان کا تھا۔ سامان خریدتے گاہک 'مرمت' کا لگا بورڈ دیکھ کر بدیع سے بات چیت شروع کر دیتے اور اپنے گھر کا پرانا ٹوٹا پھوٹا سامان بھی بدیع سے ٹھیک کرانے پہنچ جاتے تھے۔ دل اور دماغ سے ٹوٹا بدیع اس معمولی کام میں اپنا غم بھولنے سا لگا۔ ڈگریاں اس نے دور پھینک دیں اور انجینئر سے میکنک کے درجے پر اتر آیا۔

جیسے جیسے بدیع اور زبیہ حالات کے مطابق اپنے کو ڈھالنے کی کوشش میں لگے ہوئے تھے ویسے ویسے زندگی ان پر قہقہے لگاتی۔ قسمت ان کی نادانی اور بھولے پن پر دل کھول کر ہنستی۔ اس ہنسی کی تیز گونج اس دن زبیہ کو پہلی بار سنائی پڑی جب کسی پڑوسی سے کوئی اجنبی بدیع کے بارے میں پوچھ رہا تھا۔ نوکری کے لئے دی گئی بدیع کی عرضیاں اور عباس کی تلاش کرنے کی کوششوں نے بدیع کی طرف حکومت اور مختلف سیاسی جماعتوں کی توجہ مبذول کی، خاص کر تب اور جب ہندوستان سے آئے انجینئرنگ کی ڈگری والا جوان مرد خراب سے خراب مشین، چاہے ریڈیو ہو یا کار، پل میں ٹھیک

کر دیتا ہو۔ بدیع کا پچھلا ریکارڈ کھل گیا۔ کچھ بھی راز میں نہ رہا۔ بہت پانی گزر جانے کے بعد بھی تاریخ اسی جگہ پر ٹھہری رہی جہاں پر وقت اسے چھوڑ کر آگے بڑھ گیا تھا۔

'یہاں سے ہم باہر نہیں نکل سکتے ہیں کیا؟' ایک دن زبیہ نے دل کے خوف کو بدیع کے سامنے کھولا۔

'کیوں؟' بدیع نے تھکا چہرہ زبیہ کی طرف گھمایا۔

'مجھے لگتا ہے کہ یہاں رہنے سے ہم زندہ نہیں بچیں گے اور بچ بھی گئے تو موت کا خطرہ ہمیشہ سر پر منڈلاتا رہے گا۔' زبیہ نے کہا۔

'موت نے ہمارے نام نوٹ کر لئے ہیں زبیہ! اس سے اب کیا گھبرانا؟ سرحد پار کرنے میں تو ہمارے لئے اور خطرہ ہے۔ شام بھی ہم جائیں تو وہاں رہیں گے کہاں؟ کیا کریں گے؟ جو پوچھ تاچھ یہاں صرف مجھے لے کر چل رہی ہے وہاں تو تمہارے پورے خاندان کو لے کر چلے گی۔ کیا پتہ ہوائی اڈے پر تمہاری تصویر بھی موجود ہو۔ اس لئے اپنے کو سنبھالو۔ جو سر پر پڑے گی اس کو سہیں گے۔ اپنی قسمت میں لکھی صحرا نوردی کو مٹا تو نہیں سکتے ہیں نا؟' بدیع نے سمجھاتے ہوئے زبیہ سے کہا۔

زبیہ یہ سب سن کر خاموش ہوگئی۔ پھر اس نے دل کا خوف کبھی بدیع کے آگے نہیں رکھا۔ وقت گزرنے لگا۔ زبیہ اوپر سے بھلے خاموش نظر آتی ہو مگر اندر ہی اندر خوف کا لاوا اس کے پورے وجود میں گھمڑ تا رہتا تھا۔ اس اندرونی اشتعال نے اسے زیادہ بےچین بنا دیا تھا۔ ہرنی کی طرح چوکنی اس کی آنکھیں ہر کھٹکے پر چمک اٹھتی تھیں۔

یہ تناؤ کب تک ایک درجۂ حرارت پر ٹکا رہتا۔ دھیرے دھیرے کر کے زبیہ کی رگیں ڈھیلی پڑنے لگیں اور وہ بھرپور نیند سونے لگی۔ اس کے خواب میں زندگی کا وہ حصہ گھوم گھوم کر آتا جو خوشگوار تھا۔ وہ ایک بڑے فوجی افسر کی لاڈلی اولاد، جس کی ہر ضد پوری ہوتی، یہاں تک کہ ہندوستان بھیج کر پڑھنے کی بات بھی باپ نے مان لی تھی۔ دوسرا، زندگی کے موڑ پر بدیع کا پیار، بچوں کی پیدائش۔ ہری بھری سی مست زبیہ خوشی سے جھومتی رہتی تھی۔ آج کی تھکی زبیہ جب کھلے پھول جیسی زبیہ کو خواب میں دیکھ کر اٹھتی تو سارے دن خوش رہتی۔ دکھ پر سکھ فتح پا رہا تھا، چاہے وہ ماضی ہی کیوں نہ ہو، اس لئے یہ تبدیلی دیکھ کر بدیع سوچتا کہ اس کے سمجھانے کا اثر زبیہ پر پڑا ہے۔

کھوکھلی بناوٹی خوشی کے درمیان ایسے لمحے بھی آتے ہیں جب شعور بیدار ہو اٹھتا اور زبیہ کو اپنی موجودہ زندگی کو دیکھ کر تعجب ہوتا کہ یہ وہی ہے جس کے پاس ڈاکٹری کی ڈگری ہے مگر کیسے اپنی ساری پہچان چھپا کر صرف جینے کے لئے ایک بناوٹی زندگی کا ڈرامہ کھیل رہی ہے؟ بکس سے ڈگری نکالتی اور اس کو دیکھتے دیکھتے آنکھیں بھر آتیں۔ پھر خود سے کہتی: آخر میں کتنی بدقسمت ہوں۔ یہ کاغذ کا ٹکڑا میرے پاس ہے مگر جنہوں نے مجھے جنم دیا، ان کی تصویر، ان کی کوئی نشانی پاس نہیں ہے۔ یہاں تک کہ اپنی صحیح پہچان بھی چھپا کر مجھے جینا پڑ رہا ہے۔ بدیع نے تو اپنی زندگی کو ایک معنی دے لیا ہے مگر اس کی اس جدوجہد کا انجام کیا ہوگا؟ کیا وہ اپنے اس بکھراؤ کو کوئی صحیح معنی دے پائے گی؟ یہاں مذہب اس کے پیر کی بیڑی بن گیا ہے اور وہاں نظریات اس کے خاندان کو تباہ کر گئے۔ اس زندگی کے بارے میں سوچنا اب کیا معنی رکھتا ہے جہاں اس کا کچھ نہ بچا ہو؟ نہ گھر نہ ملک۔ اب جو پاس ہے وہی اس کی حقیقت، وہی اس کی زندگی ہے۔

عرصے بعد زبیہ آج خوش تھی۔ گنگناتی ہوئی کھانا پکا رہی تھی۔ بیٹے کو بھی اس نے نہلا کر تیار کر دیا تھا۔ بدیع کے آتے ہی وہ سب صمد کے گھر جائیں گے، یہ سوچ کر اس نے ساری تیاری کر لی تھی۔

رات ڈھلنے لگی مگر بدیع گھر نہیں لوٹا۔ گھبرائی سی زبیہ صمد کی طرف بھی نہ جا سکی، اس خیال سے کہ کہیں کوئی ناخوشگوار واقعہ پیش آیا ہے تو اس کے ساتھ صمد پر بھی مصیبت کا پہاڑ توڑے گی۔ بہتر ہے صبر کرنا۔ یہ سوچ کر زبیہ نے رات آنکھوں ہی آنکھوں میں کاٹ دی۔

دن مہینوں میں بدلے مگر بدیع گھر نہیں لوٹا۔ دکان سے گھر کے راستے کے بیچ اسے کون لے گیا؟ زبیہ کی آنکھیں دروازے پر لگی رہتیں، جانے کب بدیع لوٹ آئے؟ جب کبھی آسمان پر لڑاکو ہوائی جہاز اڑتے، بمباری سے گھر تباہ ہوتے، سیاسی جماعتیں مذہب کے نام پر ایک دوسرے کے لہو کے پیاسے ہو جاتے، ایک محلّہ دوسرے محلے سے جدا ہو جاتا تو اس وقت زبیہ بیٹے کو سینے سے لگا کر سوچتی کہ انجانے میں زبان سے نکلے الفاظ کس طرح زندگی کا سچ بن جاتے ہیں؟

تنہائی میں زبیہ خود سے پوچھتی: میرے جسم کے موم کو پگھلانے والے ہاتھ کیا کبھی واپس آئیں

گے؟ حالات کی اس گردش نے تو میرے دل کو جیسے موم جامے میں بدل دیا ہے، یہی موم جامہ میری زندگی کی تعویذ بن گیا ہے، جو میری پہچان کو چھپائے ہوئے ہے، جو نہ میرے دل سے مٹائی جاسکتی ہے اور نہ اسے کھول کر وہ کسی کو پڑھوا سکتی ہے کہ وہ شام میں جنمی تھی۔ وطن...... وطن...... اس نے کراہ کر دل میں پڑی تعویذ کو پڑھا۔ کبھی کبھی اندر چھائی گھٹن اتنی گھنی ہو جاتی ہے کہ اس کا دل چاہتا کہ وہ گھر کی چھت پر کھڑے ہو کر اونچی آواز سے اذان دے اور تب تک وطن...... وطن کی تکرار کرتی جائے جب تک وہ آواز اس کے وطن شام پہنچ کر اس کے ہم وطنوں کے دلوں کو جھنجھوڑ نہ دے۔ اس کی بےچینی کا پیغام انہیں پہنچا کر، اس کو ڈھونڈ نکالنے پر انہیں مجبور نہ کر دے۔ 'وطن، تم کہاں ہو؟ تمہیں پتہ ہے نہ کہ میں یہاں ہوں۔ وطن، میں یہاں ہوں۔ مجھے واپس بلالو۔ میرے لئے اپنے دروازے کھول دو۔ مجھے اپنی گود میں بٹھالو۔ اس انجان ملک میں مجھے کیوں رہنے پر مجبور کر رہے ہو؟ آخر میرا قصور کیا ہے؟'

زبیہ بچوں کی طرح پھپھک پڑتی۔ آخر کتنی پرتوں میں وہ زندگی جی رہی ہے! اس سماج میں بھی وہ مظلوم ہے۔ اس سے ہمدردی رکھنے والے کتنے ہیں جو جانتے ہیں کہ اس کا شوہر بے قصور تھا۔ انہیں سیاست سے کیا لینا دینا تھا، مگر آج سیاست کی اندھی مار سے اس کی پیٹھ سب سے زیادہ لہولہان ہے۔ اب وہ کیا کرے؟ کیا ساری زندگی یہیں ٹھہر کر وہ بدیع کی راہ تکتی رہ جائے گی یا وطن نہ لوٹ سکنے کی ناامیدی کو امید میں بدلتے دیکھنا چاہے گی؟ آخر اس کے بس میں کیا ہے؟ کچھ بھی نہیں، کچھ بھی نہیں، سوائے موم جامہ بنے رہنے کے۔

پل صراط

مجھے گناہ کا سبق دے کر آخر تم کہاں کھو گئے؟ میرے رات دن تو سونے تھے ہی، میں نے اس سونے پن سے سمجھوتہ بھی کر لیا تھا، پھر تم نے مجھے آواز کیوں دی؟ تمہاری آواز نے اس ویرانے کو لال انگاروں میں بدل دیا تھا، جہاں میرا کھڑا رہنا غیر ممکن سا ہو گیا تھا اور میں بے قرار اس پکار کے پیچھے ہولی جس میں بارش کی ہواؤں کی خوشبو تھی۔ پہاڑوں کی اونچائی کا الاپ اور وادیوں کے پھیلاؤ کا گہرا راگ تھا۔ میں اس سُر کے دھارن کو پکڑتی اس کی لہروں پر قدم رکھتی ہوئی تم تک پہنچی تھی، کیوں کہ اس آواز کے مالک تم تھے۔

دیکھو! آج کی رات بھی دجلہ بہہ رہی ہے اور میں جیسے تمہاری آواز کی ناو پر بیٹھی اس کے ساتھ بہہ رہی ہوں۔ بہتے پانی میں گھلتی چاندنی کو دیکھ کر لگتا ہے، تمہاری یاد میرے وجود میں اسی طرح گھل مل گئی ہے۔ پیاس—شدید پیاس کا احساس، چاہت......اور یہی چاہت کا چاند، کھجوروں کے درختوں کے پیچھے سے کیسا چمک رہا ہے۔ سورج کی چمک ہی تو اسے دمکا رہی ہے، پھر میرا سورج کس بدلی میں ڈوب گیا ہے؟

شہر کی سڑکیں ایک ایک کر کے سیاہی کی آغوش میں اپنی نیند میں ڈوبی آنکھیں بند کر رہی ہیں۔ چاروں طرف اندھیرا بڑھ رہا ہے۔ خاموشی چھا رہی ہے۔ صرف میرے دل کی دھڑکن کی آواز میرے کانوں سے ٹکراتی ہے۔ یہ دھڑکن آج کتنی اجنبی لگ رہی ہے، جیسے کوئی نغمہ نہ ہو کر یہ صرف ہانپنے کی آواز ہو، کسی پیاسی ہرنی کی، جو ویرانے میں میلوں دوڑ رہی ہو۔ اس آواز کی تلاش میں سراب بنی اسے چھلتی ہوئی ٹھیک اس پیاسے مسافر کی طرح اس کو دم توڑنے پر مجبور کر دیتی ہے جو ریگستان میں قافلے میں بچھڑ گیا ہو اور ریت کے بھنور میں پھنستے ہوئے وہ اونٹ کی گردن میں پڑی گھنٹی کی مدھم پڑتی آواز کو بڑی مایوسی سے سن رہا ہو۔

میرے ساربان! میری زندگی کو تم کس انجانی ڈگر پر چھوڑ گئے ہو؟ میلوں ریت ہے جس پر تمہارے

پیروں کے نشان بھی مٹ چکے ہیں اور مجھے اپنی منزل کا راستہ پتہ نہیں۔ میں تو تمہاری پکار پر صحرا سے نخلستان کی طرف نکل آئی تھی۔ مجھے کیا پتہ تھا، اس آواز کی کشش میرے دامن کو جلا کر راکھ کر دے گی۔ میرے وجود کو ایک سوال بنا دے گی؟

نیلی کاشی کاری کی مسجد افق کی لالی میں نہا رہی ہے۔ صبح کا تارا بھی ڈوبنے کو اتاولا نظر آرہا ہے۔ پرندے چہکنے لگے ہیں اور میرے لئے بھاگ دوڑ سے بھرا ایک محنت کش دن پھر میرا انتظار کر رہا ہے۔ یادوں کو رات اپنی بانہوں میں بھر کر لے گئی ہے۔ کل جھٹ پٹے کے وقت پھر اسے میری آغوش میں ڈال دے گی اور کہے گی، 'لے بہنا، میری ساتھن، اکیلی سفر کر، میری طرح ہر چیز، ہر احساس کو اپنے وجود کی تاریکی میں ڈبو لے۔ کالا رنگ ہی رنگوں کا راجا ہے۔ اس پر کون سا رنگ اپنا اختیار جما سکتا ہے بھلا؟'

'تم اٹھ گئی لیلیٰ؟' ماں کی تھکی آواز کانوں سے ٹکرائی۔

'ہاں ماں!' لیلیٰ نے دھیرے سے کہا۔ وہ اب ماں کو کیا بتاتی کہ سونا اس کے مقدر میں ہے کہاں؟ جب سے حسن میدان جنگ گیا تھا تب سے اس کی یہ حالت دھیرے دھیرے کر کے شب بیداری میں بدل گئی تھی۔

'چائے تیار ہے۔' ماں کی تھکی کانپتی آواز ابھری۔

'آئی ماں!' لیلیٰ تیار ہو کر کمرے سے نکلی۔

سات بج رہے تھے۔ دس منٹ بعد اسٹاف بس کا ہارن سنائی پڑے گا۔

'لوٹتے ہوئے بازار ہوتی آنا۔' ماں نے کہا اور بیٹی کے جوان چہرے کو دیکھا جس پر اداسی نے اپنا سایہ پھیلا رکھا تھا۔ کالے کپڑے میں اس کا سفید چہرہ زیادہ پھیکا اور بے جان لگ رہا تھا۔ کتنے سال ہو گئے ہیں کالا کپڑا پہنتے ہوئے...... اس سے پہلے اس گھر میں صرف رنگ چٹختے تھے، بکھرتے تھے۔

'لانا کیا کیا ہے؟' چائے تیزی سے ختم کرتے ہوئے لیلیٰ نے پوچھا۔

'یہ رہا پرچہ، سب کچھ لکھا ہوا ہے۔ میری دوائیں بھی۔ اس نئے ڈاکٹر کی دوا سے تو بہت فائدہ ہوا

ہے۔ کم سے کم درد میں آرام ہے اور رات کو چین سے سو تو لیتی ہوں۔'

'ٹھیک ہے، ماں، پھر میں چلتی ہوں۔' کہتی ہوئی لیلیٰ اٹھی۔ پرس میں پرچہ ڈالا اور سیڑھیاں اترتی ہوئی نیچے کھڑی بس میں جا کر بیٹھ گئی۔

'اہلن و سہلن' کی خیر مقدم کرتی آواز سے بس کی خاموشی ٹوٹی۔ بس کے چلتے ہی ام کلثوم کے گانے کی آواز گونج اٹھی۔ کھجور کے درخت تیزی سے پیچھے چھوٹنے لگے جنہیں گننا اب لیلیٰ کو اچھا نہیں لگتا ہے۔

وزارت کے کام سے ہٹا کر اس کی ڈیوٹی کچھ دنوں کے لئے اس پانچ ستارہ ہوٹل میں 'ہاؤس کیپنگ' میں لگائی گئی ہے۔ جنگ جاری ہے۔ جوان تیزی سے کام آ رہے ہیں۔ ہزاروں کی تعداد میں ہر مہینے جگہیں خالی ہو رہی ہیں۔ ڈیڑھ لاکھ تو صرف ہندوستانی ہیں۔ مصری تو شاید اس سے بھی دوگنے اور اب کوریا اور فلپائن سے بھی مزدور آنے شروع ہو گئے ہیں۔ وزارت میں لبنانی، جارڈن، فلسطینی سبھی ملک کے لوگ بڑے بڑے عہدوں پر بیٹھے ہیں۔ عرب اتحاد پر یقین کر کے بھی ہمیں کیا ملا؟ اس ایران عراق جنگ نے سب کے چہروں کو ننگا کر دیا۔ شام کو دیکھو، کیسے تیور بدل لئے ہیں اپنے۔ چودہ سال نجف کی مہمان داری کس کام آئی؟ آج وہی مہمان ہمارا دشمن بن گیا ہے اور اسی دشمن کا دوست یہ لیبیا بن بیٹھا ہے، پھر بھی ہم عرب اتحاد کی بات کرتے ہیں۔

بس جھٹکے سے رکی۔ لیلیٰ کی سوچ کا سلسلہ بکھر گیا۔ سامنے پانچ ستارہ ہوٹل کی کتھئی عمارت تھی اور فواروں کی اونچی پھوہار...... کمرے میں جا کر اس نے یونیفارم بدلا اور رجسٹر پر جھک گئی۔

'اہلن و سہلن لیلیٰ۔' سیما چٹرجی کی سریلی آواز سے چونکی۔

'اہلن، مرحبا میڈم۔' لیلیٰ نے کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔ ہاؤس کیپر ہندوستانی ہے اور سب کا بڑا خیال رکھتی ہے۔ اسے اس کا سانولا نمکین چہرہ بہت پسند ہے۔ بہت پیار سے وہ باتیں کرتی ہے۔ خود بھی کتنی اکیلی ہے اس بغداد جیسے بڑے شہر میں، جہاں اپنے بھی پرائے ہو جاتے ہیں۔

'ایک سو تیرہ نمبر کمرے میں تولیہ نہیں ہے۔' سیما نے کہا، 'چوتھی منزل کے سارے کمرے خالی ہو گئے ہیں۔ سب کی چادریں بدلنی ہیں اور آج خالدہ بھی نہیں آئی ہے۔ کام بہت ہے۔' کہہ کر سیما

چڑ جی آگے بڑھ گئی۔

'سنبھالتی ہوں ابھی جا کر۔' کہتی ہوئی لیلیٰ نے چابی کا گچھا اٹھایا۔

'پلنگ جوڑتے جوڑتے تو کمر ہی ٹوٹ گئی ہے میری۔' لیلیٰ نے ہونٹ اور ناک پر چھلک آئے پسینے کو پونچھتے ہوئے کہا۔

'جمعرات کی یہ رات کیا آتی ہے، قیامت بن کر ٹوٹتی ہے ہم پر۔ کام، کام، کام۔' عالیہ نے جھنجلاتے ہوئے کہا۔

'پوری دس دلہنیں ہوں گی آج ہمارے ہوٹل میں۔' لیلیٰ نے گلدان میں پھول سجاتے ہوئے کہا۔

'کتنے بج گئے؟' عالیہ نے تھکن بھری آواز سے کہا۔

'ساڑھے دس بجے ہیں۔ بس، کام ختم سمجھو۔ نیچے چل کر دلہنوں کو دیکھیں گے یا پھر اوپر کمرے کی کھڑکی سے۔' لیلیٰ نے کہا اور چھت پر لگی جالی دار قندیل کا بٹن دبایا۔ کمرا روشنی کے پھولوں سے بھر اٹھا۔

دونوں کمرے سے باہر نکلیں۔ لفٹ میں آٹھویں منزل پر جانے والے جوان جوڑے کھڑے تھے۔ ڈسکو سے آواز آنی شروع ہو گئی تھی۔ دونوں لڑکیاں کمرے میں جا کر صوفوں پر بیٹھ گئیں۔

'کچھ پیا جائے؟' عالیہ نے لیلیٰ سے پوچھا۔

'ٹھیک ہے۔ فاروق کو فون کرتی ہوں۔ کمرے میں پہنچ جائے گا۔' لیلیٰ نے فون گھماتے ہوئے کہا۔

'سنا ہے، اب سارے ہندوستانی اور پاکستانی اپنے وطن کو دھیرے دھیرے کر کے لوٹ رہے ہیں۔' عالیہ نے دھیرے سے کہا جیسے خود سے باتیں کر رہی ہو۔

'ہاں، اس جنگ زدہ شہر میں جب اپنوں کے کھانے کے لالے پڑ رہے ہیں تو پھر ان کو کون سنبھالے گا؟ پانچ سال گزر گئے۔ جنگ ختم نہیں ہوئی۔ یہ نہ جائیں اپنے وطن کو تو کیا کریں؟' لیلیٰ نے کہا۔

'پھر بھی یہ پرائے ہو کر اپنے ہو گئے تھے اور جو اپنے تھے وہ دشمن بن گئے۔' عالیہ نے دھیرے سے کہا۔

'دوست ہی تو دشمن بنتا ہے۔' لیلیٰ نے آہستہ سے کہا۔

نیچے خوشی بھری بُر بُر کی آواز آنی شروع ہو گئی، جس کا مطلب تھا، دلہن آ رہی ہے۔ دونوں کمرے سے باہر نکلیں اور پہلی منزل پر پہنچ کر اس کی سیڑھیوں پر کھڑی ہو گئیں تاکہ ہوٹل کا منیجر انہیں اس طرح کھڑا دیکھ نہ سکے۔

'دلہن کتنی حسین ہے؟' لیلیٰ نے کہا۔

'مگر اس کا شوہر تو دیکھو! پورا ٹرک ڈرائیور نظر آ رہا ہے۔ تاجر ہو گا تاجر۔' عالیہ بولی۔

'ہاں، کچھ نہ کچھ تو خوبی ہو گی تب ہی اتنی حسین دلہن ملی ہے۔' لیلیٰ ہنسی۔

'اف! لیلیٰ، وہ دیکھو...... وہ یمنی کمبخت پھر آ گیا۔' عالیہ کی نفرت بھری آواز ابھری۔

لیلیٰ نے دیکھا، دلہن کے پیچھے کی بھیڑ میں سفید چوغے اور سفید رومال سر پر ڈالے وہ انڈے کا یمنی تاجر کاؤنٹر کی طرف بڑھ رہا تھا مگر اس کی نظریں دلہن اور جوان لڑکیوں پر تھیں، جو منہ سے بُر بُر کی آوازیں نکال رہی تھیں۔

'چلو، وی آئی پی کمرا کھولنا پڑے گا۔ سیما میڈم ہمیں ڈھونڈ رہی ہوں گی۔' کہتی ہوئی لیلیٰ اوپر سیڑھی چڑھنے لگی۔

'سنو لیلیٰ! ساتویں منزل میں پھول لگانے ہیں۔' سیما راستے میں مل گئی۔

'مگر میڈم! پھول تو سب دلہنوں کے کمروں میں چلے گئے؟' عالیہ بولی۔

'کچھ کرنا تو پڑے گا۔ میں ابھی آئی۔ تم اوپر جا کر کمرے کو ایک بار چیک کر لو کہ سب چیزیں موجود ہیں یا نہیں۔' سیما نے تیزی سے آگے بڑھتے ہوئے کہا۔

'ٹھیک ہے۔' کہتی ہوئی لیلیٰ آگے بڑھی۔

'ایک ہی دن میں یہ یمنی کا بچہ ایک ساتھ چاروں بستروں پر لوٹتا ہے۔ حد ہوتی ہے ہر بات کی۔ یہ سب کرنا ہوٹل میں منع ہے، مگر منیجر کے دوست کو، وہ بھی اتنے پیسے والے تاجر کو کون روک سکتا

ہے؟ یہ ہوٹل نہ سہی، دوسرے ہوٹل میں چلا جائے گا۔' عالیہ بڑبڑاتی ہوئی آگے بڑھی۔

کمرے میں سب کچھ ٹھیک تھا۔ تھوڑی دیر بعد لیلیٰ بھی پھول لے کر پہنچ گئی۔ کمرے پر ایک اطمینان بھری نظر ڈال کر دونوں باہر نکلیں۔ ان کی ڈیوٹی ختم ہونے میں صرف آدھا گھنٹہ باقی رہ گیا تھا۔ کمرے میں جاکر کپڑے بدلے اور نیچے بس کے لئے اتر گئی۔ ہوٹل کا میدان کاروں سے بھرا تھا۔ رنگین کپڑوں میں جوڑے کار سے اتر رہے تھے، کچھ جانے کی تیاری کر رہے تھے۔

'میں نے کب سوچا تھا کہ میں اتنی بدل جاؤں گی۔ بابا کے علاوہ مجھے کسی مرد کی شخصیت اس قابل نہیں لگتی کہ میں اسے اپنے نزدیک آنے کی اجازت دیتی۔ پندرہ سال سے بابا کے غم میں کالا کپڑا پہن رہی ہوں۔ شاید ہمیشہ پہنوں گی، کیوں کہ وہی میری زندگی کے واحد مرد تھے جنہوں نے مجھے پہچانا تھا۔ میرے سر پر سائے کی طرح کھڑے تھے ورنہ حسن تو......

'حسن میری زندگی میں پوری طرح سے داخل بھی نہیں ہو پایا تھا کہ لڑائی شروع ہو گئی۔ لڑائی سے پہلے کی گھٹن، کچھ ہونے والا ہے، جیسا احساس سبھی کو پریشان کئے ہوئے تھا۔ پھر دس لاکھ عراقی اپنے ہم وطن یکایک ایران بھیج دیئے گئے، کیوں کہ ان کے نسلی ریشے اس سرزمین میں سے اُگے تھے۔ ان کے عضلوں میں ایرانی خون بہہ رہا تھا، سنی شیعہ کی دیوار خود بخود مضبوط ہونے لگی۔ اس نئی سماجی تبدیلی میں حسن اور میں کچھ نہ کر سکے۔ وفا بٹنے لگی اور اس بٹوارے میں ہماری آپسی وفاداری کی بنیاد پڑنے سے پہلے ہی ہل گئی۔ عراق چھوڑ کر جانے والے قافلے میں سب سے آگے حسن تھا۔

'اسی بات نے کہیں میرا دل اندر تک چیر کر رکھ دیا تھا۔ پھر ایران جاکر حسن نے کسی سے دستی خط مجھے بھیجا تھا کہ وہ ایرانی اسلامی فوج میں بھرتی ہو گیا ہے اور کسی دن بڑی شان سے ایک حاکم کی طرح عراق کی سرزمین پر مجھ سے ملنے آئے گا۔ میرا دل نفرت، حقارت اور افسوس سے ایسا پاگل ہو گیا تھا کہ مجھے لگتا تھا کہ میں نے کبھی بھی حسن نامی آدمی کے لئے کوئی نازک احساس جیا ہو۔ ایک ڈراونا خواب تھا جس کی تعبیر سامنے تھی۔ اس کو گزرے پورے پانچ سال بیت گئے تھے، مگر اس ایک رات کے خواب نے میرا پیچھا آج تک نہیں چھوڑا تھا۔

'عورت کا وطن مرد ہوتا ہے، یہ سوچ صرف حسن کی تھی۔ میں بیس سال کا پرانا رشتہ اپنی زمین سے

توڑ کر اس کے ساتھ کیسے جا سکتی تھی؟ سیاست نے یکایک سب کچھ بدل کر رکھ دیا تھا، مگر اس کے باوجود میرا ابھی تو کچھ تھا۔ میرا وطن، میرا احساس، میرا خاندان، میری زندگی، جسے بابا نے سنوارتے ہوئے مجھ سے بہت سی ایسی باتیں کہیں تھیں، جو میرے خون میں بہنے لگی تھیں۔ میرے عضلوں میں رگوں کی طرح اُگ آئی تھیں۔ جن میں بہتا خون اسی زمین سے اُگے اناج سے بنا تھا، جسے میرے باپ دادا نے سینچا تھا۔ میرا وجود چھ مہینے کے بنے اس نئے رشتے کی وجہ سے اپنا پرایا سب کچھ یکایک کیسے انکار کر سکتا تھا؟ میں کچے رنگ کی پڑیا نہیں تھی اور نہ ہی حسن موسلادھار گرتا آبشار، جو اپنی مردانگی کی دیوانگی میں مجھے بہالے جاتا۔ میں انسان تھی، کوئی سیاسی نعرہ نہیں، کوئی سیاسی بٹوارہ نہیں۔ 'محبت ٹھہر گئی تھی۔ نخلستان کی بہتی مینڈوں کا پانی سوکھ گیا تھا۔ کھجوروں کا سایہ ٹھنڈ دینے کی جگہ شعلے برسانے لگا تھا اور میں...... میں صرف پشیمان سی کھڑی رہ گئی تھی۔'

'عراق پر گرا ہر ایرانی بم سیدھے میرے دل پر وار کرتا تھا اور تباہ بستیاں جانے کیوں مجھے گناہ کا احساس دلاتی تھیں کہ میں تھی جس نے تمہیں پسند کیا تھا اور یہ تم ہو جو اپنی خاک میں رشتہ توڑ کر اس کی تباہی کا سامان پیدا کر رہے ہو۔ انسان تو کسی بھی خیال، کسی بھی عقیدہ، کسی بھی مذہب، کسی بھی نظریہ سے پہلے پیدا ہوا تھا۔ پھر اتنے پرانے اس آپسی انسانی محبت کے رشتے کو توڑ کر تم نظریئے اور سرحدوں کے تنگ دائرے میں کیسے قید ہو گئے؟ تم اتنے تنگ نظر کیسے بن گئے حسن؟'

یکایک رات کا سناٹا بم کے تیز دھماکے سے ٹوٹا۔ لیلیٰ نے اپنے کان بند کر لئے۔ لال روشنی کا پہاڑ شہر کے اندھیرے کو چیرتا ہوا آسمان سے باتیں کرنے لگا۔ لیلیٰ کو پکارتی ہوئی اس کی ماں دیوانہ وار اندھیرے کمرے کے چکر لگا رہی تھی۔ تھوڑی دیر میں صبح ہونے والی تھی۔ لال آگ سورج کی سرخی میں بجھنے لگی۔ کالا شہر گلابی رنگ کی پرچھائیں میں نہانے لگا۔ لیلیٰ نے آنکھیں کھولیں۔ پورا بدن پسینے سے تر تھا۔ احساس کا دریا کب کا سوکھ گیا تھا، اب صرف تلخ حقیقتوں سے بھرپور ایک روشنی بھرا دن تھا جو اس کی موجودہ زندگی کا صحیح ترجمان تھا۔

کھجور کے پیڑوں پر کلیاں آگئی تھیں۔ انہیں نکال کر نر پیڑ سے مادہ پیڑ پر لگایا جا رہا تھا تاکہ پیڑ کھجوروں سے لد جائیں۔ حسن کے بابا یہ کام کرتے تھے۔ وہ شیعہ تھے۔ یہ کام پورے عراق میں شیعہ ہی تو

کرتے ہیں۔ مگر اس بات کا اسے احساس کب تھا، کون کیا ہے۔ اسے تو بابا نے انسانوں کی دو قسمیں بتائی تھیں —ایک مرد اور دوسری عورت، جن کے بیچ میں ایک ہی رشتہ ہوتا ہے، وہ ہے انسانیت کا، جو اٹوٹ ہے ورنہ باقی رشتوں کے نام سے فقط سماجی بندھن ہیں۔ ان میں اگر انسانیت کی گرمی نہیں تو پھر وہ جنگل کی مانند میں گزاری گئی محض ایک جانور کی زندگی ہے۔

دکان کا دروازہ کھلا۔ موسیقی سے بھری گھنٹی نے اس کی سوچ کا سلسلہ توڑ دیا۔ وہ کاؤنٹر کے سامنے فطری انداز میں کھڑی ہوگئی۔ نئی نوکری پر آئے ہوئے ابھی اسے دو مہینے ہی گزرے ہیں۔ ماں کو ہوٹل کی نوکری پسند نہیں تھی۔ رات بھر وہ اکیلی گھر میں گھبراتی تھی۔ اتنا پڑھ لکھ کر وہ بھی چاہتی تھی کہ کچھ ایسا کام کرے جس میں وہ کچھ سیکھ سکے۔ اخبار میں کچھ دن کام کر کے وہ سب کچھ سمجھ گئی تھی۔ قلم کا استعمال وہ وہاں رہ کر نہیں کر سکتی تھی۔ اس کے خیال کی وہاں کوئی قیمت نہیں تھی۔

'چہرے پر کے دھبے ہٹانے والی کوئی کریم ہے؟' ایک جوان لڑکی نے امید بھری شرمیلی نظروں سے اس کے چہرے کو دیکھا۔

'ابھی تو نہیں ہے مگر آنے کی امید ہے۔' لیلیٰ نے الماری پر نگاہ ڈالتے ہوئے کہا۔

'اوہ۔' ناامیدی سے اس کا چہرہ بجھ گیا۔

'یہ انجکشن چاہئے۔' ایک بوڑھا گاہک پریشان سا کھڑا تھا۔

'انجکشن میں صرف دو دے پاؤں گی۔' لیلیٰ نے نسخہ پڑھتے ہوئے کہا۔

'صرف دو؟ ڈاکٹر نے پورے بیس دن کے لئے لکھا ہے۔' بوڑھے نے اپنی بےچین اداس آنکھیں لیلیٰ کے چہرے پر گاڑ دیں۔

'بابا! ہمارے پاس یہی دو باقی بچے ہیں۔ کب مال آئے گا، کہہ نہیں سکتی ہوں۔ آپ کسی اور دکان پر پوچھ لیں۔' لیلیٰ نے کہا۔

'سارا بازار چھان مارا، ہر جگہ یہی جواب ملا ہے کہ انجکشن نہیں ہے۔ جنگ زدہ ملک میں بیمار ہونا بھی

لعنت ہے۔' بوڑھے کے شانے ناامیدی سے اور جھک گئے۔

'دو تو لیتے جایئے ورنہ...... 'لیلیٰ نے کہا اور پھر اسے دھیان آیا کہ ہوٹل میں کھانے پینے سے لے کر عیش و آرام کی ہر چیز دستیاب تھی مگر بازار میں آلو، پیاز بھی کبھی کبھی مہینہ دو مہینہ نظر نہیں آتے تھے۔ اس لڑائی نے تو عام آدمی کی زندگی موت سے بدتر کر دی ہے۔ شام نے پائپ لائن بند کر کے پٹرول کی درآمد ہی ختم کر دی ہے۔ اوپر سے پانی بند کر کے کتنے دیہاتیوں کو پیاسا رکھا۔ ان کی فصلیں سوکھ گئیں۔ اب دوا کی کمی سے لوگ مریں گے۔ دوسرا فلسطین بن گیا ہے یہ شہر بھی۔

'مجھے لپ اسٹک دکھایئے۔' ایک خوبصورت عورت عطر سے بسی ہوئی دکان میں گھسی۔ سر سے پیر تک چمکیلے کپڑے اور ہاتھ، کان، گردن سونے کے زیورات سے بھرے ہوئے تھے۔

'یہ چارٹ ہے، رنگ پسند کر لیں۔' لیلیٰ نے کہا اور جھک کر لپ اسٹک نکالنے لگی۔ ایک لمحہ کو اس کے ذہن میں ایک خیال آیا کہ اس عورت نے وار فنڈ میں کتنا سونا دیا ہو گا؟

'ذرا آئی شیڈ بھی نکالنا۔' کہہ کر وہ عورت آئینے کے سامنے کھڑی ہو گئی۔

'لیجئے۔' کہہ کر لیلیٰ خاموشی سے اسے دیکھنے لگی۔ اس جنگ نے کچھ لوگوں سے ان کا کچھ بھی نہیں چھینا ہے شاید۔

یکایک دکان کی بھیڑ ختم ہو گئی اور پھر وہ اپنی جگہ پر بیٹھ گئی۔ پرس کھول کر چھوٹی سی ڈائری نکالی۔ پچھلے تین برسوں میں وہ سب کچھ بھول گئی تھی۔ شعر کہنا بھی اور لیلیٰ کو پہچاننا بھی کہ اس نام کی کوئی لڑکی اپنے ملائم احساسات کے ساتھ اس کے وجود میں کبھی رہتی تھی۔ اس دوا اور سنگار کے سامان والی دکان پر کام کر کے طرح طرح کے لوگوں سے ملنے لگی تھی۔ مختلف چہرے، ان کی مانگ، ان کی خریداری دیکھ کر اس کے اندر کی مشینی لڑکی اب اپنے لوہے کے لباس کو اتارنے لگی تھی۔ اس سماج میں وہ اپنی خواہشات کی سپاہی نہیں بن سکتی ہے، بلکہ دوسروں کی خواہشوں کے مطابق ہی وہ لڑائی میں شامل ہو سکتی ہے۔ اس درد کو اس نے بڑی ہمت سے زہر کے گھونٹ کی طرح پی لیا تھا اور اپنی لڑائی بغیر کسی کے دیئے حفاظتی خول کو پہنے جاری رکھنے کا ارادہ دل میں ٹھان لیا تھا۔

ہفتے بھر سے جنگ نے شدت اختیار کر لی تھی۔ اور جب جب یہ جنگ آگ پکڑتی ہے جانے کیوں اس کے دل کی دنیا میں حسن کی کمی اور زیادتی، اس سے پیار اور نفرت کے جذبے ایک ساتھ ہلچل مچا دیتے

ہیں۔ اس کی وجہ شاید حسن سے وہ لگاؤ ہے جو محبت کے تلخ رنگ سے شرابور ہے۔ جب بھی احساسات کی ترنگیں اٹھتی ہیں تو اس سے اٹھادر دلاعلاج ہو جاتا ہے۔ کسی شخص سے ایک ساتھ محبت اور نفرت کی جا سکتی ہے، اسے کبھی کبھی اپنے اوپر تعجب سا ہونے لگتا ہے۔

'کیا آفت ہے ہماری جان کو۔ یہ جنگ تو شیطان کی آنت ہو گئی ہے جو ختم ہونے کا نام ہی نہیں لیتی ہے۔ صبح سے بیسیوں بار بم گرا چکے ہیں، پھر بھی چین نہیں ملتا نہیں۔' لیلیٰ کی ماں نے کروشیا رکھتے ہوئے کہا۔

'تم نے مجھ سے کچھ کہا؟' لیلیٰ نے کہا۔

'ہاں! اب رات کافی ہو گئی ہے۔ سونا چاہیے۔ یہ پٹاخے تو چلتے رہیں گے۔' کہہ کر ماں نے کروشیا کو تلے دانی میں رکھا، پھر سر پر چادر ڈال کر کوئی دعا پڑھنے لگی۔

'سو گئی کیا؟' لیلیٰ کی بند آنکھ دیکھ کر انہوں نے تھوڑی دیر بعد پوچھا۔ جب کوئی جواب نہیں ملا تو وہ بتی بجھا کر لیٹ گئی۔

لیلیٰ گہری نیند میں ڈوب چکی تھی اور خواب میں وہ اپنے کو ایک سنہرے ریگستان میں کھڑا دیکھ رہی تھی۔ پیلی دھوپ میں چمکتی سنہری ریت پر انگور کی شاخیں پھیلی ہوئی تھیں۔ ان کے ہرے نازک بڑے بڑے ملائم پتے ایک ہالہ کی شکل میں اس کو چاروں طرف سے گھیرے تھے۔ ابھی وہ ریت میں اُگی انگور کی بیلوں کو دیکھ کر حیرت میں ڈوبی ہوئی تھی کہ تبھی اسے دور سے حسن آتا نظر آیا۔ وہ تیزی سے آگے بڑھی۔

'تم یہاں کہاں؟' لیلیٰ نے حیرت سے پوچھا۔

'بس، گھر کی یاد آئی اور سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر چلا آیا۔' حسن نے بڑے اعتماد سے کہا۔

'کیا تم اب کبھی واپس نہیں جاؤ گے؟' لیلیٰ نے مشکوک لہجے میں پوچھا۔

'نہیں۔' حسن نے جواب دیا۔

'اچھا!' اتنا کہہ کر لیلیٰ نے سر جھکا لیا۔

'کیوں؟' اس معمولی سے 'اچھا' میں بہت سارے سوال تھے، جنہیں حسن سمجھ گیا تھا۔

'ٹھیک ہی تو کہہ رہے ہو گے، مگر مجھے ڈر لگ رہا ہے کہ کہیں تمہیں پریشانی نہ اٹھانی پڑے۔ وہ لوگ تمہیں یہاں دیکھ کر کہیں...... 'لیلیٰ کے دماغ میں بہت سی آوازوں کا شور گونج رہا تھا جو دشمن کو دیکھ کر بستی والوں کے منہ سے نکلتا ہے۔

'میں کسی سے نہیں ڈرتا ہوں۔ اپنے ملک لوٹا ہوں، کسی غیر کے گھر نہیں۔' حسن نے ہنستے ہوئے کہا۔ وہ پوری طرح بے فکر نظر آرہا تھا۔

'ہو سکتا ہے۔' یہ لفظ لیلیٰ کی زبان پر آکر بھی ہونٹوں سے ادا نہ ہو سکے۔

تبھی پیچھے سے آتا شور بڑھنے لگا۔ لیلیٰ نے گھبرا کر حسن کو دیکھا۔ وہ اسی بہادری سے بیچ ریگستان میں اکڑا کھڑا تھا۔ مارنے اور مر جانے والے انداز میں۔ اس شبیہ کو وہ جی بھر کر دیکھنا چاہتی تھی، مگر بڑھتے شور کے ساتھ انگور کی ملائم ٹہنیاں اپنے بڑے بڑے پتوں کے ساتھ زیادہ گھنی ہو کر اس کے چاروں طرف پھیلنے لگیں۔ پتوں نے یکایک اسے ڈھک لیا اور پتلی شاخوں نے اس کے پیروں میں زنجیر ڈال دی۔ حسن تک پہنچنا اسے مشکل نظر آنے لگا۔ اس نے بےچینی سے پتے ہٹائے تاکہ دیکھ سکے کہ حسن کہاں ہے۔ پتے در پتے کے بیچ سے اسے ایک سوراخ مل گیا۔ اسی جھروکے سے وہ اس کنج کے باہر دیکھ سکتی تھی۔ اب حسن کا غرور سے بھرا چہرہ ٹھیک اس کے سامنے تھا۔ ڈر کر اس نے ایک پتہ کس کے مٹھی میں جکڑ لیا تاکہ وہ غلطی سے ہل کر دوسرے پتوں کو نہ ہلا دے اور حسن اس کی آنکھوں کے گھیرے سے اوجھل نہ ہو جائے۔ یہ جھروکہ وہ کسی قیمت پر کھونا نہیں چاہتی تھی۔ اس لئے وہ بڑی ہوشیاری سے سانس لے رہی تھی۔

شور بڑھتا ہوا قریب آرہا تھا۔ اس کا بدن خوف سے جمنے لگا تھا۔ پل دو پل میں وہ لوگ حسن کے پاس پہنچ جائیں گے۔ غدار وطن کی سزا کیا ہو سکتی ہے — بھلا کیا ہوتی ہے؟ اس کا دل آنے والی مصیبت کو سوچ کر دھڑکنے لگا۔ مگر یہ کیا؟ ریت میں دھیرے دھیرے کر کے حسن کا بدن دھنسنے لگا اور لمحہ بھر بعد وہاں صرف سنہری ریت کے اٹھتے گرتے ٹیلے اور میدان تھے جن پر سورج چمک رہا تھا۔ شور تھم گیا تھا۔ سناٹا اور ویرانی چاروں طرف پھیل گئی تھی۔ اس نے اپنے اوپر قابو پانا چاہا۔ تبھی ہاتھ میں پکڑا

انگور کا بڑا سا پتہ شاخ سے ٹوٹ کر اس کی مٹھی میں آگیا اور پھر وہ ہرا بھرا ہالہ لمحہ بھر میں غائب ہو گیا اور ریتیلی آندھی کا طوفان اٹھنے لگا۔

لیلیٰ نے گھبرا کر آنکھ کھول دی۔ بڑی دیر تک اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا، وہ کہاں ہے۔ اندھیرے میں اپنی مٹھی کھول وہ انگور کے پتے کو دیکھنا چاہ رہی تھی۔ بہت دیر بعد اسے ہوش آیا کہ وہ اپنے کمرے میں ہے اور خواب میں یہ سب دیکھ رہی تھی۔ پھر وہ سوچنے لگی، یہ خواب میں نے کیوں دیکھا؟ کیا سچ مچ خواب میں انسان کی چھپی خواہشات ابھر آتی ہیں؟ کیا یہ سچ ہے کہ جس چیز کو حقیقت میں نہیں پا سکتے اسے خواب میں پالیتے ہیں؟

خیالات سے اٹھ کر وہ ہر رات کی طرح بالکونی میں آ کر کھڑی ہو گئی۔ دوج کا چاند بہت اداس اور پھیکا لگ رہا تھا۔ کھجور کے درخت بھی خاموش کھڑے تھے، صرف دجلہ کا پانی تھا جو بہے چلا جا رہا تھا۔

'میرے دل میں حسن کے لئے فقط ایک جذبہ سر کیوں نہیں اٹھاتا ہے؟ چاہے وہ نفرت ہی کا کیوں نہ ہو، صرف نفرت۔ یا پھر وہ احساس، بھرپور محبت کا جذبہ بن کر کیوں نہیں پھوٹتا ہے جسے عشق کہتے ہیں۔ محبت اور نفرت کا یہ ملا جلا احساس کہیں اس کے دل اور دماغ کی آپسی لڑائی تو نہیں ہے؟

'ابھی تو میں زندہ ہوں، پھر مجھے اپنے امتحان دینے کے لئے پل صراط پر سے کیوں گزرنا پڑ رہا ہے؟ نہیں...... شاید میری یہ زندگی خود پل صراط ہے۔ اندھیرے میں چمکتا ہوا راستہ تلوار سے زیادہ تیز، سوئی کی نوک سے زیادہ باریک، جس کے نیچے جہنم کی آگ دھدھک رہی ہے۔ قیامت کے دن اس پر سے سب کو گزرنا ہے۔ دیکھتی ہوں، اس راستے پر چلتے ہوئے نیچے گرتی ہوں یا پھر یہ سفر پل کی انتہا تک جاری رہے گا، جس کی انتہا جنت نہیں، جدوجہد ہو گی، صرف جدوجہد......'

بازار بند ہونے لگا تھا۔ اس کا کام بھی ختم ہو گیا تھا۔ وہ اپنی دکان سے باہر نکلی اور بس اسٹاپ کی طرف آہستہ آہستہ بڑھنے لگی۔ آج سے پندرہ سال پہلے وہ عراق میں نہیں تھی۔ بابا ایمبیسڈر تھے۔ اس کا بچپن ایک ملک سے دوسرے ملک کا چکر لگاتے ہوئے گزرا تھا۔ اس نے زمانہ دیکھا تھا۔ بہت کچھ سمجھا تھا، مگر بابا یوں چپ چاپ ایک دن بغیر کہے سنے سوتے میں ہی چل دیں گے، اسے اس کا پتہ نہیں تھا۔ وہ تو بابا کے دل میں رہتی تھی تو بھی اس کے بند ہونے کی آواز تک نہ سن سکی۔ صبح پتہ چلا، وہ

رات کو سوتے ہی میں سفیر بن کر ایک ایسے ملک چلیں گے جہاں سے کوئی نہیں لوٹتا ہے۔ وہ صرف دل تھام کر رہ گئی تھی۔ کتنی باتیں، کتنے سوال تب سے اس کے پاس جمع ہیں مگر وہ کس سے کہے؟ بابا تھے جو سب کچھ سمجھتے تھے اور اسے بہت کچھ سمجھاتے تھے، جو اس روزمرہ کی باتوں سے دور اس زندگی کا ماحصل ہوتا تھا۔

اسٹاپ پر کئی لڑکیاں بس کے انتظار میں کھڑی تھیں۔ وہ بھی آس پاس کی دکانوں پر ہی کام کرتی تھیں۔ انہی کے بیچ لیلیٰ روز کی طرح جاکر خاموش کھڑی ہوگئی۔ پچھلے تین چار مہینے ہوگئے تھے ایک دوسرے کو دیکھتے ہوئے، مگر کسی نے کسی سے بات نہیں کی تھی۔ ہر ہفتے نظر آنے والی وہ بوڑھی عورت بھی بھاری تھیلے ہاتھ میں اٹھائے ہمیشہ کی طرح ہانپتی ہوئی پاس آکر کھڑی ہوگئی اور پسینہ پونچھنے لگی۔ اس نے بس کے انتظار میں کھڑے چہروں کو غور سے دیکھا پھر لیلیٰ پر اس کی نظریں گڑ گئیں۔

'بیٹی! تمہارے گھر میں کون شہید ہوا ہے؟' مہینوں کا دبا سوال وہ بوڑھی عورت لیلیٰ سے پوچھ بیٹھی۔

'کوئی نہیں۔' لیلیٰ نے دھیرے سے کہا۔

'پھر؟' اس بوڑھی عورت نے کہا۔ اس کے دو لڑکے اور داماد تین سال پہلے شہید ہوئے تھے۔ تب اس نے دو سال تک کالا کپڑا پہنا تھا۔ یہی رسم تھی یہاں کی۔ اپنوں کے مرنے پر کالا کپڑا پہن کر غم منایا جاتا تھا، مگر یہ لڑکی پھر روز کالے کپڑے کیوں پہنتی ہے؟

'اس لئے کہ ہمارے گھر میں کوئی مرد نہیں ہے۔' لیلیٰ نے انتہائی فطری انداز میں کہا۔

'باپ، بھائی، شوہر...... کوئی نہیں...... یہ کیسے ہو سکتا ہے بھلا؟ تمہارے بابا کیا کرتے ہیں؟' بوڑھی عورت نے پوری ہمدردی سے پوچھا۔ اس کا دل اپنے بچوں کی یاد کے غم سے کٹنے لگا تھا۔ اس لڑکی کے خاموش اداس چہرے کو دیکھ کر اسے اپنی بیٹی اور بہو کا اداس چہرہ یاد آرہا تھا۔

'ان کا انتقال ہوئے سولہ سال ہوگئے ہیں۔ بھائی کوئی نہیں ہے میرے۔' تھوڑا ناگواری سے لیلیٰ نے کہا۔ کوئی بات ہوئی بھلا، جان نہ پہچان، اتنے سوال پوچھ رہی ہے۔

'مگر بیٹی، یہ کالا لباس......؟'

'یہ میرا ذاتی معاملہ ہے۔' کہتی ہوئی لیلیٰ آتی ہوئی بس میں سوار ہوگئی۔ 'میں کچھ بھی پہنوں، کچھ بھی کروں، کسی کو کیا تکلیف ہو سکتی ہے۔ عجیب لوگ ہیں۔'

بس میں گونجتے گانے کی آواز تھم گئی اور خبریں آنے لگیں : 'وزیر خارجہ طارق عزیز کا دو دن کے لئے کویت کا دورہ۔ یہ دورہ پوری طرح سے سیاسی مسائل کو لے کر ہوگا۔ دس نرسوں کو ان کے بہترین کام پر صدر جمہوریہ صدام حسین قومی اعزاز سے نوازیں گے۔ کل سے بغداد میں دانتوں کے ڈاکٹروں کا اجلاس شروع ہونے والا ہے۔ اس اجلاس میں تیس غیر ملکی ڈاکٹر شامل ہوں گے۔ یہ اجلاس دو دن تک چلے گا۔ کل بصرہ کے پاس دو ایرانی جہاز مار گرائے گئے۔ دوپہر میں منڈلی پر ہوئے حملے میں زخمیوں اور نقصان کا اندازہ نہیں لگایا جا سکا ہے۔ ایران میں انتخابات قریب ہیں۔ اب دیکھنا ہے کہ خمینی مخالف گروپ کیا کرتے ہیں اور......'

لیلیٰ کا اسٹاپ آ گیا تھا۔ وہ بس سے اتری اور سڑک پار کرنے کے لئے لال بتی کا انتظار کرنے لگی۔ موٹر سائیکل، موٹروں اور پولس گاڑی کی قطاریں سڑک پر دوڑ رہی تھیں۔ پھر اس کے پیچھے کھلی ٹرکوں پر ایرانی فوجی بیٹھے تھے۔ وہ ہفتہ بھر پہلے بصرہ کے قریب بندی بنائے گئے تھے۔ قیدیوں سے بھری پانچ چھ ٹرکیں گزر گئیں۔ گھروں سے بیتاب لوگ باہر سڑک پر نکل آئے۔ نعرے لگاتے، خوشی کا ترانہ گاتے ہوئے عراقی جنگجو ایرانی بندیوں کو لے کر گزر گئے۔ تھوڑی دیر بعد سڑک سنسان تھی۔ اس نے سڑک پار کی اور گھر کی طرف بڑھی۔ ہر سال، ہر ماہ جانے کتنے لوگ بندی بنتے ہیں۔ لگتا ہے، عراق میں جنگ بندیوں کا ایک شہر آباد ہو رہا ہے۔ یا خدا! اس نئے شہر کا نام کیا ہوگا؟

آج لیلیٰ کو ماں کے ساتھ سالگرہ میں جانا ہے۔ فاطمہ اس کی بہت پیاری سہیلی ہے اور دونوں کی مائیں بھی آپس میں پرانی دوست ہیں۔ دونوں ایک شہر کی ہی ہیں اس لئے بہناپے کے علاوہ 'ہم شہری' ہونے کی بھی ایک خاص ملاوٹ اس پیار میں ہے۔

جون کا گرم مہینہ ہے۔ فاطمہ کا چھوٹا سا باغ گلابوں سے بھرا ہوا ہے۔ وہیں پر پڑے جھولے پر دونوں سہیلیاں بیٹھی ہوئی ہیں۔ ایک شہر میں رہتے ہوئے بھی ان کا ملنا بہت کم ہو پاتا ہے۔ فاطمہ کسی اسکول میں ٹیچر ہے۔ سارا دن اسکول میں گزار کر شام بچوں کی کاپیاں دیکھنے میں گزر جاتی ہے۔ اتنے عرصے

بعد دونوں ملی ہیں تو خوب بات ہو رہی ہے۔

'یہ نیا کام کیسا لگ رہا ہے تمہیں؟' فاطمہ نے پوچھا۔

'اچھا ہے۔' لیلیٰ نے جواب دیا۔

'پھر تو دل لگ رہا ہوگا؟' فاطمہ نے پوچھا۔

'تم سناؤ، اسکول کا کیا حال ہے؟' لیلیٰ نے سنترہ چھیلتے ہوئے کہا۔

'اسکول ٹھیک ہے، مگر گھر...... ' کہتے کہتے فاطمہ رک گئی۔ چہرہ بہت اداس ہو اٹھا۔

'کیوں، کیا بات ہے؟ مجھے بتاؤ نا؟ کیا ہوا گھر میں؟' لیلیٰ پریشان ہو گئی۔

'کچھ خاص نہیں، بس یہ لگتا ہے کہ تیس سال کی لڑکی کا کوئی گھر نہیں رہ جاتا ہے۔ یہی گھر بچپن سے میرا کھلایا مگر آج مجھے کسی بات کی آزادی نہیں۔ کہنے کو کوئی ایسی بات نہیں ہے، بس میں تصویر کو اپنے قد کے برابر دیوار پر لگانا چاہتی ہوں اور ماں اپنی طرح سے ٹھیک چھت سے تھوڑا نیچے۔ ہمارا سماج ایسا ہے کہ اکیلے گھر لے کر رہ نہیں سکتی ہوں۔ بس، اپنے ایک کمرے میں اسکول سے آنے کے بعد گھٹتی رہتی ہوں کیونکہ وہی میرا حصہ ہے۔ صحیح بھی ہے، اس عمر کی لڑکیوں کا اپنا گھر ہوتا ہے یعنی شوہر کا گھر، مگر لیلیٰ، شادی کس سے کی جائے؟ اپنی پسند کا کوئی ملے جب نا؟ میں شادی صرف شادی کے لئے نہیں کرنا چاہتی ہوں، بلکہ زندگی جینے لئے۔' فاطمہ نے کہا اور سر جھکا لیا۔

لیلیٰ اس کی بات سن کر چپ ہو گئی۔ دونوں خاموش بڑے سے پلنگ نما جھولے پر جھولتی رہیں۔

'جو زندگی ملی ہے اسی کا اچھا رخ اپنی طرف کر کے جینا شروع کر دو فاطمہ۔' لیلیٰ نے کہا۔

'وہی تو کر رہی ہوں لیلیٰ۔ تم نے پوچھا تو میں اپنے کو روک نہیں پائی۔ دل کی بات زبان پر آ گئی۔' فاطمہ نے کہا۔

لیلیٰ نے اس کے ہاتھ پر پیار سے اپنا ہاتھ رکھا جیسے کہہ رہی ہو، تم نہ بھی کہتی تو بھی میں سب سمجھ سکتی

تھی۔

کل امریکہ سے آیا ندا کا خط اس کے ہاتھوں میں ہے۔ دو ماہ پہلے کا لکھا یہ خط ہے جو اس کی بچپن کی سہیلی نے کتنی پریشانیوں سے بھیجا ہے۔ جانے کس کس ملکوں کی سیر کرتا اس ہاتھ سے اس ہاتھ ہوتا ہوا اس کی بھابھی کے پاس لندن پہنچا اور انہوں نے وہاں سے اس کو پوسٹ کیا ہے۔ ندا نے لکھا ہے:

'یہاں سب ٹھیک ہے مگر بغداد بھولے نہیں بھولتا ہے۔ دجلہ کا بہنا، شام کا جھٹ پٹا اور ایک خاص خوشبو، جو صرف بغداد میں تھی، کے لئے میں تہران میں تڑپتی رہتی ہوں۔ مجھے یہاں آئے پورے چھ سال ہو گئے ہیں۔ یقین کرو، سر کا درد پیچھا نہیں چھوڑتا ہے۔ علاج لگاتار ہو رہا ہے، مگر اب تک کل ملا کر پندرہ بیس کلو وزن کم ہو گیا ہے۔ یہاں پر ایک چھوٹی سی نوکری اور گھر مل گیا ہے۔ سب لوگ ٹھیک ہیں، بھابھی جانے کس کس ترکیب سے لندن سے پیسہ بھیجنے میں کامیاب ہوتی ہیں، ورنہ اتنی کم آمدنی میں گزر ہونا بہت مشکل ہے۔ یہاں والے بھی کیا کریں۔ ان کی مالی حالت بھی تو دم توڑ رہی ہے۔ اوپر سے خوجستان سے آئے ریفیوجی، افغانستان سے بھاگے ہوئے مجاہدین، بیٹھے بٹھائے تین چار ملین لوگوں کو کھانا، نوکری، گھر دینا...... خیر، یہاں کے لوگ ہمیں مسلمان نہیں سمجھتے ہیں۔ عراق...... عراق...... میں نے عراق کو کبھی اتنا پیار نہیں کیا تھا جتنا مجھے ایران میں آکر اس سے ہو گیا ہے۔ وطن کی دوری کیا ہوتی ہے، اس کا اندازہ تو صرف وہی کر سکتا ہے جس کا دانہ پانی اس کی زمین سے اٹھ گیا ہو۔ مسلم بھائی چارے کی باتیں تو صرف باتیں ہیں، اور بس۔'

'ہاں، تمہیں ایک خبر دینا بھول گئی۔ لکھتے ہوئے بھی عجیب سا محسوس ہو رہا ہے۔ ہمارے گھر کے سامنے جو بڑا سا خاندان رہتا تھا، یاد آیا، جن کی پانچ لڑکیاں، چار لڑکے تھے، ان کا بڑا لڑکا حسن تھا۔ وہ عراق سے ہمارے ساتھ ہی آنے والے قافلے میں تھا اور یہاں آتے ہی ایرانی اسلامی فوج میں بھرتی ہو گیا۔ کل یہاں ٹی وی پر اس کی اور دیگر فوجیوں کی تصویریں دیکھیں۔ وہ بصرہ کے نزدیک مجنون جزیرے میں قید کر لیا گیا ہے۔ عجیب بات ہے۔ ہمارے رہبر، ہمارے لیڈر ہمارے بارے میں فیصلہ کرتے ہیں کہ ہمیں کہاں جانا ہے، کہاں رہنا ہے، کیا کرنا ہے۔ ہم کتنے مجبور اور بے بس ہیں ان فیصلوں کے آگے! میرا بس چلے تو میں آج ایرانی پاسپورٹ پھاڑ کر عراق بھاگ آؤں۔ دیکھو، حسن اپنے ملک میں غیر ملکی قیدی بن کر رہ رہا ہے اور میں ان چند سالوں کے بعد بھی تہران کو بغداد نہ سمجھ

سکی۔ ہمارے باپ دادا کبھی ہوں گے ایران کے مگر ہم تو خالص عراقی تھے۔ یہ تاریخی مار، یہ صدیوں پہلے کے معاہدوں کا حساب ہم سے کیوں لیا جارہا ہے لیلیٰ؟ صرف ایک دل کی خواہش، ایک دماغ، خیال کتنے جسموں کو اپنی سرحد سے پرے دھکیل دیتا ہے۔ کتنے دلوں کو کاٹ کر رکھ دیتا ہے۔ خدا نہ کرے، یہ دن دشمن کو بھی دیکھنا نصیب ہو جو ہم نے دیکھا ہے۔'

لیلیٰ نے جانے کتنی بار خط پڑھا۔ ہر بار اس خط کے مطلب نئے لباس میں اسے نظر آئے۔ ندا وہاں پر کس وجہ سے بلک رہی ہے اور ہم یہاں اپنی سرحد کے گھیرے میں گھرے کس درد سے تڑپ رہے ہیں۔ اسے کیا پتہ کہ اس کی لیلیٰ کے لئے حسن کوئی اجنبی نہیں ہے، بلکہ اس کا اپنا تھا۔ اچھا ہوا یہ بات زمانہ نہ جان سکا اور وہ رشتہ پھلنے پھولنے سے پہلے ہی دم توڑ گیا ورنہ آج تو صرف میں اپنے آگے مجرم ہوں، گناہگار ہوں، تب دوسروں کے سامنے بھی گناہگار ہوتی اور تنقید کی صلیب پر چڑھی ان کے سامنے نظریں بھی نہ اٹھا سکتی۔

خط کو آخری بار پڑھ کر اس نے تہہ کیا اور لفافے میں رکھتے ہوئے سوچا، 'تمہیں کیا لکھوں جواب میں؟ دکھ کے بیان کے سامنے کبھی کبھی الفاظ اور زبان بھی گھٹنے ٹیک دیتے ہیں۔ وہ الفاظ ابھی ایجاد نہیں ہوئے ہیں جو دل کے جذبے کے صحیح ترجمان ہوں۔ میری خاموشی ہی اس کا بیان ہے ندا۔ اس سے زیادہ تم سے کیا کہوں۔' میز کی دراز میں خط رکھ کر وہ اٹھی اور بالکونی میں آکر کھڑی ہو گئی۔

شام، رات کے گلے مل رہی تھی۔ دونوں وقت ملنے کا یہ سرمئی جھٹ پٹا شہر کے کونوں، درختوں کی شاخوں اور دجلہ کے سینے پر لپٹنے لگا تھا۔ آسمان صاف تھا جس کا سانولا چہرہ اونچے ستونوں پر لگے چراغوں کے رنگین ہالوں سے بھر گیا تھا۔ نیلی، گلابی روشنی کی بل کھاتی لکیر افق تک پھیلی ہوئی تھی۔ انہیں قمقموں پر ٹکی لیلیٰ کی آنکھیں کسی سے مخاطب تھیں:

'کیا سچ مچ تم یہیں ہو؟ دل کو یقین نہیں آتا ہے۔ سنو! تمہارا یہاں لوٹنا...... یہ جان کر مجھے جانے کیسا لگ رہا ہے——اچھا یا برا؟ شاید کچھ بھی نہیں۔ لیکن جو محسوس کر رہی ہوں وہ احساس عجیب ہے، ایکدم اجنبی۔ اسے کوئی نام نہیں دے پاؤں گی۔

'ہواؤں نے بار ہا مجھے تمہارے آنے کا پیغام دیا تھا اور میرے دل کے دروازے پر بے تحاشہ دستکیں بھی دی تھیں، مگر میں ہر بار اسے تمہاری یاد کی آہٹ سمجھی۔ آہٹ سن کر اپنے دل کا دروازہ کس کے

لئے کھولتی؟ تمہارے لوٹنے کا انتظار بھی تو نہ تھا۔ اتنے دنوں تک میں نے دل کے دروازے کو زبردستی بند کر رکھا تھا۔ مجھے خوف تھا کہ وہ سارے ارمان بھرے پرندے کہیں بیتاب ہو کر اڑ نہ جائیں جنہیں برسوں سے میں نے اس دل کے پنجڑے میں قید کر رکھا تھا۔

'یہ ضدی پرندے پنجڑے کے تاروں کو توڑ کر اڑنے کے لئے بیچین ہیں کہ میں ...... میں تم سے ملوں، مگر یہ نادان کچھ نہیں جانتے ہیں۔ یہ تو اس حقیقت کو بھی نہیں جانتے ہیں کہ اب تم سے ملوں تو کس رشتے سے؟ کس لئے؟ ارے دل بیتاب، ٹھہر تو، تجھے کیا پتہ اب ہماری پہچان کی مہریں بدل گئی ہیں۔ ہماری زمین الگ الگ سرحدوں کے کٹیلے تاروں سے گھر گئی ہیں۔ دشمن معشوق نہیں ہوتا ہے۔ دشمن عاشق نہیں ہوتا ہے۔ دشمن کی ایک ہی پہچان ہوتی ہے۔ وہ ہے اس کا فقط دشمن ہونا۔

'اب اس اجنبی زمین پر جانے کی ضدمت کر۔ ان پیام آمیز ہواؤں کو مایوس لوٹا دے جو تمہاری آمد کی اطلاع بار بار مجھے دے رہی ہیں۔ ان کو دینے کے لئے نہ میرے پاس کوئی پیغام ہے، نہ شکوہ، نہ کوئی طعنہ ہی۔ دل بیتاب، سنبھل تو...... ان دستکوں کا شور سچ مچ جان لیوا ہے ...... کتنی بیچینی...... کتنی تڑپ......'

'کھانا کھالو لیلیٰ...... ٹھنڈا ہو رہا ہے۔' ماں نے کئی آوازیں دیں، پھر تھک کر اسے بلانے آگئی تھیں۔ لیلیٰ کو جیسے ہوش آگیا تھا۔ ماں کے ساتھ جا کر وہ خاموشی سے کھانے کے سامنے بیٹھ گئی۔ ماں نے پنیر اور کالی زیتون لیلیٰ کی پلیٹ میں رکھی، پھر سالن نکالنے لگیں۔

'یہ کیا، کہاں چلی؟ کیا کھانا کھا چکی؟' ماں نے تعجب سے پوچھا۔

'بھوک نہیں ہے۔' لیلیٰ نے بے دلی سے کہا۔

'آدھی روٹی کی بھی بھوک نہیں تجھے؟ ہر حال میں انسان کو خدا کا شکر ادا کرنا چاہئے۔ کبھی تیرے آگے پیچھے نوکروں کی فوج تھی۔ مگر اب تیری ماں تیری خدمت کو حاضر ہے روکھی سوکھی روٹی کے ساتھ۔' ماں کے چہرے پر اچھے دنوں کی پرچھائیاں اور موجودہ زندگی کی تنگی کا دکھ ابھر آیا تھا۔

'کیسی باتیں کر رہی ہو ماں! بس یوں ہی ذرا بھوک نہیں تھی۔' لیلیٰ نے شرمندہ ہوتے ہوئے کہا۔

'بھوک ایک وقت نہیں لگتی، دوسرے وقت تو لگتی ہے، مگر تجھے تو بارہ مہینے یہی بیماری ستاتی ہے۔ وہ زندہ تھے تو کیا نہیں تھا ہمارے پاس۔ سب کچھ تھا۔ آج نہیں ہیں تو ان کا دیا سکھ بھی ہم سے روٹھ گیا۔ حاکم بدلتا ہے تو لوگوں کی قسمتیں بھی بدلتی ہیں — میری تو ایک ہی اولاد ہے، اس کا...... 'ماں کا چہرہ موٹے موٹے آنسوؤں سے تر تھا۔

'ماں، خدا کے واسطے بس کرو۔ تمہیں میری جان کی قسم۔ تم جتنا کہو گی میں اتنا کھاؤں گی...... خدارا! آنسو مت بہاؤ ماں!' کہہ کر لیلیٰ ماں سے لپٹ گئی۔

آج برسوں بعد چھوٹی سی بچی کی طرح وہ ماں سے لپٹی لیٹی ہے۔ ماں سو گئی ہے۔ اس کی آنکھوں میں نیند نہیں ہے۔ نیند تو جیسے اس سے روٹھ گئی ہے۔ منانے پر بھی نہیں آتی ہے۔ وہ دھیرے سے ماں سے الگ ہوئی۔ پھر آہستہ سے اٹھ کر بیٹھی اور بڑی خاموشی سے بالکونی پر جا کر کھڑی ہو گئی۔

شہر کی چہل پہل دم توڑ چکی تھی۔ ننگی سڑکیں سروں پر روشنی کی قندیلیں اٹھائے اداس کھڑی تھیں۔ ان پر بھاگنے والے تھک کر اپنے گھروں میں جا کر میٹھی نیند میں سوئے ہوئے ہیں۔ کل کی دوڑ کا خواب دیکھتے ہوئے سوتے میں بھی ہنستے ہوں گے، کبھی روتے ہوں گے۔ میری طرح راتوں کو جاگ کر کون سوچتا ہو گا؟ نیند بھی کتنی قیمتی شئے ہو گئی ہے میرے لئے۔ لیلیٰ نے ٹھنڈی سانس بھری اور آسمان پر نظر ڈالی۔

'تم اس وقت کیا کر رہے ہو گے بھلا؟ اس شہر میں، اس ملک میں۔ ان سڑکوں پر، پورب سے پچھم، اتر سے دکھن چاروں سمتوں کے سفر تم نے کئے ہیں۔ اس زمین کے موسموں نے تمہیں سہلایا ہے۔ بہتوں نے تمہیں گودیوں میں کھلایا ہے۔ تم اس تنگ چہار دیواری میں بیٹھ کر کیا سوچ رہے ہو گے؟ کیا اس زمین نے تم سے کچھ سوال کیا کہ آخر تم نے اس کے خلاف ہتھیار کیوں اٹھایا؟

'آج اماوس ہے۔ رات کی سیاہی نے اپنی سیاہ آغوش کھول دی ہے۔ چاہت کے چاند نے بھی آج جانے کہاں منہ چھپا لیا ہے۔ کھجور کے درخت اندھیرے میں ڈوب گئے ہیں۔ دجلہ بہہ رہی ہو گی روز کی طرح، مگر آج اس کے سینے پر روشنی کی کوئی جھلملاہٹ نہیں ہے۔ اس کے بہنے کی آواز مجھ تک

نہیں پہنچ رہی ہے۔ جیسے ساری کائنات کو نیند آ گئی ہو...... مگر میرے دل میں جانے کون سا طوفان سر اٹھا رہا ہے؟

'سنو! میں اپنے دل کا دروازہ کھول رہی ہوں۔ ان ارمان بھرے پرندوں کو ایک ایک کر کے اڑ جانے دوں گی ورنہ یہ دل ان قیدی پرندوں کا مقتل بن جائے گا۔ دیکھو! دم توڑتے معصوم پرندے کیسے پر پھڑپھڑاتے ہوئے کھلے کالے آسمان کی سیاہی کی طرف اڑنے لگے ہیں جہاں ستاروں نے بھی اپنی آنکھیں بند کر لی ہیں۔ بس، اوپر سیاہی میں پرندوں کی اڑان کا شور ہے جو مجھے بتا رہا ہے کہ احساس کی تاریخ نے آج نئی کروٹ لی ہے اور نیچے دل کا شہر خاموش ہے۔'

صبح کی اذان کی آواز سے وہ جاگی۔ چڑیوں کی چہچہاہٹ سے فضا گونج رہی تھی۔ سامنے نکلتے سورج کی لالی شہر کو گلابی رنگ بخش رہی تھی۔ زندگی کی چہل پہل شروع ہو گئی تھی۔ لیلیٰ نئے اگتے شہر کی پیدائش کو دیکھ رہی تھی۔

'اب میرے دل میں کسی بھی مختلف جذبے کا آپسی ٹکراؤ نہیں۔ بس، ایک ہی جذبہ ہے۔ وہ ہے نفرت کا۔ اگر میں گناہ سے نفرت نہ بھی کروں تو مجھے اس گناہ کا کفارہ تو ادا کرنا ہی پڑے گا۔ میرا یہ سیاہ لباس اب مجھ سے جیتے جی جدا نہیں ہوگا۔ پہلے یہ میرے بابا کے غم کا ترجمان تھا اور آج اس گناہ کا، جو میلوں تک قبروں کو بناتا چلا گیا ہے۔ ان سب کی جدائی کا غم اس سیاہی میں سمٹ گیا ہے۔ سنو! تم مجھے گناہ کا سبق دے کر کہیں نہیں کھوئے تھے، بلکہ میرے اس سیاہ لباس میں ڈوب گئے ہو حسن، جس میں ہزاروں اماوس کی کالی راتوں کی سیاہی کے داغ ہیں۔'

جہاں نما

نبیلا کی دنیا اب اتنی چھوٹی نہیں رہ گئی تھی جو اس کے دل کے گھیرے اور گھر کی چہار دیواری میں قید رہ پاتی اور نہ اس کے دماغ کا دائرہ اتنا تنگ تھا جو نقشے کے سینے پر ایک نقطہ بن کر ابھر پاتا اور محض اس کی ایک محدود پہچان کا نشان بن جاتا۔ جدو جہد کے بدلتے تیور کے ساتھ اس کے پیروں میں پہیے لگ گئے تھے۔ ملک بھر میں گھومتی اور غیر ملکوں سے اڑتی ہوئی وہ ہر چھوٹی بڑی انسانی آبادی کو اپنے قلم سے ناپتی ہوئی کشمکش کے صلیب کو اٹھانے کی ذمہ داری برسوں پہلے سنبھال چکی تھی۔ ایسی حالت میں گزری زندگی کی طرف دوبارہ مڑنا اور چلے ہوئے راستے پر پڑے اپنے قدموں کے نشانات پر قدم جمانا نبیلا کو بے معنی لگ رہا تھا۔ نبیلا کو تعجب ہو رہا تھا کہ اتنی سی بات کمال جیسا آدمی بھی سمجھنے سے انکار کر رہا ہے، آخر کیوں؟

نبیلا جب اپنے چھوٹے سے فلیٹ کا تالا کھول کر اکیلے گھر میں داخل ہوتی تو اس کو محسوس ہوتا کہ وہ ایک پرندہ ہے جو نیلے آسمان کی اونچائیوں کو طے کرنے کے بعد تھکا ہارا رات بسر کرنے اپنے گھونسلے میں لوٹا ہے۔ مگر آج کمال کی باتیں سن کر اس کو محسوس ہوا کہ وہ پرندہ ہرگز نہیں ہے۔ صرف اڑنا ہی تو اس کی پہچان نہیں ہے۔ پرندہ پابندیوں کے خلاف کھڑا نہیں ہوتا ہے۔ سیاست سے پیدا ہوئے سڑے نظام میں وہ دم نہیں توڑتا ہے اور نہ ہی رشتوں کے بدلتے تقاضوں کی مار کھاتا ہے اور نہ ہی اپنے فرض کو پہچانتا اور اپنے اختیارات کے لئے لڑتا ہے۔ وہ تو اپنے تجربات سے کچھ سیکھتا بھی نہیں ہے، بلکہ چڑی مار کے ذریعہ پکڑے جانے اور پنجڑے کی قید کی چھٹپٹاہٹ میں بھی وہ چہچہانا نہیں چھوڑتا ہے۔ مگر انسان، وہ تو تجربات کی مختلف سیڑھیوں سے گزرتا ہوا بہت کچھ بے معنی جان کر پیچھے چھوڑتا ہوا بہت کچھ بامعنی سمجھ کر سیکھتا، اپنے کو وسعت دیتا، مسلسل ایجادات کی دنیا میں آگے بڑھتا جاتا ہے۔ ایسی حالت میں وہ ناتجربہ کار پرندہ نہیں ہے، بلکہ ایک سخت جان انسان ہے جو ہر ظلم کے خلاف آواز اٹھانا جانتا ہے۔

کمال کو گئے ہوئے آدھا گھنٹہ گزر گیا تھا۔ شام گھر آئی تھی۔ سورج کا ملائم پیلا آنچل کمرے کی دیوار سے سرک رہا تھا۔ دیواروں پر لگی تصویریں، کتابیں، مجسمے اور سجاوٹ کے دوسرے سامانوں کے رنگ اس روشنی میں جگمگا اٹھے تھے۔ یہ سارے آرٹ کے نمونے اس کے آرٹسٹ دوستوں کے تھے جو اس تنہائی میں اپنے رنگوں و پیکروں سے ایک خاموش گفتگو نبیلا سے قائم کئے ہوئے تھے۔

رات کے بڑھتے سائے کمرے میں چھپنے لگے تھے۔ نبیلا نے اٹھ کر بتی جلائی اور سڑک کی طرف کھلنے والی کھڑکی کے پٹ بند کئے۔ اپنے لئے قہوہ بنایا اور میز پر بکھرے اخبار کی کترنوں پر سرسری نظر ڈالتے ہوئے سوچنے لگی کہ ہر انسان کی زندگی کی اپنی شکل و صورت ایک وقت کے بعد پختہ شبیہ اختیار کرلیتی ہے۔ کیا دوسرے کی خواہشات کے مطابق اس میں بنیادی تبدیلی بار بار لائی جاسکتی ہے؟ زندگی جینے والا انسان رشتوں کی وضع کردہ تشریح کو کیا بار بار بدل پاتا ہے، پھر......؟

رات آدھی سے زیادہ گزر چکی تھی۔ لیمپ کی روشنی کے نیچے کمال کا سر جھکا تھا اور ہاتھ میں پکڑا قلم تیزی سے چل رہا تھا۔ نبیلا نے اپنا مضمون ختم کرلیا تھا اور اب وہ سونے کی تیاری کر رہی تھی۔ دروازے کی گھنٹی بجی۔ کمال نے سوالیہ نظروں سے نبیلا کو دیکھا۔ اس وقت کون ہو سکتا ہے؟ وہ کرسی سے اٹھا اور دروازے کی طرف بڑھا۔ نبیلا نے جھپٹ کر کھڑکی کا پردہ ہٹایا اور باہر جھانکا۔ چھوٹا سا گھر کا احاطہ پولس دستے سے گھرا ہوا تھا۔ آواز گھٹ گئی۔ ماتھے پر پسینہ چھلک آیا۔ کانپتی ہوئی مڑی کہ آنے والے خطرے سے کمال کو خبردار کرے، مگر تب تک کمال دروازہ کھول چکا تھا۔

کمال اور نبیلا مزدور یونین کے کارکن تھے اور اپنا ایک اخبار بھی نکالتے تھے۔ انتظامیہ کی نکتہ چینی کرتے ہوئے عوام کو سچ بتاتے اور آگے بڑھنے کا راستہ بھی دکھاتے تھے۔ ترکی کے فوجی نظام میں اس کی گنجائش کہاں تھی۔ اس بیباک بیانی کا جو انجام ہونا تھا، وہ ہوکر رہا۔ کمال کو پولس اپنے ساتھ لے گئی اور نبیلا کو گھر میں نظر بند کر دیا گیا۔ فون ٹیپ ہوا اور آنے جانے والوں پر کڑی نظر رکھی جانے لگی تھی۔

ایک مہینہ کمال جیل میں رہا اور اس پابندی بھرے ماحول میں اخبار نکالنا نبیلا کے لئے چنوتی بن گیا۔ سر جھکانے اور خاموش بیٹھنے کا مطلب تھا ظلم کی دھار کو تیز کرنا۔ پھر کمال کے لئے یہ کوئی پہلی بار تو

تھا نہیں کہ نبیلا سوگ منانے بیٹھ جاتی۔ اب تک اس کے کئی چکر جیل خانے کے لگ چکے تھے۔ یہ سب کچھ سوچ کر نبیلا نے 'شب نامہ' خود اکیلے لکھ کر رات کو بانٹنا شروع کر دیا، مگر دوسرے ہی دن اخبار کے نام پر ہاتھ سے لکھے 'شب نامہ' کے دو صفحے، بازار میں اپنے ساتھی سے ہاتھ ملانے کے بہانے دیتی ہوئی پکڑی گئی۔ دونوں جیل میں ڈال دیئے گئے اور باقی ساتھی وقت کی نزاکت دیکھتے ہوئے زمین دوز ہو گئے۔

نبیلا کے لئے جیل میں رہنا کوئی خوشگوار تجربہ نہیں تھا۔ خاص کر تب جب وہ سیاسی قیدی ہوں۔ سیاہ، بیکار دن، ظلم کی بیہودہ حرکتیں کسی کو بھی وقتی طور پر اپاہج بنانے میں کامیاب ہوتی ہیں، مگر خاموش لمبی راتوں میں نبیلا کو بہت سی ایسی باتیں سمجھ میں آئیں جنہیں دوڑتے بھاگتے ہوئے سمجھنے کا وقت نہیں ملا تھا۔ اس پتھر کی چہار دیواری نے اس کے دماغ کو پہلے سے کہیں زیادہ وسیع پیمانے پر ہتھیار بند بنایا۔ دو برس بعد جب نبیلا کو آزاد کیا گیا تو ملک کی فضا بدل چکی تھی۔ پابندی کے سیاہ بادل زیادہ کالے ہو کر اور نیچے اتر آئے تھے، جن کے بیچ چمکتی بغاوت گھنگھور بارش کی اطلاع دی رہی تھی۔

کمال نبیلا سے چھ مہینے پہلے ہی جیل سے باہر آ گیا تھا اور اکیلا بیماری جھیلتا ہوا صحت کے نام پر بالکل ٹوٹ چکا تھا۔ مالی حالت الگ خستہ تھی۔ نبیلا جس جوش کو سینے میں دبائے جیل خانے سے باہر آئی تھی، کمال کی حالت دیکھ کر سینے میں ہی گھٹ کر رہ گئی تھی۔ کچھ دنوں بعد جب کمال ٹھیک ہونے لگا تو نبیلا نے اخبار کی بات اٹھائی اور یونین کی سرگرمی بتاتے ہوئے اس کو یقین دلایا کہ وہ اکیلے سارا کام سنبھال لے گی۔ وہ فکر نہ کرے۔ مگر جب کمال نے ایک دن بہت اوبے لہجے میں کہا — 'میں اب اس آنکھ مچولی کے کھیل سے تھک چکا ہوں۔ سال دو سال جیل میں گزارو اور چھ سات مہینے باہر رہو۔ سچ پوچھو تو میں اب اس طرح کی زندگی نہیں گزار سکتا۔ ساری زندگی جدوجہد میں گزاری، اب مرنے سے پہلے چند سال آرام سے گزارنا چاہتا ہوں، کچھ اور کام کرنا چاہتا ہوں۔'

'اس کام کے علاوہ ہم اور کیا کر سکتے ہیں کمال؟' نبیلا ہنسی۔

'اپنی یہ زندگی بھی کوئی زندگی ہے؟ اتنا کچھ کرنے کے بعد ہم کچھ بدل پائے؟' کمال نے ٹوٹتی آواز میں کہا۔

'کچھ بدلا کیوں نہیں ہم نے؟ سسٹم نہ سہی مگر دماغوں کو روشن تو کیا ہے۔ کل وہ دن بھی آجائے گا

جب ہمارے نظام میں بدلاؤ آئے گا۔' نبیلا اس کے تھکے دل میں حوصلہ بھرنے لگی۔

'وہ دن تب آئے گا جب ہم نہیں ہوں گے۔ اس لئے سوچتا ہوں، جدوجہد کا یہ بوجھ دوسرے اٹھائیں۔ ان کا بھی فرض بنتا ہے۔ ملک کی ذمہ داری صرف ہم پر کیوں؟' کمال کی آواز بدل گئی۔

'آج کیسی الٹی سیدھی باتیں کر رہے ہو کمال؟' نبیلا نے کہا۔

'میں اب آرام وہ زندگی چاہتا ہوں۔ اتنی دولت کمانا چاہتا ہوں کہ تمہاری خواہشیں پوری ہوں اور ہم بڑھاپا سکھ سے کاٹ سکیں۔ مجھے بھی گھر چاہئے، بچے چاہئے، پوتے اور نواسے چاہئے۔ اس ریگستان جیسی زندگی میں مجھے پیاس شدت سے لگ رہی ہے۔ مجھے ٹھنڈا سایہ چاہئے اور میٹھی نیند...... کب سے نہ چین سے سویا ہوں نہ آرام سے بیٹھا ہوں۔' کمال نے کہا۔

'کیسی عجیب باتیں کر رہے ہو کمال۔ یہ تمہاری سوچ نہیں ہے۔ سچ پوچھو تو اب سہی مزہ آیا ہے جدوجہد کو آگے بڑھانے کا۔ محنت کا پھل سب کے ساتھ مل کر کھائیں اور سب کے ساتھ آرام کریں گے۔ ہمارا گھر اور بچے بھی ہوں گے۔ ہم اپنی زندگی کو ہر خوشی سے سجائیں گے۔ سچ پوچھو تو دکھ کے دن اب کٹنے والے ہیں۔ اچھا، یہ بتاؤ کہ اخبار...... نبیلا بولی۔

'اخبار......؟ میں لفظوں کی سیاہی سے اوب چکا ہوں۔ مجھے اب دوسرے رنگ بھلے لگتے ہیں۔ بہت تھک گیا ہوں۔ زندگی کی اس آہ وبکا سے......' نبیلا کی بات بیچ میں کاٹ دی کمال نے۔

'دلدل کو پار کر کے جب ہم ٹھوس زمین کی طرف بڑھ رہے ہیں تو تمہارے پیر جمنے کی جگہ اکھڑ کیوں رہے ہیں؟ نبیلا کی آنکھیں خوف زدہ سی کمال کے چہرے پر ٹنگ گئیں۔

'تم کوئی ہلکا پھلکا عورتوں والا کام چن لو، میں بھی کسی ایسے بزنس کی کھوج خبر لیتا ہوں جس میں دولت آسانی سے کمائی جاسکے، کیونکہ نوکری تو ہمیں ملنے سے رہی۔' کمال نے فیصلہ سنانے والے انداز میں کہا۔

'کسی اور کام، کسی دوسری زندگی کا خیال میرے لئے ناممکن ہے۔' کہتی ہوئی نبیلا پوری طرح ٹوٹ

گئی۔ وہ کمال کو اچھی طرح سے جانتی تھی۔ اس کے فیصلے نہ بدلتے ہیں اور نہ کہی بات کو وہ واپس لیتا ہے۔ بہت کچھ سوچ سمجھ کر کسی نتیجے پر پہنچ کر ہی وہ فیصلے سناتا ہے۔ ایسی حالت میں عبیلا کا کیا فرض بنتا ہے؟ کمال کو ڈوبنے دے یا خود مضبوطی سے پتوار پکڑے رہے؟ کیا کرے آخر وہ؟ سیاسی کالے بادل اب اس کی ذاتی زندگی پر بھی چھانے لگے تھے۔

برسوں پہلے محلے کا وہ دبلا پتلا لڑکا اپنے بڑے بڑے بالوں اور دھواں دھار بولنے کے سبب اپنے ساتھیوں میں بہت ہر دلعزیز تھا۔ موٹی موٹی بالوں سے بھری بھوں کے نیچے کالی گہری، بڑی بڑی آنکھیں جس کے چہرے پر ٹک جاتی تھیں، وہ اپنے کو اندر ہی اندر پگھلتا محسوس کرتا تھا۔ اس کے سامنے جھوٹ بولنے کی ہمت کسی میں نہیں تھی۔ شام کے جھٹ پٹے میں وہ عبیلا کے بھائی سے ملنے آتا اور بند کمرے میں اپنی گہری آواز میں گرم گرم لفظ اگلتا کہ 'یہ فوج، یہ گولی، ہمارے جوانوں کی دشمن، ہمارے بہترین دماغوں سے نفرت کرنے والا ایک سسٹم ہے جو اپنے ہی بچوں کا خون پیتا ہے۔ ان کے ملائم گوشت سے اپنی بھوک مٹاتا ہے۔ اب ہم ان کے خلاف کھڑے نہیں ہوئے تو سمجھو، ہماری آنے والی نسل پیدا ہونے سے انکار کرے گی۔ تب صرف فوج بچے جنم دے گی جن کے منہ سے بارود کی مہک آئے گی اور جو آتش بازی کی طرح ہمارے آنگنوں میں چھوٹیں گے، موت اور زندگی کے بیچ صرف بناوٹی بارودی پھولوں کی روشنی ہوگی۔'

اسی لڑکے کی وجہ سے اکثر لڑکیاں کسی نہ کسی بہانے عبیلا کے گھر کے چکر لگاتی تھیں۔ لڑکیاں ہی اس پر اکیلے نہیں مرتی تھیں، بلکہ لڑکے تک اس کی رعب دار شخصیت سے متاثر تھے۔ دھیرے دھیرے ایک زیر زمین انقلابی محاذ اپنی شکل لینے لگا، جس کو سمت دینے والا یہی انقلابی لڑکا تھا۔ عبیلا کو سیاست سے نفرت تھی۔ باقی لڑکیوں کی طرح اس کے بھی نرم رومانی جذبات تھے۔ لڑنا، پڑھنا اور اپنے کو ظاہر کرنے کا کام وہ لڑکوں کا ہی سمجھتی تھی۔ اس لئے دوسری لڑکیوں کی طرح اس لمبے بالوں والے لڑکے کو دیکھ کر اس کے دل میں بھی گدگدی ہوتی تھی۔ وہ لڑکا اتنا مغرور تھا کہ لڑکی تو دور، لڑکے کی طرف بھی نظر اٹھا کر دیکھنا پسند نہیں کرتا تھا۔ وہ تو بس جانے کس دنیا میں ڈوبا رہتا تھا۔

وقت پانی کی طرح بہتا رہا۔ راکھ میں دبی چنگاری کی طرح وہ جذبہ عبیلا کو دھیرے دھیرے آنچ دینے لگا۔ کیا کرے عبیلا؟ اس تک پہنچنا اور اس کو پانے کے خواب کو کیسے شرمندہ تعبیر کرے؟ چنگاری آگ

بی اور لپٹوں میں جھلستی تپتی نبیلا نہ چاہنے پر بھی سیاست کی باتوں میں دلچسپی لینے لگی، کیونکہ یہی وہ راستہ تھا جس پر چل کر وہ اس انقلابی لڑکے کا ساتھ چند لمحوں کے لئے حاصل کر سکتی تھی۔ کچھ دنوں بعد وہ بھیڑ کا حصہ نہیں رہ گئی تھی، بلکہ جوان بھیڑ کی توجہ کا مرکز بن گئی تھی۔ اس لڑکے کی طرف بغیر دیکھے وہ انقلاب، بغاوت، پابندی پر دھواں دھار بولنے لگی تھی۔ وہ لڑکا اس لڑکی کو دیکھتا اور دیکھتا ہی رہ جاتا تھا۔ کیا لڑکیاں بھی اتنی نڈر ہو سکتی ہیں؟

نبیلا نے یہ نہیں سوچا تھا کہ وہ لڑکا ایک دن اس کا ہاتھ مانگے گا، جو اتنا سنجیدہ، مغرور اور فعال تھا۔ نبیلا کو خود نہیں پتہ تھا کہ اس نے اس جگہ پہنچ کر اس لڑکے کے دل پر دستک دی تھی جو تنہا کسی ایسے ہی شخص کا انتظار کر رہا تھا۔ دونوں نے اپنے کو ایک دوسرے کے آئینے میں دیکھا اور نبیلا نے اپنا ہاتھ ساتھی کے ہاتھ میں دے دیا۔

شادی کے بعد دونوں ایک چھوٹے سے گھر میں رہنے لگے۔ زندگی کا مقصد ایک، نظریہ ایک، نشانہ ایک اوپر سے ایک دوسرے کے تئیں گہری محبت۔ ان سب نے مل کر انہیں ایک جان دو قالب بنا دیا تھا۔ رات دن ساتھ ساتھ رہتے، پڑھتے لکھتے، بحث کرتے اور پھر ایک دن ایسا آیا کہ زیر زمین 'شب نامہ' نکلنے لگا اور کچھ دن بعد وہ حکومت کو ناکوں چنے چبوانے لگا۔ یہ تحریک جیسے جیسے زمین کے اندر دھدھکتی ہوئی پھیلنے لگی تھی ویسے ہی ویسے دونوں کی جان کا خطرہ بڑھ رہا تھا۔ حکومت سے یہ چھیڑ چھاڑ زیادہ دن نہیں چل پائی اور ایک دن اس 'شب نامہ' کے ایڈیٹر کا پتہ چل گیا۔ پہلے تلاشی ہوئی تاکہ ثبوت ملے، پھر پوچھ تاچھ اور پھر گھر میں نظر بند اور اس کے بعد جیل جانے کا نہ بند ہونے والا سلسلہ۔ جیل سے لوٹ کر دوگنے جوش سے پھر سرگرم ہو جانا اور......

وہ دبلا پتلا لڑکا کوئی اور نہیں، خود کمال ہے اور آج اس کو پہچاننا مشکل ہو رہا ہے۔ نبیلا نے آنکھوں سے گرتے آنسوؤں کو پونچھا اور سوچا، آج اس کی نجی زندگی میں بھی سخت امتحان کا وقت آ گیا ہے۔ اس کو کسی نہ کسی طرح کمال کی شخصیت کو بکھرنے سے بچانا ہوگا۔ اگر وہ ٹوٹ گیا تو پچھلے بیس برس کی جدوجہد پر بھی پانی پھر جائے گا اور کمال کو یونین، ادارہ اور جانے کہاں کہاں سے بے آبرو ہونا پڑے گا۔ کیا وہ یہ سب سہہ پائے گی؟

دن رات کے تناؤ اور دونوں طرف اپنے اپنے مقام پر اڑے رہنے کی ضد نے رشتوں میں کڑواہٹ بھرنا شروع کر دی تھی۔ منبع کا پانی اپنے بہاؤ سے زمین کو کاٹتا، پاٹ چوڑے کرنے لگا تھا۔ نبیلا کا جواز

تھا کہ عمر کے اس دور میں وہ صرف بچوں کی ماں بن کر لذیذ کھانا بنانے تک اپنے کو محدود نہیں رکھ سکتی ہے اور کمال کا جواز تھا کہ اب وہ بنجر زمین جیسی زندگی نہیں گزار سکتا ہے۔ آخر ایک دن ایسا آیا جب مسلسل سر پٹکتے، اپنا راستہ بناتے بہتے پانی نے ندی کے دونوں کنارے الگ کر دیئے۔

شادی کو ٹوٹنا تھا، وہ ٹوٹ کر رہی۔ ٹوٹنے سے پہلے عبیلا نے اپنی نسوانی انا کو ایک کنارے رکھ کر کسی دوست کی طرح کمال کو سمجھایا تھا کہ وہ ایسا قدم نہ اٹھائے۔ اس سے نہ صرف جدو جہد کو دھکا لگے گا، بلکہ عوام کا اعتماد بھی انقلابیوں اور سماج سدھارکوں پر سے اٹھ جائے گا۔ اتنے برسوں ساتھ رہ کر یوں الگ ہونا بھی کیا معنی رکھتا ہے؟ آخر کچھ سوچ کر اتنی دور ساتھ ساتھ چلے ہیں۔ ہم وفاداری بنائے بھی تو رکھ سکتے ہیں۔ مگر کمال پر تو جیسے دوسرا ہی بخار چڑھ چکا تھا۔ وہ پچھلی باتوں کو نہ سننا چاہتا تھا نہ دہرانا۔ اس کو وہ سارے آدرش کھوکھلے اور بدصورت لگنے لگے تھے۔ اس نے کھلے لفظوں میں ایک دن کہہ دیا تھا کہ ساتھ رہنے کی اپنی ایک کشش ہوتی ہے۔ جب وہ ختم ہونے لگے تو پھر ساتھ رہنے کا کیا معنی؟ ٹھیک بھی تھا۔ دل و جان کو صرف ضرورت سمجھ کر تو کہیں بھی پورا کیا جاسکتا ہے، پھر ساتھ بنے رہنے پر اتنا زور کیوں؟ یہ سب سمجھ کر عبیلا نے بغیر بغاوت کئے ایک بیوی کی طرح اس کو متنبہ ضرور کیا کہ اس فیصلے کی پوری ذمہ داری تم پر ہے۔ یہ سب تمہاری ضد کی وجہ سے ہوا ہے۔ میں تم پر بوجھ نہیں بننا چاہتی اس لئے الگ ہو رہی ہوں۔ کل اگر اس فیصلے پر پچھائے تو مجھے الزام نہ دینا کہ میں نے اس بھٹکاؤ کے دور میں تمہارا سہارا نہ بن کر اتنی آسانی سے تمہیں آزاکیوں کر دیا؟

'ایسا ہوگا نہیں عبیلا، میں تمہیں یقین دلاتا ہوں۔ پچھتاوے کا سوال کہاں اٹھتا ہے، جب میں موجودہ زندگی کے یک رنگی پن سے اکتا چکا ہوں اور چاہ کر بھی تمہارا ساتھ نہیں دے پارہا ہوں۔ جانے سے پہلے یہ سچ قبول ضرور کروں گا کہ تم آج بھی مجھے پسند ہو، مگر تم بھی میری طرح مجبور ہو۔ میری خاطر اپنے کو بدلنے کے لئے تیار نہیں ہو اور میں بھی مجبور ہوں۔ اس حالت میں میرا تم پر بوجھ بنے رہنا کہاں کا انصاف ہے عبیلا؟ بہتے رہنا ہی زندگی کی نشانی ہے۔ یقین جانو، ٹھہرا تو مر جاؤں گا اور سچائی یہ ہے کہ ابھی میں زندہ رہنا چاہتا ہوں۔'

کمال چلا گیا نئی زندگی کی طرف اور عبیلا رہ گئی پرانی زندگی کی چوکھٹ پر۔ کمال کے جانے کے بعد عبیلا کو محسوس ہوا کہ اس کے بدن کا آدھا حصہ کاٹ کر جیسے الگ کر دیا گیا ہو۔ بہت کیا، سب کچھ اپنا عبیلا

نے کمال کو سونپ دیا تھا۔ نظریہ، جذبات، وقت، عادت اور پھر اس کے بغیر رہنا کتنا مشکل تھا، یہ نبیلا کو پتہ تھا۔ وہ یہ بھی جانتی تھی کہ جو رشتہ وہ دستخط کر کے توڑ رہی ہے، اسے حقیقت میں اور مضبوط بنا رہی ہے۔ کمال سے نبیلا کا رشتہ سال، دو سال کا نہیں، بلکہ بچپن سے جوانی اور جوانی سے ادھیڑ عمر کی شروعات تک تھا۔ جب جذبات کی عمارت کے پتھر حالات کی دھوپ میں پگھل کر ایک دوسرے پر جم کر زیادہ پختہ ہونے لگے اس وقت اس زلزلے کو آنا تھا؟

انقلابیوں کے اس ہجوم میں ہر جگہ نبیلا کو کمال کے جانے کی کیفیت دینی پڑتی تھی۔ آخر وہ صرف اس کا شوہر نہیں، بلکہ زیرزمین ٹکڑی کا بنیاد ڈالنے والا ایک اہم رکن تھا۔ کچھ کامریڈ الگ سے کمال سے ملے مگر اس کے منفی انداز کو دیکھ کر غمزدہ لوٹے۔ ایسے لمحوں میں جب بے عزتی کی آگ نبیلا کو چاروں طرف سے جلا رہی تھی، اس وقت وہ سوچتی کہ اس دوہری بے عزتی کو سہنے سے بہتر تھا کہ وہ کمال کے ساتھ چلی جاتی۔ کم سے کم تب کمال کے لئے بولے گئے الفاظ بد تو وہ نہ سن پاتی۔ پھر خود اپنے کو سمجھاتی کہ میرے ہاتھ میں پتوار ہے، میں کبھی بھی کمال کو اس ناو پر سوار کر سکتی ہوں۔ وہ ڈوبنے والا انسان نہیں ہے۔ اس کو ایک نہ ایک دن میرے سہارے کی ضرورت پڑے گی۔ میں اس دن کا انتظار کروں گی۔

جدوجہد کے کھلے میدان میں کمال کی کمی پل پل نبیلا کو سدا ایک بات یاد دلاتی رہتی تھی کہ اس نے کمال کو کس قیمت پر چھوڑا ہے۔ اس لئے زندگی کے ہر پل پر وہ جدوجہد کی اہمیت کو بڑھانا چاہتی تھی۔ کام میں ڈوبتی چلی گئی۔ یہاں تک کہ چند برسوں بعد اس کو اپنی وفاداری اور قربانی میں ہی کمال حاصل ہوگیا۔

پانچ برس کا لمبا وقت گزر گیا۔ نبیلا اپنے جذبات سے لڑتے لڑتے کب کی جیت چکی تھی اور اب تو سسٹم میں بھی بدلاؤ آگیا تھا۔ اس کی جدوجہد کا پھل اسے ملا تھا۔ زیرزمین اندھیروں سے نکل کر وہ انقلابی ٹکڑی بھی کھلے آسمان کی روشنی میں مختلف سماجی کارکردگیوں میں جٹ گئی۔ سرکاری بنیاد پر کئی ساتھیوں کے ساتھ نبیلا نے ایک نیوز ایجنسی کھولی جو کھلے ماحول میں بھی اپنے تیور نہ بدل سکی اور سماجی نقاد بن کر حکومت، انتظامیہ اور قدامت پسندی پر سیدھا وار کرنے سے باز نہ آتی۔ ایسے تیور کے سبب اس ایجنسی کا وقار بڑھا اور حکومت اور عوام میں ایک ساتھ اس کو عزت کی نگاہ سے دیکھا

جانے لگا۔

نبیلا کی چھوٹی سی دنیا اپنے وجود سے گزر کر ساری دنیا کی سرحدوں پر پھیل کر سارے جہان میں بٹ گئی تھی۔ نظریہ کا رشتہ کچھ اس طرح سے مختلف دماغوں سے بنا کہ وہ تنگ گھیرے کو توڑتا ہوا نبیلا کو ایک ایسی دنیا میں لے گیا جہاں نہ مذہب کا اور نہ رنگ کا امتیاز تھا، نہ زبان کی لڑائی اور نہ سرحدوں کی سنگین بندشیں تھیں، بلکہ بین الاقوامی سطح پر انسانی سوچ اور دنیا کی آبادی میں ہر ایک انسان کا آپسی رشتہ تھا۔ سوچنے والوں کا یہ گروہ، جو نبیلا کا سروکار تھا، اب پوری دنیا میں پھیل چکا تھا اور نبیلا کے رشتے سرحدوں کی مردہ لکیروں سے اوپر اٹھ چکے تھے جس میں کوئی بھی کھلا دماغ سما سکتا تھا۔ کوئی بھی نظریہ اپنی جگہ بنا سکتا تھا۔

نبیلا کو کبھی کبھی صدر مملکت کے ساتھ ان کی صلاح کار بن کر غیر ملکی دورے پر جانا پڑتا تھا۔ کچھ ایسے ممالک تھے، ایسے مسائل تھے، جن پر نبیلا کی گہری نظر تھی۔ ادھر کام کا دائرہ بڑھ گیا تھا۔ کبھی کبھی سارا مہینہ گھومتے ہی گزر جاتا۔ بس، گھر اس لئے آتی تھی کہ اٹیچی سے گندے کپڑے نکال کر صاف کپڑے رکھ سکے۔ ایجنسی کا کام تو ہر وقت ہی کر رہی تھی اس لئے گھر سے سیدھے ہوائی اڈے ہی بھاگتی تھی۔ اپنے ملک کے صدر سے لے کر عوام کے درمیان کا یہ راستہ لمبا ضرور تھا مگر ناممکن نہیں۔ چونکہ نبیلا قلم کے زور پر اس مقام تک پہنچی تھی اس لئے اپنی کہتی تھی، دوسروں کی سنتی تھی اور عوام کی آواز میں لکھتی تھی۔

ایک دن صدر مملکت کے ذریعہ دی گئی دعوت میں اس کی ملاقات کمال سے ہو گئی جو ایک جوان خوبصورت عورت کے ساتھ کھڑا شراب پی رہا تھا۔ اتنے برسوں بعد یکایک یوں ایک دوسرے کے سامنے اپنے کو کھڑا پا کر دونوں کی سمجھ میں نہیں آیا کہ کیا کریں۔ کمال نے اپنے پاس کھڑی عورت کا تعارف کراتے ہوئے بڑی گرم جوشی سے کہا کہ 'یہ عظمہ، میری بیوی اور یہ نبیلا، ہمارے ملک کی سب سے بڑی اور سینئر صحافی ہیں۔'

'اوہ۔' عظمہ کی آنکھیں چمکیں۔ اس کے بھولے چہرے پر خوشی کا رنگ پھیل گیا۔

کمال اور عظمہ نے درخواست کر کے نبیلا سے اپنے گھر دعوت پر آنے کا وعدہ لے لیا۔ نبیلا کو سب

سے زیادہ حیرت اس بات سے ہوئی کہ آج کمال کو دیکھ کر اس کے دل کی دھڑکن بڑھی کیوں نہیں؟
بلکہ اس کی جگہ ذہنی طور پر ایک ہلچل اٹھی کہ کمال یہاں کیسے نظر آگیا؟

کمال کا گھر بیش قیمتی سامان سے بھرا ہوا جگمگا رہا تھا۔ اس نے شہر ہی نہیں، بلکہ ملک کے دولت مند تاجر کی بہن سے شادی کی تھی۔ کبھی کمال نے اپنی تحریروں کے ذریعہ اس کی سخت تنقید کی تھی اور اب انہیں کے خاندان کا فرد بنا اس کے بزنس میں ہاتھ بٹا رہا تھا جب کہ جدوجہد کے دور میں ان لوگوں نے کتنی بار کمال کو خریدنے کی کوشش کی تھی اور آج......

کمال کے گھر میں آئے مہمان ایک دم نئی طرح کے تھے، جن کو نبیلا پہلے سے نہیں جانتی تھی مگر ان کے ذریعہ ساخت کی گئی تولید اشیاء کو ضرور پہچانتی تھی۔ ان سب کے مختلف بزنس تھے۔ اس لئے بیچ بیچ میں وہ ایک عجیب زبان بولنے لگتے تھے جو شاید ان کے کام دھندے کی زبان تھی۔ سب سے زیادہ کمال بول رہا تھا۔ عظمہ کے چہرے پر سدابہار مسکراہٹ تھی اور اس کا دھیان خالی پلیٹوں اور جام کو بھرنے کی طرف لگا ہوا تھا۔

کمال نے اپنے گھر میں سجے انٹیکس کو دکھاتے ہوئے نبیلا سے داد لینی چاہی۔ پھر بلور کے جاموں سے بھری الماری کو دکھاتے ہوئے نبیلا سے دھیرے سے کہنے لگا— 'سچ نبیلا، دیر میں ہی سہی مگر میں اس مقام پر پہنچ چکا ہوں۔ پیسے میں بہت طاقت ہوتی ہے۔ اس سے دنیا کا ہر آرام، ہر خوشی خریدی جاسکتی ہے۔ تم بھی ایک دن زندگی کے کسی موڑ پر پہنچ کر میری بات کو سمجھو گی۔ زیادہ دیر مت کرو۔ نبیلا، میں اپنے تجربے سے کہہ رہا ہوں۔ کوئی ساتھی چن لو اور......'

'اس عمر میں؟' نبیلا اتنا کہہ کر مسکرا پڑی۔ پھر اس کے چہرے پر ایک سنجیدہ سختی ابھر آئی۔ شراب کا جام چند ٹکوں کا ہو یا ہزاروں کا، اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ رشتوں میں شیشے کا دام اہمیت نہیں رکھتا ہے، بلکہ اہمیت تو اس بات کی ہے کہ اس جام میں شراب کون سی ہے اور اس میں انڈیلنے والے ہاتھ کس کے ہیں۔ یہ بات نبیلا سوچنے کے باوجود کہہ نہیں سکتی تھی، کیونکہ دونوں نے اپنے اپنے سکھ تلاش کر لئے تھے۔ اپنی منزل پر پہنچ کر ایک دوسرے کو نکارنے سے فائدہ؟ اب کمال میرا تھا کون، جو میں اس

سے بحث کرتی اور میوزیم میں سجی اس بلور کی الماری کو دیکھ کر الجھ پڑتی کہ یہ بھی کوئی طریقہ ہے؟ یہ پیسہ کسی قاعدے کے کام پر خرچ کرتے تاکہ بھوکے پیٹوں کی آگ بجھ سکتی اور تم یہاں مردہ برتنوں کی دکان لگائے اپنا شوق پورا کر رہے ہو؟ نبیلا نے اس کا دل رکھنے کے لئے دل کی بات چھپا اس کی پسند کی داد دی۔ اپنی تعریف نبیلا کے منہ سے سن کر کمال کا حوصلہ بڑھا اور کھانے کی میز تک پہنچتے پہنچتے اس کی آواز میں ایک غرور بھری اتراہٹ نے لی جو کھلے عام اس بات کا اعلان کر رہی تھی کہ دیکھو، میں کتنا سکھی ہوں۔

نبیلا کو جھوٹی تعریف کرنے کا دکھ تھا۔ لوٹتے ہوئے وہ سوچ رہی تھی کہ کمال کے گھر آکر اور اس سے مل کر اس نے اچھا نہیں کیا۔ سچ ہے، انسان اپنے حالات کا نمونہ ہوتا ہے، مگر کمال مجبور تو نہیں تھا۔ اس نے اپنی پسند سے یہ زندگی اپنائی ہے اور اپنے کو بدل ڈالا۔ آج کا کمال ایک حقیقت ہے تو پھر گزرے کل والا کمال کون تھا، صرف خواب، وہم یا پھر......

نبیلا کو کمال سے مل کر ایک احساس متھتا رہا کہ آخر وہ کمال کی زندگی میں کیا تھی اور کمال حقیقت میں اس کی زندگی میں کیا تھا؟ کیا ان کا عشق محض ایک پھول کا پراگ تھا جسے کمال من چاہے انداز سے جیتا رہا اور جب اس نے تبدیلی چاہی تو اپنا نظریہ بدل ڈالا۔ عظمہ کے صنعت کار باپ کی مخالفت میں کمال نے کتنے ورق سیاہ کئے تھے اور آج انہی کے دسترخوان پر بیٹھا ان کا نمک چکھ رہا ہے اور میں پچھلے پانچ برس میں اس کو لمحہ بھر کے لئے بھلا نہ پائی۔ اس کو سارے جہاں میں پھیلا کر اپنے کو اس میں پانے لگی تھی۔ اس انتظار میں کہ ایک دن کمال لوٹ کر آئے گا اور میں پتوار پکڑے کھڑی رہی مگر اب انتظار بے معنی تھا۔

پانچ چھ برس اور دبے پاؤں نکل گئے۔ نبیلا کمال کو لگ بھگ بھول چکی تھی۔ یاد رکھنے کو نبیلا کے پاس دیگر مسائل کا ذخیرہ تھا۔ نئے پرانے کھلے محاذوں اور انسانی پریشانیوں اور غلط سیاست کے دہکتے لاوے کے درمیان اس کا اپنا کوئی نجی مسئلہ نہیں رہ گیا تھا۔ جو کچھ تھا اب وہ دوسروں کا دکھ تھا۔

ایک دن نیوز ایجنسی سے گھر لوٹ کر نبیلا اپنے لئے قہوہ بنا رہی تھی، تبھی دروزے کی گھنٹی بج اٹھی۔ اس وقت کون ہو سکتا ہے؟ سوچتی ہوئی نبیلا دروازے کی طرف بڑھی۔ دروازہ کھولا۔ سامنے کمال کو

کھڑا پایا۔ پہلے سے تھکا اور مرجھایا ہوا مگر قیمتی کپڑوں سے سجا کسی رئیس زادے کی طرح منہ سے سگار دبائے کھڑا تھا۔

'تم؟ اندر آؤ۔' اپنی حیرت کو استقبال کے پردے میں چھپاتی ہوئی نبیلا دروازے کے ایک طرف کھڑی ہوگئی تاکہ کمال کمرے میں داخل ہوسکے۔

'عظمہ نہیں آئی ساتھ؟' دروازہ بند کرتے ہوئے نبیلا نے پوچھا۔

'وہ بچوں کے ساتھ مہینہ بھر پہلے یورپ گئی تھی۔' تھکی ہوئی آواز میں کمال نے کہا اور کمرے کے بیچ میں کھڑے ہوکر اس کا ایک جائزہ لیا۔

'اتنے سالوں میں...... گھر جیسا تھا، بالکل ویسا آج بھی ہے۔' کمال کی آواز میں حیرت تھی۔ تصویریں، کتاب، مجسمے پر سے پھسلتی اس کی نظر صوفے کے پاس ایش ٹرے پر ٹھہر گئی۔ کمال نے نبیلا کی طرف دیکھا جیسے پوچھ رہا ہو کہ اس کی جگہ بھی بدلنا تم بھول رہیں یا......

'میں قہوہ بنا کر لائی......' کہتی ہوئی نبیلا کمرے سے باہر نکل گئی۔

کمال نے کمرے کا ایک چکر لگایا اور گھوم کر صوفے پر اپنی پرانی جگہ بیٹھ گیا۔ سگار کی راکھ ایش ٹرے میں جھاڑی اور ایک کش کھینچا۔ چہرے پر سستی ابھر آئی۔ اداس چہرے پر سنہری فریم کا چشمہ زیادہ چمک اٹھا۔ نبیلا کمرے میں ٹرے لے کر داخل ہوئی تو ٹھٹھک کر رہ گئی، جیسے وقت کبھی گزرا ہی نہ ہو۔ کمال نے نظریں گھما کر نبیلا کو دیکھا۔ نبیلا نے سنبھل کر قدم آگے بڑھایا اور قہوے کا پیالہ کمال کی طرف بڑھایا۔

'دوسرا کیا ٹوٹ گیا؟' ایک دم سے کمال نے پرانے پیالے کو نبیلا کے ہاتھ میں دیکھ کر پوچھا، پھر کچھ ٹھٹک سا گیا۔ دونوں کے قہوے کے پیالے الگ تھے جس میں ہمیشہ پیتے تھے۔ آج صرف نبیلا اپنے پیالے میں پی رہی تھی اور اس کا پیالہ نیا تھا۔

کافی پیتے ہوئے نبیلا نے چہرے پر ایک سنجیدگی اوڑھ لی۔ کمرے کی خاموشی بوجھل ہو اٹھی تھی۔ 'بزنس کا کام کیسا چل رہا ہے؟' کچھ نہ سوجھا تو نبیلا نے یہی سوال پوچھ لیا۔

'ہاں، کچھ خاص نہیں۔' کمال نے کہا۔ کمرے میں خاموشی چھائی رہی۔

'سب خیریت ہے نا؟' نبیلا نے پوچھا۔ اس کا دماغ یہ سوچنے میں لگا ہوا تھا کہ ضرور کمال کسی کام کے سلسلے سے آیا ہوگا۔ پرمٹ یا پھر سفارش یا پھر کوئی......

'ویسے تو سب خیریت ہے مگر میں خیریت سے نہیں ہوں۔' کمال نے گہری آواز میں کہا اور سوچتی ہوئی نظریں نبیلا کے چہرے پر گاڑ دیں۔

'ہوا کیا آخر؟' نبیلا نے آہستہ سے پوچھا۔

'میں اپنی موجودہ زندگی سے خوش نہیں ہوں۔ دماغی اداسی کے دورے اس طرح پڑتے ہیں کہ مجھے خودکشی کرنے پر اکساتے ہیں۔' کسی معصوم بچے کی طرح کمال سسک اٹھا۔

'کیا؟' نبیلا چونک پڑی۔

'ہاں نبیلا، میں اس خاموش زندگی سے تھک چکا ہوں۔ میں تمہارے سامنے کبھی جھوٹ نہیں بولا ہوں۔ یہ سچ ہے کہ یہ آرام، یہ دھن دولت میرا گلا گھونٹنے پر مصر ہو گئے ہیں۔ عظمہ اور بچوں کے ساتھ میں بھی یورپ گیا تھا مگر دس دن میں ہی گھبرا کر واپس لوٹ آیا۔' کمال نے اسی طرح اپنے میں ڈوبے ہوئے کہا اور سگار کے ٹکڑے کو ایش ٹرے میں بجھایا۔ نبیلا سانس روکے اس کو تاک رہی تھی کہ زندگی کے اس ڈرامے کے تیسرے حصے میں کمال کیا گل کھلانے والا ہے۔

'نبیلا میرے دکھ کو سمجھو، میں سچ کہہ رہا ہوں۔ اس آرام، اس خاموشی سے میں تھک گیا ہوں۔ ایک طرفہ بولتا ہوں۔ ایک طرف پڑھتا ہوں۔ مجھ سے بحث کرنے والا، مشتعل کرنے، چڑھانے اور بےچین کرنے والا وہاں کوئی نہیں ہے۔ اس برفیلی چٹان کے نیچے دبا دبا میں پاگل ہوتا جا رہا ہوں۔ میرا کام صرف سننا نہیں ہے، صرف دیکھنا نہیں ہے، جو دیکھ سن رہا ہوں اس میں کوئی بدلاو، کوئی رفتار تو ہونی چاہیے۔ میری دماغی ضرورتوں کو عظمہ نہیں سمجھ پاتی ہے۔ میں اب یہ زندگی زیادہ نہیں جھیل سکتا ہوں......' کمال نے بے صبری سے کہا۔

'یہ وقتی تھکن ہے۔ تم اب تین بچوں کے باپ بھی ہو۔ اپنا فیصلہ خود نہیں کر سکتے ہو۔' نبیلا نے

دھیرے سے سمجھایا۔

'انہیں میری ضرورت نہیں ہے نبیلا۔ انہیں روز نئی کشش لبھاتی ہے۔ میں ایک پرانی چیز ٹھہرا جو ان کے لئے کوئی اہمیت نہیں رکھتا۔ جب انہیں پیسہ چاہئے تو وہ انہیں نانا، ماموں اور ماں سے مل جاتا ہے۔ میں ایک سجاوٹ کی چیز بھر ہوں۔' کمال کے لہجے کی اداسی بڑھ گئی تھی۔

'اپنے کو سنبھالو کمال۔ تمہارے سوچنے کا انداز غلط ہو گیا ہے۔ اس غلط فہمی کو بیکار پنپنے مت دو۔' نبیلا نے اپنی گھبراہٹ دباتے ہوئے دھیمی آواز میں کہا۔ اس کو یہ سب جان کر ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ یہ کیسا آدمی ہے جو زاویوں میں زندگی جیتا ہے۔ بغیر کسی ذمہ داری، بغیر کسی وفاداری کے صرف جذبات کے جوار سے مچلتا ہے۔

'یہ غلط فہمی نہیں ہے، بلکہ میری بنیادی ضرورتیں مجھے دیوانہ بنا رہی ہیں۔ مجھے سوچ، مجھے فکر، مجھے خیال چاہئے۔ میں دماغی بھوک سے نڈھال ہوں۔ نبیلا، مجھے مرنے سے بچالو...... مجھے خودکشی سے بچالو، نبیلا...... ' کمال پوری طرح ٹوٹ چکا تھا۔

'میں...... ' نبیلا پہاڑ سے کھائی میں گری۔ جب پتوار پھینک کر اس نے انتظار کی تختی اپنی زندگی پر سے ہٹادی تو اس وقت یہ آدمی...... کتنا بچپنا ہے اس میں اور یہ مجھے کیا سمجھتا ہے؟ کیا میں انسان نہیں ہوں؟ میری خواہش اور خیال کی کوئی قیمت نہیں ہے؟ میری عزت اور پہچان کی کوئی اہمیت نہیں ہے؟ آج بارہ برس بعد کس آرام سے دوسری زندگی کو چھوڑ دینے کا فیصلہ کر کے پہلی میں داخل ہونے کا خود بخود فیصلہ لے لیا۔

'تم کسی کے شوہر ہو۔ تین بچوں کے باپ ہو۔ ایسی حالت میں تم کو یہاں سے جانا ہوگا۔ میں اپنی ذمہ داری سمجھتی ہوں اور تمہاری بھی۔ اٹھو کمال۔' سخت لہجے سے نبیلا نے کہا۔

'تمہارا یہ آخری فیصلہ ہے۔' کمال نے تھکے لہجے سے پوچھا۔

'ہاں، اس گھر میں تمہاری یاد تو رہ سکتی ہے مگر تم نہیں۔' کہتی ہوئی نبیلا کھڑی ہو گئی، جس کا صاف مطلب تھا کہ کمال کو صوفے سے اٹھ کر اپنے جانے کی تیاری کر لینی چاہئے۔ مگر کمال اپنی جگہ سے ہلا بھی نہیں، جیسے زمین نے اس کے پیر پکڑ لئے ہوں۔ نبیلا نے کمال کے چہرے کو دیکھا اور اس پر چھائی

مردنی کو دیکھ کر سوچنے لگی کہ سچ مچ کمال ڈوب گیا، بالکل اجنبی سمندر میں۔ اس کو اب کوئی نہیں بچاسکتا۔ آسمان سے جب تارا ٹوٹتا ہے تو زمین پر گر کر اپنی چمک کھو بیٹھتا ہے، مگر کمال زمین پر نہیں، سمندر میں ڈوبا ہے، جہاں اسے ڈھونڈنا بھی مشکل ہے۔ اگر میں سمندر کی تہہ سے اسے ڈھونڈ بھی نکالوں تو وہ سچا موتی تو نہیں ثابت ہوگا۔ اس معمولی پتھر کو اٹھا کر کس کس کے سامنے وہ خلاصہ دیتی پھرے گی۔ اگر اس کو اپنی شخصیت یا انانیت کی پرواہ نہ بھی ہو تو ان مجاہدوں کے سامنے وہ کیا منہ دکھائے گی جنہوں نے اب تک صرف کشمکش کی ہے، آرام نہیں۔ کیا بتائے گی ان سب کو کمال کے بارے میں؟ کیا وہ خود کمال کو اب برداشت کر پائے گی...... کیا......؟ آواز کی گونج بار بار ایک جملہ دہرا رہی تھی۔ یکایک نبیلا کمال کے قریب جم کر کھڑی ہوگئی اور دھیرے سے بولی ——'میں نے کبھی تم سے اپنے دل و دماغ کو چھپایا نہیں اور آج بھی اس کو پوری ایمانداری کے ساتھ، ایک انسان کے ناتے تمہارے سامنے کھول کر رکھتی ہوں۔ پڑھو...... اس میں کیا لکھا ہے......؟'

کمال نے نبیلا کی بات سن کر جھکا سر اٹھایا اور پریشان ہو کر پلکیں جھپکائیں اور سوالیہ نظروں سے نبیلا کو دیکھا۔

'سنو کمال، جب محبت زندگی میں داخل ہوتی ہے تو اس پر انسان کا کوئی قابو نہیں ہوتا، مگر جب محبت زندگی سے رخصت ہونے لگتی ہے تو اسے تھام کر رکھنا بھی غیر ممکن ہوتا ہے۔ یہی میری مجبوری ہے۔ ایسا ہی کچھ میرے ساتھ ہوا۔ امید ہے، تم میری مشکل سمجھو گے۔'

نبیلا کی بات سن کمال کے چہرے پر پھیلا طوفان تھم گیا۔ آنکھوں کا موسم بدل گیا۔ وہ سدھے قدم سیڑھیاں اتر گیا۔

کمال کے جانے کے بعد مضمحل سی نبیلا اپنے کو کچھ لمحے تک ضبط نہیں رکھ پائی۔ دکھ، ذلت، حیرت کے ملے جلے طوفان سے وہ تڑپتی رہی کہ آخر انسان اتنا بے حس بھی ہو سکتا ہے؟ کمال جو کبھی اس کا آئینہ تھا، جس میں وہ برسوں تک اپنے کو دیکھتی آئی تھی، وہ آج نہیں، بلکہ برسوں پہلے واپس چلا گیا تھا اور اب جو جہاں نما آئینہ اس کے سامنے تھا، اس میں پوری دنیا کے لوگوں کو دیکھ رہی تھی۔ وہی اس کا سروکار تھے، وہی اس کی محبت کا آئینہ تھے، وہی اس کا گھر سنسار تھے۔

خوشبو کا رنگ

پرندوں کے لوٹنے کا موسم آگیا ہے۔ برف پگھل پگھل کر پہاڑوں کے دامن پر جمع ہو گئی ہے اور زمین ننھی ننھی ہری کونپلوں سے بھر گئی ہے۔ مگر میں وہاں اسی طرح کھڑی ہوں۔ جہاں تمہارے لوٹنے کی کوئی خبر مجھ تک نہیں پہنچتی ہے، جبکہ بے زبان پرندے اپنے پرانے ٹھکانوں کو لوٹ رہے ہیں۔ یہ گھونسلے درست کریں گے اور رہنا شروع کر دیں گے۔ مگر میں اسی طرح لٹی ہوئی تنہا اور تشنہ سی رہ جاؤں گی۔ موسم یوں ہی بدلتے جائیں گے اور میں تنکا تنکا جوڑ کر بس انہیں سنبھالتی ہی رہوں گی، ہزار چاہنے پر بھی اسے گھر کی شکل نہیں دے سکوں گی۔

تم سے جدائی کے بعد تمہارا وہ پہلا خط ہزاروں بار پڑھا تھا۔ ہر بار غسل خانہ کے نم ماحول میں گھنٹوں بہتے نل کے نیچے کھڑے ہو کر بے تحاشہ روئی تھی۔ مگر آج بھی اس جدائی کی جلن اور کسک میں کوئی کمی نہیں آئی ہے۔ جیسے تمہارے خط کی وہ سطریں میری نظروں کے سامنے ہیں۔

'تم سے دور رہ کر ہر وہ چیز، جو نظروں کے سامنے ہے، عیب دار لگ رہی ہے۔ چونکہ قسم کھا چکا ہوں کہ روؤں گا نہیں بلکہ کسی بنجارے کی طرح زندگی کے ہر پڑاؤ پر میری نظریں تمہاری تلاش میں بھٹکتی رہیں گی۔'

اور میں نے تمام زندگی تمہاری اسی نظر کے انتظار میں گزار دی۔ گھر میں سبھی پیچھے پڑے تھے۔ اماں کا رو رو کر برا حال ہو گیا تھا۔ مگر بڑھتی عمر کی بہار کا رخ میں نے سب کی مرضی کے خلاف پت جھڑ کی طرف موڑ دیا تھا۔ اس امید پر کہ موسم کے ساتھ سب کچھ بدل جائے گا۔

'مجھے گھر کے سارے لوگوں پر غصہ تھا۔ پھوپھی پاپا کو طعنہ دیتیں' دیکھ لیا نہ، لاڈ پیار کا نتیجہ، منع کیا تھا کہ کنواری لڑکی کو غیر ملک مت بھیجو، ڈگری کے بغیر زندگی میں کون سا داغ لگا جا رہا تھا۔ مگر یہ زخم جو بیٹھے بٹھائے لگا بیٹھی ہے اب اس کا علاج تم ہی بتاؤ۔'

ماں مجھے ہمیشہ جوانی کے تقاضے اور بڑھاپے کی بے چارگیوں کا خوف دلاتیں مگر میں انہیں سمجھا نہ سکی کہ ماں! روحانی تقاضے بھی تو ہوتے ہیں جو جسم سے بہت اوپر کی چیز ہیں۔ جسم کا کیا، کل کچھ بھی ہو سکتا ہے، یہ چلتا پھرتا جسم لمحہ بھر میں مٹی میں تبدیل ہو سکتا ہے۔ صرف اس جسم میں بسنے والی روح، اس کا وجود، اس کی فکر، باقی رہ جائے گی۔ مگر میں زبان نہ کھول سکی۔ اپنے آپ میں گھٹتی رہتی۔ ایک ایک سال گن گن کر کاٹتی۔ جانے کب تم آؤ! دن تو وہ گنتے ہیں جنہیں سال کے خاتمہ کا انتظار ہوتا ہے مگر مجھے تو سالوں کے گزرنے کا انتظار تھا۔ کبھی کبھی لگتا تھا کہ صدیوں راہ ہی دیکھتی رہ جاؤں گی۔ یا پھر اس خوف سے برف کی طرح جم جاتی تھی کہ کبھی تم کو دوبارہ دیکھ بھی پاؤں گی یا نہیں۔ ماں نے ایک بار مجھے بہت سمجھایا تھا۔ ہزاروں قسمیں ہزاروں منتیں کی تھیں جس کا میرے پاس صرف ایک ہی جواب تھا۔ اگر میں ان کی اکلوتی آرزو اکلوتی بیٹی ہوں تو پھر اس اکلوتی آرزو کی بھی اکلوتی تمنا تھی جس کے لئے وہ سب کچھ کر سکتی تھی۔ ماں نے پریشان ہو کر شاید پاپا سے کہا تھا۔ عرصے بعد بھٹکتا پیغام وہ لوٹانا نہیں چاہتی تھیں۔ اس عمر میں کچھ لڑکیوں کو یہ بھی نصیب نہیں ہوتا ہے۔ پاپا نے مجھے اپنے پاس بلایا تھا اور مجھ سے جو بھی کہا، اس کا بھی میرے پاس جواب تھا کہ آپ نے مجھے جو کچھ سکھایا ہے کیا میں اسے غلط سمجھوں؟ اور پھر پاپا میں ایک بات جانتی ہوں، وہ بھی آپ ہی کی بتائی ہوئی کہ جس پر یقین اور اعتماد کرو پھر اس کے لئے پوری طرح ایماندار رہو۔ اب رہی ماں کی بات۔ اس کا جواب یہی ہے کہ آپ نے مجھے بچپن میں سب کچھ غلط کیوں سکھایا تھا؟ اب تو بہت وقت بیت گیا ہے۔ آپ اگر اس بات کو تسلیم کرتی ہیں کہ آپ کی دی ہوئی تربیت بیکار تھی تو میں اپنے کو بدلنے کے لئے تیار ہوں۔

ماں اور پاپا دونوں اس حقیقت سے انکار کرنے کے لئے تیار نہ تھے۔ اس لئے میں تمہاری طرف جانے والے راستے پر تنہا نکل گئی۔ بھٹکنے کا سوال ہی نہ تھا کیونکہ تمہاری چاہت کا چراغ میرے ہاتھوں میں تھا۔ بس تمہیں ڈھونڈنا تھا۔ جانے تم زندگی کے کس موڑ پر اچانک آملو، اس امید کے سہارے ہر پڑاؤ پر ٹھہر کر دم لیتی پھر تمہیں ڈھونڈنے کے لئے دنوں کے راستے پر چل پڑتی۔

ایک بار تم نے بہت گھبرا کر کہا تھا، 'سنو! اگر مجھے جیل ہو جائے تو تم گھبرانا مت، میں کسی نہ کسی طرح آزاد ہو جاؤں گا۔'

'تم اپنے اصولوں کی سچائی کے لئے لڑو گے تو مجھے ہمیشہ اپنے ساتھ پاؤ گے۔' میں نے اتنے غرور اور

ناز سے یہ بات کہی تھی کہ تم مجھے دیکھتے ہی رہ گئے تھے۔ لوٹنا مجھے تھا، میں لوٹ آئی اس وعدے کے ساتھ کہ جلدی ہی ایک دوسرے کے ہو جائیں گے مگر میں انتظار کرتی رہ گئی اور تم کوشش۔ دوریاں اتنی بڑھیں کہ وہ شہروں سے بڑھ کر آسمان اور زمین میں بدل گئیں۔ مجھے یاد آرہا ہے کہ تم کمرے میں مجھے کہیں نہیں بیٹھنے دیتے تھے سوائے اپنی لکھنے کی میز کے۔ کہتے تھے کہ کتابوں کے بیچ سے نظر آتا ہوا تمہارا چہرہ مجھے ایک عرفانی احساس بخشتا ہے اور میں اس گرم گوشہ میں لیمپ کی تیز روشنی کی تپش کو سہتی ہوئی صرف تمہاری خاطر بیٹھی رہتی تھی۔

چلتے وقت تم نے میرے سامنے کھڑے ہو کر کہا تھا، 'یہ گھر ہے جہاں تمہاری سانسیں بسی ہوئی ہیں۔ یہ کتابیں ہیں جو مجھے جان سے زیادہ عزیز ہیں۔ جو پسند ہو لے لو۔ اور میں تمہارے سامنے کھڑا ہوں۔ اس تن کے ساتھ جو سلوک چاہو کرلو۔' میں نے کانپتے لرزتے ہوئے تمہاری پیشانی کا بوسہ لیا تھا اور اپنے کو سنبھالتے ہوئے کہا تھا، 'اپنی فکر اپنے خیالات مجھے دے دو، بس! مجھے اور کچھ نہیں چاہئے۔' اور تم نے یقین دلایا تھا، 'میری ہر فکر کا محور تم ہی رہو گی۔ کوئی دوسرا نہیں۔' یہ کہہ کر تم نے میرے ماتھے کا بوسہ لیا تھا جس کی سوزش آج بھی مجھے محسوس ہوتی ہے۔ اس لمحہ بھر کی تمہاری مردانہ خوشبو نے مجھے زندگی بھر کے لئے تشنگی میں مبتلا رکھا۔

کبھی کبھی میرا دل پھٹنے لگتا تھا اپنے پاپا کی فکروں میں ڈوبی ہوئی کھوئی کھوئی شخصیت کو دیکھ کر جس کو ماں کی جدائی نے توڑ کر رکھ دیا تھا۔ ان کے پاس مجھ سے کہنے کو کچھ بھی نہیں رہ گیا تھا۔ ہم دونوں ایک ہی گھر میں اپنی اپنی دنیا میں کھوئے رہتے تھے۔ پاپا نے غم سے نجات حاصل کرنے کے لئے باغبانی سے جی لگا لیا تھا اور میں نے لکھنے میں نجات پانے کی کوشش کی۔ پاپا کے پودوں کے پھول ماں کی تصویر کے نیچے سجے ہوتے جو مرجھانے سے پہلے صبح و شام بدل دیئے جاتے تھے۔ اور ان کی تصویر کے پاس کی ایک الماری میری لکھی ہوئی کتابوں اور کاغذوں سے بھرتی چلی گئی۔ مگر لکھتے لکھتے، نظر جب جھریوں سے بھرے ہاتھ پر پڑتی تو انہیں میں اٹک کر رہ جاتی۔ ہر لکیر سے ہر جھری سے ماضی جھانکنے لگتا تھا اور پھر ساری جھریاں ساری لکیریں مل کر تمہارے چہرے میں تبدیل ہو جاتیں اور میں تمہاری گہری آنکھوں میں ڈوبی تمہاری سرگوشی کو سنتی 'چھوٹے مگر خوبصورت ہاتھ، لگتا دل کو کسی نے چٹکی سے مسل دیا ہو۔

ایک دن بازار میں گھومتے ہوئے یوں ہی تم ایک زیور کی دکان میں گھس گئے تھے، ایک انگوٹھی خریدی تھی اور وہیں دوکان میں اسے میری انگلی میں پہناتے ہوئے بولے تھے، 'اسے اپنے ہاتھ سے کبھی بھی جدا نہ کرنا۔' خوابوں میں ڈوبی ہوئی سی میں باہر نکلی۔ جیسے چلنے کی سکت کسی نے مجھ سے چھین لی ہو۔

میرے سفید چہرے کو دیکھ کر تم نے کہا تھا، 'کیا بات ہے؟'

'کچھ نہیں چلو کہیں بیٹھتے ہیں۔ مجھے چکر آرہا ہے۔'

سامنے کے ریستوران میں ہم بیٹھ گئے۔ تم آنے والی زندگی کے تصور میں ڈوبے تھے۔ ہمارے صرف دو بچے ہوں گے۔ لڑکا میری شکل کا اور لڑکی تمہاری شکل کی۔ میرے کہے جانے والے بچوں کی تم ماں ہوگی۔ یہ سوچ کر مطمئن ہو جاتا ہوں کہ ان کا مستقبل روشن ہوگا۔ تم ایک اچھی پیار کرنے والی ماں ثابت ہوگی۔'

مگر میں بنجر دھرتی کی طرح ساری زندگی ویران خالی پڑی رہی اور ممتا کے ابلتے سوتوں نے بھی مجھے اس سوندھی خوشبو سے محروم رکھا جو برسات کی بوندیں دھرتی کو بخشتی ہیں۔

میرے وجود پر صرف دو نشان تھے یا یوں کہوں کہ زندگی بھر تمہاری خوشبو سونگھنے کی لمحہ بھر کی گناہگار اور ماتھے پر دوج کے چاند کی مہر کا الزام۔ مگر ان گزرے ہوئے تمام سالوں میں میں افواہوں کی صلیب پر ٹنگی ہوئی تمہارے خیالوں کی زرہ بکتر پہنے ہوئے ہر وار کو واپس لوٹاتی رہی۔ اس لمبی پگڈنڈی پر انگنت لوگ ملے۔ کچھ اچھے بھی لگے۔ مگر صرف اچھے لگنے کی حد تک تمہاری حد تک پہنچنے کا نہ کسی میں دم تھا نہ مجھ سے تم کو چھین لینے کا حوصلہ۔

محبت کا یہ موجودہ پل، جس پر آج میں تنہا کھڑی ہوں، اس کی شروعات میری ایک کہانی سے ہوئی تھی اور یہی کہانی دوستی کے پل کی پہلی نشانی تھی۔ اس کہانی میں وہ سب کچھ جو میں اتنی آسانی سے اگل گئی تھی جسے تم راکھ میں دبی چنگاری کی طرح دماغ میں چھپائے چھپاتے ہوئے صبح کا انتظار کر رہے تھے، تمہارے دماغ نے مجھے پرکھ لیا تھا۔ اپنی طرح ٹکرانے، لڑنے، جھگڑنے والا سمجھ کر اپنے کو روک نہیں پائے تھے۔ اپنی کتاب، جو کتابوں کے ڈھیر کے پیچھے کاغذ میں لپٹی چھپی ہوئی پڑی تھی

اور خاموشی سے چھپی تھی اور خاص خاص لوگوں تک پہنچ گئی تھی۔ اس لئے اپنی گھٹتی آواز کو میری کہانیوں میں للکار کی شکل میں دیکھ کر تم دیوانہ وار میری ہر کہانی پر اپنی پسند کی مہر لگاتے چلے گئے تھے اور یہی نشانیاں ہماری چاہت کا ٹپل بن گئیں۔ تم نے بتایا، اگر یہ کتاب عام لوگوں تک پہنچ جائے تو میں کم سے کم دس سال کے لئے لوہے کی سلاخوں کے پیچھے پہنچ جاؤں گا۔ آج ہم ایک دوسرے کی امانت بنے ماتھے پر زخم کھائے الگ الگ ملکوں میں آنسوؤں میں ڈوبے پگھل رہے ہیں۔

کچھ دنوں بعد، پاپا بھی مجھے چھوڑ کر چلے گئے۔ میرے ارد گرد ایک بھیڑ سی جمع رہتی تھی جس میں رشتے داروں، دوستوں کے بہت سے چہرے یاد رہ گئے ہیں جو مجھے اپنی طرح جینا سکھانا چاہتے تھے۔ کچھ نے تو یہ بھی کہا 'لڑکیوں کی طرح رہو، تو کیا میں لڑکی نہ تھی لڑکیاں کیسی ہوتی ہیں؟ کیا وہ کسی کا انتظار نہیں کر سکتیں؟ کیا وہ اپنے پیروں پر نہیں کھڑی ہو سکتیں؟ مگر ان سارے سوالوں کا جواب ان کے پاس نہیں تھا۔ میں ٹھیک اس پرانے کنویں کی طرح ہوں جس میں ہر گزرنے والا اپنی شکل اپنی آواز کی واپسی سننا پسند کرتا ہے۔ اور میں ان زبردستی کا حق جتانے والوں کے خلاف کچھ بھی کر نہیں سکتی۔ میں دماغی اور جسمانی طور پر تیز نوکیلے نشتر کے زخم سہتی ہوئی ان رشتے داروں اور دوستوں کے چلے جانے پر ایک لمبی سکون کی سانس کھینچتی۔ پھر وہ وقت بھی آگیا جب میں اس سنسان گھر میں اکیلے رہنے لگی جو چاروں طرف سے بے شمار جھاڑیوں، پیڑوں اور لمبی گھاس سے گھرا ہوا تھا۔

دن ماہ بنے، ماہ سال، یکایک تمہارے خط آنے بند ہو گئے جس سے پتہ چل گیا تھا کہ اب تم آزاد نہیں رہ گئے، تمہاری نئی کتاب شاید حکم کے بادشاہ کے ہاتھ لگ گئی تھی۔ باغ شہنشاہی میں گھومتے ہوئے تم نے بڑے لاڈ میں آکر کہا تھا، 'لو یہ ہاتھ توڑ ڈالو۔ میں اس لاڈ کو سمجھ نہیں پائی تھی پھر بھی دور سے اس ہاتھ کے بے شمار بوسے لے کر میں نے کہا تھا، 'نہیں! یہ ہاتھ توڑنے کے لئے نہیں ہیں۔ میں تو ان کی قیمت کا صحیح اندازہ بھی نہیں لگا سکتی۔ یہ کہتے ہی میں نے اچھل کر سڑک کے بیچ آنے والی نالی کو پار کیا تھا مگر پتھر سے ٹھوکر کھا کر لڑکھڑا گئی تھی۔ تمہاری حالت قابل دید تھی۔ کبھی مجھ سے پوچھتے تھے، کبھی جھک کر میرے پیر دیکھتے تھے۔ آج میرا وجود زندگی کی بے شمار ٹھوکروں سے زخمی ہے۔ جسے دیکھ کر تم شاید پھوٹ پڑو اور تمہارے آنسو آب نسیاں کی طرح میرے سارے زخموں کو مندمل کر کے میرے دامن کو موتیوں سے بھر دیں۔ مگر ایسا نہیں ہوگا۔ یہ تو بس ایک ناکام سی آرزو ہے،

جب کبھی جینے کو جی چاہتا ہے تو ایسی ہی انہونی باتیں سوچنے لگتی ہوں۔

تم سے ملنے کے کچھ دن بعد۔

ہم باتیں کر رہے تھے۔ ان دنوں نہ ہم مرد تھے نہ عورت، بس دو دل اور دو دماغ تھے۔ ایک بار عورت پر بحث کرتے ہوئے تم نے کہا تھا، 'عورتیں کوئی لباس نہیں ہیں جو صبح و شام بدلی جائیں اور انہیں اترے کپڑوں کی طرح غسل خانہ کے کونے میں گندی چھینٹوں کے حوالے کر دیا جائے۔ وہ بھی انسان ہیں انہیں دیوی کے آسن اور فاحشہ کے نابدان سے نکال کر انسان کی طرح اچھائی برائی کے ساتھ جینے کا حق دیا جائے۔' اور میں سحر زدہ سی تمہیں دیکھتی رہ گئی تھی۔ لگا جیسے میرے ہی خیالات تم اپنے لفظوں میں دہرا رہے ہو اور میں اپنا عکس آئینہ میں دیکھ رہی ہوں۔ مگر تب معلوم نہ تھا کہ سورج کی کرن کی طرح جھلملائے ہوئے اس آئینے کا دوسرا رخ بالکل خوشی کی پشت کی طرح غمگین اور سیاہ ہے جس میں ڈوبی ہوئی میں زندگی بھر اپنے کو دوبارہ دیکھنے لئے بےچین اور تڑپتی رہ جاؤں گی۔

گھر کا لمبا سناٹا، سمٹی دھوپ کی پرچھائیاں، بند اندھیرے گھر کے کونے، الجھن، گھبراہٹ، بےچینی میری تنہائی میں ایسا زہر بھرتے کہ میں ہوا میں اچھالے ہوئے سکے کی طرح قلابازی کھاتی ہوئی یہ نہ سمجھ پاتی کہ میرے پیروں کے نیچے ٹھوس زمین ہے بھی یا نہیں۔ یا میں صرف احساسات اور خیالات کے پروں پر سوار اڑی جا رہی ہوں۔ ایسے مواقع پر صرف ایک سوال سر ابھارتا تھا: آخر میری قسمت کے پھولوں کو میری پہنچ کے دائروں کے باہر ہی کیوں کھلنا تھا؟ یہ سب کچھ کیا میرے ساتھ ہی ہونا تھا؟

پھر شاہین کا خط آیا تھا۔ اس نے لکھا تھا، 'تم آ جاؤ، اسی کمرے میں، جس کی دیواریں بنفشئی ہیں، جس کی چھت پر زندگی کی طرح دل آویز و دلکش رنگ برنگی قندیل ٹنگی ہے۔ جس کے کونے میں کتابوں سے لدی میز کے پیچھے رکھی کرسی خالی ہے۔ وہاں ہم دونوں بیٹھ کر گزرے لمحوں کو یاد کریں گے اور جی بھر کر روئیں گے۔ رونے کو عرصے سے دل چاہ رہا ہے۔ مگر آفس میں کام اور گھر میں بابا کی موجودگی باندھے رکھتی ہے۔ آؤ...... دیکھو! اس کمرے کے دروازہ پر بنا ہوا سوال کا معمولی سا نشان جس نے ہماری زندگی کو بے معنی سا بنا دیا ہے۔ یہ سوال پوچھتا ہے کہ وہ کہاں ہے جس کے لمس، جس کی آواز، جس کی مہک کی ہمیں عادت پڑ گئی تھی؟ ہمارے پاس اس سوال کا کیا جواب ہے؟ تم آ جاؤ، کتنی بار بلا چکی ہوں۔ ایک بار پھر میں تمہارے لمبے سیاہ بالوں میں برش کروں گی۔ ساڑی کے رنگ کی نیلی پالش

سے تمہارے گلابی ناخن رنگوں گی جو تم سوکھنے سے پہلے پونچھ ڈالو گی۔ پھر تمہیں تمہاری پسند کا لوک گیت سناؤں گی جسے سن کر تم خاموش ہو جاتی تھیں اور تمہاری آنکھیں بولنے لگتی تھیں۔ مگر اس گیت پر شورا ناچے گی نہیں۔ وہ تو یہاں سے دور اپنے شوہر کے ساتھ ہے۔ وہ ناچنا بھول گئی ہے۔ ڈھیروں بچوں کو دھوبی کی لادی کی طرح اٹھائے زمین میں تاکتی رہتی ہے۔'

میں وہاں جا کر کیا کرتی؟ میرے سامنے خود سوالوں کی قطاریں تھیں۔ ایک بار شہر سے گزرتے ہوئے میں نے تمہارا چشمہ لگا کر کہا تھا آج تمہارا ملک تمہاری نظروں سے دیکھ رہی ہوں۔ دیکھو! میری نظروں سے اس کی شاندار حسین عمارتیں، میوزیم کے سچے موتی، پنے، لعل، ہیرے، سامانوں سے ابلتی دوکانیں نہیں دیکھو گی بلکہ کچے گھر اور گلی کوچوں میں بوریئے اوڑھے بچے سڑک کے کنارے تربوز کے ساتھ روٹی نگلتے دکھائی دیں گے۔ راستے بھر تم خاموش تھے اور میں تمہارا چشمہ لگائے ہوئے ہڈیوں کے پنجروں والے ننگے بھوکے علاقہ میں گھومتی رہی تھی۔ تم سوچتے ہو کہ ہم لوگ اچھی حالت میں ہیں؟ تم سے بہتر زندگی گزار رہے ہیں؟ تم نے کہا تھا، نہیں! لیکن دکھاوے کا چابک سروں پر نہیں سنسناتا ہے، مگر پچھلے ماہ ملنے والے شاہین کے خط کو میں فراموش نہ کر سکی نہ اس کے بلاوے کو ٹال سکی۔ اس نے لکھا تھا، 'بابا کی کوششوں اور آنسوؤں نے تم کو پالیا ہے اور تم بہشت زہرہ کے ایک کونے میں سکھ کی نیند سو رہے ہو۔'

پڑھ کر جیسے دل کو قرار آگیا تھا کہ آخر تمہارا پتہ تو چلا۔ بھاگ دوڑ کر اجازت نامہ لیا اور جہاز پر بیٹھ گئی۔ کتنے عرصے بعد منزل کی طرف جانے والے جہاز پر بیٹھی تھی۔ اڑان کے ساتھ ہی دل الٹنے لگا۔ نیچے گزرتی فیروزے کی پہاڑیوں پر سر پٹک پٹک کر رونے لگی۔ مگر کیا یوں سر پٹکنے سے تقدیر کا لکھا مٹا سکتی تھی!

بہشت زہرہ خاموش تھا۔ دروازے کے نیلے گنبد جیسے بولنا بھول گئے تھے۔ شاہین میرے پیچھے چل رہی تھی اور میں اس طرح سے تم تک چلتی گئی جیسے مجھے تمہارے گلے میں جے مالا ڈالنی ہو۔ شرم وحیا کی جگہ میں غم سے نڈھال آنسوؤں کے سیلاب کو چیرتی آگے بڑھ رہی تھی۔ تم سے یہ میری دوسری ملاقات تھی۔ تم منوں مٹی کے نیچے دبے ہوئے تھے اور میں تمہارے بغیر زندہ رہ کر اندھیرے میں چھپتاتی رہی ہوں۔ ایک بڑا پتھر، جو منوں مٹی سے بھی کہیں زیادہ بھاری ہے میرے سینے پر رکھا ہوا تھا۔ اودے، نارنجی پھول تمہاری پسند کے رنگ، تمہاری قبر پر رکھ دیتی ہوں۔ سفید سنگ مرمر کے

نیچے تم سارے رشتے، ساری بغاوت، سارے انقلاب کو بھول کر ساکت پڑے ہو۔ میرے ساتھ وہ بچے نہیں ہیں جو دو مختلف تہذیب، دو ملک کے ملن سے ہونے والے تھے۔ نہ وہ لڑکا جو تمہاری شکل کا اور نہ وہ لڑکی جو میری طرح ہونے والی تھی۔

قبر پر شاہین نے قالین بچھایا اور تمہاری پسند کے پھل سجائے اس رسم کے مطابق، جس کا مطلب تھا تم بھی ہمارے بیچ ہو۔ تمہاری جگہ شاہین میری پلیٹ میں پکی ہوئی انجیریں رکھ رہی تھی۔ اور میں بیس سال پہلے کی شام میں کھوئی جانے کیا کیا نگل رہی تھی۔ شاہین کہہ رہی تھی کہ تم اپنی حرکتوں سے باز نہیں آئے تھے اور جیل میں بھی ایسی حرکتیں کرتے رہے کہ مجبوراً تم کو گولی سے اڑانے کا فیصلہ کیا گیا۔ مرنے سے پہلے تم نے ایک خواہش ظاہر کی تھی کہ گولی سر پر نہ ماری جائے چاہے جسم کے سارے حصوں کو بھون دیا جائے۔ آخری خواہش کی قدر کرتے ہوئے گولی تمہارے سینے پر داغی گئی تھی۔ بغاوت نہیں، شاید انسانیت کے بارے میں سوچنے کا یہ انعام تھا جو سینہ تان کر تم نے قبول کیا ہوگا۔

ایک بار تم نے کہا تھا، جانتی ہو، بڑھاپے میں اپنے دانت جس جگہ دفن کروں گا وہاں سے گھاس اگے گی اور یہی میری پاکیزگی کی نشانی ہوگی۔ آج میں سوچ رہی ہوں کہ جہاں تمہارا خون گرا ہوگا، گرم جوشیلا سرخ خون، وہاں لال پھول تو ضرور کھلے ہوں گے! ہو سکتا ہے کہ اس کو حکم کی نادر شاہی نے روند ڈالا ہو۔ یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ روندنے کے باوجود دوبارہ نکلا ہو۔ ٹپکے ہوئے خون کی بوند دھرتی میں گہرائی تک جذب ہو گئی ہوگی جس سے سرخ پھول کھلتے ہی رہیں گے۔

گھر کے ماحول نے میرے رہے سہے حواس بھی مجھ سے چھین لیے۔ بابا کی حالت دیکھی نہیں جاتی تھی۔ آنکھوں میں موتیا بند اتر آیا تھا۔ بس تمہارے لکھے کاغذوں کو سینے سے لگائے چومتے رہتے تھے۔ مجھے دیکھ کر وہ ایسا پھوٹ پھوٹ کر روئے تھے کہ مجھے اپنے سارے غم بھرتے ہوئے محسوس ہوئے۔ احساس جاگا کہ میں نے تو تم کو کچھ دن ہی دیکھا تھا مگر بابا نے برسوں تمہیں گود میں کھلایا تھا۔

شاہین نے وہ دروازہ، جس پر سوال کا نشان بنا ہوا تھا، کھولا، جانی پہچانی خوشبو کے غبار میں ڈوب گئی۔ اوپر چھت پر قندیل روشن تھی۔ ٹیلی ویژن پر ہری نازک جنگلی جھاڑیوں کی سوکھی ٹہنیاں سجی تھیں۔ شاہین نے تمہارے تکئے کے نیچے سے پرچہ نکال کر دیا۔ آخری دن پانچ منٹ کی ملاقات میں مرنے سے پہلے یہ سطریں تم نے میرے لئے قلم بند کی تھیں۔

'پڑھ لونا۔' شاہین نے مجھے تعجب سے دیکھتے ہوئے کہا۔

'اب جلدی کیا ہے؟' کھڑکی کے سامنے گھروں کے پچھواڑوں کو دیکھتے ہوئے میں نے کہا۔ ننھا سا پرچہ مٹھی کی چھوٹی سی دنیا میں قید ہو گیا۔ ہلکی فالسئی دیواروں والے کمرے میں ہم سرمئی قالین پر بیٹھ گئے۔ ایسا لگا جیسے میں سرمئی بادلوں پر سوار ہوں اور کبھی بھی کسی بھی لمحے چھم چھم برس پڑوں گی۔ شاہین اٹھی۔ دروازہ کھول کر اس نے تمہارا کنگھا نکالا۔ میرے بال کھول دیئے جو بجائے قالین پر لوٹنے کے میرے کندھوں سے چپک گئے۔ شاہین نے باتیں شروع کر دیں۔ تھوڑی ہی دیر بعد شہناز، مریم، بتول، بھی آ گئیں۔ ماحول وہی تھا۔ بس ذرا سا کا فرق تھا۔ بالوں کی لمبائی کم اور سیاہی سفیدی میں بدل گئی تھی۔ یادوں کی سفیدی وقت کے سیاہ پہیوں میں ایسی الجھ گئی تھی کہ ان تاروں کو سنبھال سنبھال کر نکالنا تھا۔

شاہین اٹھی اور چائے بنا لائی۔ چائے سے بھرا فنجان اور شکر کے دو کیوب تمہاری میز پر رکھ کر اس نے سب کو چائے دی۔ ہم سب ٹھیک بیس سال بعد دوبارہ دودھ کی چائے پی رہے ہیں۔ یہ کہہ کر شاہین نے بسکٹ کی پلیٹ آگے بڑھائی۔ آنکھ مچولی کے کھیل کی طرح کئی سائے چہروں سے گزر کر گھر کے کونوں میں سما گئے۔

رات کو بابا کے سو جانے کے بعد میں نے اور شاہین نے بڑی خاموشی اور احتیاط سے ان کے سینے سے کاغذ اٹھائے اور ساری رات میں انہیں دوسرے کاغذوں پر اتارتی رہی۔ شاہین خاموش، گھٹنوں پر ٹھڈی رکھے مجھے دیکھتی رہی۔

تمہاری قبر کے پاس میں صبح سے بیٹھی ہوں۔ اٹھنے کو دل نہیں چاہ رہا ہے۔ پھر جانے کب ملاقات ہو! ایک لمبا سفر تھا جس کے ہر پیچ و خم کو میں صرف چند گھنٹوں میں دہرا گئی جیسے جینے کے لئے میں نے ساری عمر گزار دی تھی، گھٹنوں پر سے پیشانی اٹھاتی ہوں۔ ہاتھوں میں تمہارا لکھا پرچہ ہے کھول کر پڑھتی ہوں۔

'اس حادثہ کو داستان کا خاتمہ سمجھ کر اداس مت ہونا۔ ابھی اس داستان کو منزل تک پہنچانے کے لئے بہت رنگ چاہئیں۔ جانتی ہو تمہیں بھی رنگ بھرنا ہے۔ اس داستان کا سفر لمبا ضرور ہے مگر بے نتیجہ

نہیں ہے۔'

سامنے نظر ڈالتی ہوں۔ سورج دوبارہ طلوع ہونے کی امید میں ڈوبنے کی تیاری کر رہا ہے۔ سامنے سے بے شمار پرندوں کے جھنڈ چلے آ رہے ہیں۔ کچھ بیچ میں اتر کر زمین سے بکھرے ہوئے تنکے چن رہے ہیں۔ سب کو بسنے کی جلدی ہے۔ برسوں سے دیکھے ہوئے ان نظاروں میں کھو جاتی ہوں۔ جانے کہاں سے شعلہ سا لپکتا ہے۔ امید کا آخری تنکا اٹھاتی ہوں۔ کاش! میں تمہارے قریب دفن ہو سکوں۔ کیا ایسا ہو سکتا ہے؟ کیوں نہیں، زندگی میں نہ سہی مر کر تو تمہاری قربت حاصل کر سکتی ہوں۔

بہت دنوں سے خاموش دیے کی لو دھیمے دھیمے روشن ہوتی ہے۔ ایک سکون بھری روشنی کا ہالہ میرے چاروں طرف کھنچ جاتا ہے۔ صندل کا قلم تمہارے سرہانے رکھ دیتی ہوں۔ میری طرف سے قبول کرو۔ غم کی ساری پرچھائیاں جانے کہاں چھپ گئیں۔ بس آخری امید کے شعلے کی گرمی میرا سارا وجود جلائے دے رہی ہے۔

شام ڈھل گئی ہے۔ پیڑوں کے سائے بہشت زہرہ کی قبروں پر جھک گئے ہیں۔ تمہیں اُن سایوں کے سپرد کر کے قبر کے اندھیرے کو سینے میں چھپائے باہر آتی ہوں۔

شامی کاغذ

کمرے کے بیچوں بیچ قالین پر بچھے سفرے پر پھل سجے تھے۔ لوگ آرہے تھے اور جارہے تھے۔ پرسے کی یہ رسم تو اب زندگی بھر چلے گی۔ سیاہ چادروں میں لپٹی عورتیں ابابیلوں کی طرح کمرے کے چاروں طرف آنکھیں پونچھتی، ناک سڑکتی گھوم رہی تھیں اور ابابیلوں سے بھرے اس کمرے میں پاشا کسی سوکھی ندی کی طرح خاموش نڈھال پڑی تھی۔ اس کے چاروں طرف اتنے لوگ، اتنی آہیں، اتنے آنسو، آخر اس کا اپنا غم اتنا سرے عام کیوں ہو رہا ہے؟

'سچ تم نے محسن کو نہیں دیکھا؟' پہلی عورت نے کہا۔

'میں شادی میں کب آئی تھی۔' دوسری عورت نے سیب کاٹتے ہوئے جواب دیا۔

'اچھا! وہ ادھر تیسری تصویر محسن کی ہے۔' پہلی عورت نے بتایا۔

'میں انار کھاؤں گا، سیب نہیں۔' لڑکا ٹھنکا۔

'چپ! پدر سوختے! گھر نہیں ہے۔' دوسری عورت نے بچے کو کہنی ماری۔

'ارے! اب بھلا بچہ کیا سمجھے۔' پہلی عورت نے انار اٹھاتے ہوئے کہا۔ 'لو بیٹے میں تمہارے لئے انار گھلا دیتی ہوں۔' یہ کہہ کر اس نے انار کو انگلیوں سے دبانا شروع کر دیا۔

'ابھی تو ٹریننگ میں تھا نا؟' دوسری نے چادر سے سر کو ڈھک کر کہا۔ بچہ دونوں عورتوں کے بیچ میں گھٹنوں کے بل بیٹھا انار کا انتظار کر رہا تھا۔

'ہاں، ابھی سال بھر باقی تھا۔' پہلی عورت نے انار کے پلپلے خول میں چھید کر کے بچے کو تھما دیا۔ بچے نے تیزی سے انار کے رس کو دو تین گھونٹ میں ہی چوس کر ختم کر دیا۔

پاشا کو یوں پتھرائی ہوئی دیکھ کر بوڑھی عورتیں گھبرانے لگیں۔ کہیں اس کو کچھ ہو نہ جائے؟ کچھ سوچ کر کالی سفید چھینٹ دار چادروں میں لپٹی عورتوں نے پاشا کو گھیر لیا اور پاشا کو رلانے کی ترکیبیں کرنے لگیں۔ مگر پاشا بھی جانے کس موم کی بنی ہوئی تھی کہ پگھلتی ہی نہ تھی۔ بس آنکھوں سے نکلتی لو کی دھدھکتی آنچ بتا رہی تھی کہ شمع روشن ہے۔ مگر سلگنے کے باوجود لوگ گرم پگھلتے موم کو دیکھنے کے لئے بے چین تھے۔

دروازے کے پاس آنے والی عورتوں اور ساتھ ہی جانے والی عورتوں کی بھیڑ لگی تھی۔ پاشا کے پاس پہنچنے سے پہلے ہی وہ اپنے جذبات کا تبادلہ کر رہی تھیں۔

'کاش! بچہ ہوتا تو یہ حالت نہ ہوتی! غم بھی آسانی سے بٹ جاتا۔' کسی نے اپنے کھٹے میٹھے تجربے کی روشنی میں کہا۔

'تمہیں کیا پتہ، شاید ہونے والا ہو؟' دوسری نے امید دکھائی۔

'ہاں! کیوں نہیں، ابھی ہفتے بھر پہلے محسن یہیں تو تھا۔'

'ارے جس دن یہاں سے گیا ہے اسی دن تو حادثہ ہوا ہے نا۔' ٹھنڈی سانس بھر کر کسی نے کہا۔

'بیچاری کی گود بھر جائے تو اچھا ہے۔'

'کیا اچھا ہو؟ کہو کہ بچہ نہ ہو تو اچھا ہے۔ کم سے کم سکون سے دوسری زندگی تو شروع کر سکے گی۔' کسی تجربے کار عورت نے سب کو ڈانٹ بتائی۔

'بات تو ٹھیک ہے، یہی عمر ہے شوہر کرنے کی، پھر نیا شوہر دوسرے کے بچے کو رکھنا پسند کرے یا نہ کرے؟'

'بڑی مصیبت ہے اس عمر میں۔'

'کچی مٹی ہے بیچاری کی۔'

پاشا سوچ رہی تھی—روز اس کے غم کے صحرا سے گزرنے والے ایسے کتنے کارواں آتے ہیں، جن کے بیچ وہ یادوں کی آندھیوں کے طوفانی تھپیڑوں میں ڈگمگاتی، تنہائی کے لئے بھٹکتی رہتی ہے کہ

کاش!ان ریت کے طوفانوں کے بیچ اس کو اپنے کمرے کا خاموش کنارانصیب ہو جائے جہاں وہ محسن کے کپڑوں سے اٹھتی لپٹوں کی خوشبو کے بادلوں میں ڈوب جائے اور یادوں کے قافلے پر بیٹھی وہ سارے بیتے دنوں کے فاصلے طے کرڈالے جن کا سفر تین سال پہلے شروع ہوا تھا۔ پہلی ملاقات سے ہی تو دونوں کی سانسوں کا حساب ایک ہوگیا تھا۔ مگر اب یوں بیچ میں ہی محسن نے اپنی سانسوں کو سمیٹ کر اس کی زندگی کے حساب کو ہی غلط کردیا تھا۔اب تو صرف سامنے پانی سے پھیلے دائروں کا کبھی نہ ختم ہونے والا سمندر رہے۔

محسن سے بچھڑے ہوئے آج پورے دو ہفتے گزر گئے ہیں۔پاشا کو لگتا ہے صدیوں سے وہ اتنی ہی تنہا اور خاموش تھی، بلکہ اس کو اپنے پتھر دل پر تعجب ہو تا کہ وہ رونا تو بھولی سو بھولی، ہنسنا بھی بھول گئی؟ ہنسنے کی تو اسے عادت تھی، مگر اس سب کے بعد بھی اس پتھر دل میں بھی ایک شگاف تھا جس میں ایک ننھی سی خواہش سوئی پڑی تھی کہ کاش! محسن کی آخری نشانی اسے مل جائے۔ ہو سکتا ہے اس کا جزاس کے اندر پنپ رہا ہو؟

'......خدایا! مجھے لڑکا دینا، ایک دم محسن کی طرح، وہی ابرو، وہی ہنسی، وہی آنکھیں...... میں پوری زندگی بغیر کسی شکایت کے کاٹ دوں گی۔'پاشا دوزانو قالین پر آنکھیں بند کر کے بیٹھ گئی۔اس کا رواں رواں دعا مانگ رہا ہے۔ تبھی ایک خیال ابھرا،'اگر ایسا نہ ہوا تو...... تو میں کیا کروں گی؟پاشا تڑپ کر کھڑی ہوئی اور کمرے میں ٹہلنے لگی،'سچ!تب میں کیا کروں گی؟'اس خیال سے گھبرا کر وہ کھڑکی کی طرف گئی۔ کھڑکی کھول دی۔ پھر جب کچھ سمجھ میں نہ آیا تو گھٹنوں میں سر رکھ کر بیٹھ گئی۔'نہیں، ایسا نہیں ہوگا۔ ہرگز نہیں ہوگا! یہ صرف میرا وہم ہے۔'اس نے چہرے کو اوپر اٹھایا، رومال سے آنکھیں پونچھیں، مجھے امید کا دامن نہیں چھوڑنا چاہئے— بلکہ مجھے خوش رہنا چاہئے تاکہ بچے کی صحت پر برا اثر نہ پڑے۔'تب رومال سے وہ دیوانہ وار آنسوؤں کو روکتی وارڈروب کھول کر محسن کے کپڑوں میں چہرہ چھپا کر لمبی لمبی سانسیں بھرنے لگی۔ آنسوؤں کے سیلاب کو خوشبوؤں کے بادلوں نے اپنے میں جذب کرلیا اور پاشا اپنے کو سنبھالتی ہوئی وارڈروب بند کر کے پلنگ پر ڈھیر ہوگئی۔

فرزانہ خانم دروازے کے پاس آئیں۔پاشا کو یوں آنکھوں پر ہاتھ رکھے لیٹا دیکھ کر، اسے سوتا جان کر

لوٹ گئیں۔ مگر سچائی یہ ہے کہ پاشا سو نہیں، جاگ رہی ہے اور گزرے لمحوں کے پیوند حال میں لگا کر جینے کی کوشش کر رہی ہے۔ یوں سوتا نظر آنا اسے زیادہ سکون دیتا ہے۔ کم سے کم وہ اپنی مرضی سے سوچ تو سکتی ہے، ورنہ ہر دم بھیڑ سے گھری صرف دنیاداری کے دکھ بھرے لفظوں سے اپنے عزت نفس کو زخمی ہوتا ہی دیکھتی ہے۔ بھلا کوئی ہے دنیا میں، جو محسن کا غم اس سے بانٹ سکے۔ محسن کی طرح اس کا غم بھی تو اس کا اپنا ہے، اس میں کسی کا حق نہیں ہے۔ کوئی اس کا حصہ دار نہیں۔ اسے معلوم ہے، اس گھر میں اس وقت کیا ہو رہا ہے۔ بہنیں پاس کے کمرے میں سلائی کر رہی ہیں۔ ماں گھر کے آنگن میں حوض کے کنارے انار کے پیڑوں کے نیچے پڑوسنوں سے بیٹھی باتیں کر رہی ہیں۔ راشدہ خالہ حقہ پی رہی ہیں اور تمبا کو کی خوشبو اس کے نتھنوں میں بس رہی ہے۔ ماریا جھولا جھول رہی ہے۔ زنجیر سے نکلتی چوں چوں کی آواز اسے سنائی پڑ رہی ہے۔ پچھواڑے خانم زندے دل کپڑا دھوتے ہوئے لُند (لوک گیت کی ایک قسم) گا رہی ہے۔ اس کا مطلب ذہن میں آتے ہی کلیجہ دھک دھک کرنے لگا۔

'میں کل رات آئی مگر تم گھر پر نہ تھے
سچ کہو، کہاں گئے ہوئے تھے
یاد نہیں، کہا تھا کہ میرے قریب رہو گے؟
خدا کی قسم سقّے خانے گیا تھا
جو شمع تمہیں پانے کے لئے جلائی تھی
اسے مراد پالینے کے بعد بڑھانے گیا تھا
جھوٹ نہ بولو، جھوٹ نہ بولو، یہ لفظ پھر نہ کہنا
تم میری رقیب کے ساتھ جاجے ندی پر دیکھے گئے تھے
جہاں ندی کے کنارے بیٹھے اس سے باتوں میں ڈوبے تھے'

اس لُند کے اٹھتے گرتے سروں میں شب یلدا (۲۵ دسمبر کی رات) آنکھوں میں تیر گئی۔ کتنا مزہ آیا تھا! اس دن بھی خانم زندے دل میوے سجاتے ہوئے یہی لُند گا رہی تھیں۔ دونوں گھروں کی بیٹھک کی کھڑکیاں آمنے سامنے ہی کھلتی تھیں۔ محسن نے شرارتیں شروع کیں۔ اس کے مذاق پر جب زندے دل شرما گئیں تو اور طوفان مچا، اور مزے کی بات یہ کہ اس مذاق میں خود زندے دل کے

شوہر سب سے زیادہ مزہ لے رہے تھے اور اسے چھیڑ رہے تھے۔

فرزانہ خانم کو اکیلی لوٹتے دیکھ کر کسی مہمان عورت نے پوچھا — 'کیوں پاشا سو رہی ہے؟'

'ہاں! لیٹی ہے۔' فرزانہ خانم تھوڑا شرمندہ ہو کر بولیں۔ انہیں بیٹی کو اٹھانا اچھا نہیں لگا اور ادھر بیس میل دور سے آئیں پرسے والیاں۔

'چلو، پھر مل لوں گی۔ ایسی حالت میں کچھ لڑکیوں کو نیند بہت آتی ہے۔'

'کیا سچ مچ پاشا کے پیر بھاری ہیں؟'

'کچھ کہہ نہیں سکتی۔ پوچھنے کی ہمت کس میں ہے۔ وہ تو جب کبھی بولتی بھی ہے تو لگتا ہے کہیں ٹوٹ نہ جائیں۔' فرزانہ خانم نے آنسو پونچھے۔

'اتنی خاموش رہنا ٹھیک نہیں ہے۔ پہلے ہی دھان پان تھی۔ اس غم نے تو جیسے خون ہی نچوڑ لیا ہے۔'

'ہاں، جس پر پڑتی ہے وہی جانتا ہے۔' راشدہ خالہ نے حقہ گڑگڑایا۔

اسی وقت یکایک شیریں خانم تیزی سے داخل ہوئیں۔ سر پر اوڑھی چادر کو اتار کر انار کی شاخ پر ڈال کر بولیں — 'خدا کی قسم ذرا میرے بالوں کو تو دیکھو۔'

سب کی نظریں ایک ساتھ ان کے سر پر ٹک گئیں۔ گہرے کتھئی بالوں پر چند سنہری لٹیں ایسی لگ رہی تھیں کہ جیسے بھٹے کے بالوں کو جان بوجھ کر چپکایا گیا ہو۔

'ہوا کیسے؟' ایک نے بالوں کو چھوتے ہوئے کہا۔

'ارے صبح صبح سہیلا مجھ سے دھاگہ مانگنے آئی تھی۔ مجھے ڈائی کے انتظام میں لگا ہوا دیکھ کر بولی، لایئے خالہ، میں آپ کے بال ڈائی کر دوں، میں نے شامتِ اعمال، ہاں کر دی۔'

اسی وقت کپڑوں کی کترنوں کو ہاتھ میں پکڑے سہیلا باہر نکلی۔

'وہ دیکھو! آ تو رہی ہے۔ پوچھو میرے بالوں کا کیوں ستیاناس کیا ہے اس نے!' شیریں خانم کے اس طرح کے کہنے سے سب سہیلا کی طرف دیکھنے لگیں۔ پہلے سہیلا سپٹائی، پھر بڑی نرمی کے ساتھ

افسوس کااظہار کرنے لگی۔

'خالہ میں کیا کرتی ؟ڈائی ہی کم تھا۔دوسرے اسٹاک بھی پرانا۔ آپ سے تو ہمیشہ کہتی ہوں کہ ڈائی وغیرہ چھوٹی دکانوں سے مت لیا کیجئے۔'

'لواور سنو! خیر اب اپنی اس بربادی کو ٹھیک کرانے میں بیوٹی سیلون جارہی ہوں۔' شیریں خانم نے اٹھتے ہوئے کہا۔

'ارے بیٹھو بھی۔'

'نہیں بھائی تمہارے بہنوئی کے آنے سے پہلے یہ حلیہ ٹھیک کرالوں۔ارے ہاں! یہ لو فرزانہ جان کنجی، سعید شام کو آئے گا لیکن تمہارے بہنوئی ذرا جلدی آئیں گے،انہیں بتاکر یہ کنجی دے دینا۔' شیریں خانم نے چادر سے بدن کو لپیٹااور پرس لے کر چلنے لگیں۔

'شام کا کھانا ہمارے یہاں کھانا،میں انتظار کروں گی۔'

'میں کھانا پکا کر آئی ہوں۔ مجھے معلوم ہے کہ دیر ہو جائے گی۔ تم فکر مت کرو۔'

'ارے وہ کل استعمال کرلینا آج ہماری ہی نان ونمک سہی۔'

'اچھا! تو پھر میں ذرا بھوؤں کی پلاکنگ اور ناخن کی پالیشنگ بھی کروا آؤں گی،اچھاخداحافظ!' وہ کہتی ہوئی سینڈل کی کھٹ کھٹ کے ساتھ باہر نکل گئیں۔

عورتیں دوبارہ باتوں میں ڈوب گئیں۔اندر کمرے میں سہیلا کے لوٹنے پر نجمہ نے اسے غور سے دیکھتے ہوئے کہا— 'سچ بتاناڈائی کم پڑاتھا؟'

سہیلا کھلکھلا پڑی، 'کبھی ڈائی بھی کم پڑا ہے؟ یہ سب تو جان بوجھ کر کیا ہے میں نے۔'

'کیوں۔'

'یوں ہی شرارت سوجھی۔اس عمر میں سنہرے بالوں کی کیا ضرورت ہے؟'

'کسی دن تم ماں کے ہاتھوں پٹو گی کہ ان کی سہیلیوں کی کھینچائی کرتی ہو۔' نجمہ نے سوئی میں دھاگہ

ڈالتے ہوئے کہا۔

'جب پکڑی جاؤں گی تب ہی تو پٹوں گی؟ اچھا سلائی ختم کرو، مجھے ہوم ورک کرنا ہے۔'

'ہاں بس یہ بٹن ٹانک کر چلتی ہوں کچن میں۔' نجمہ نے تیزی سے ہاتھ چلاتے ہوئے کہا۔

'سنو! محمود کے آنے پر شاید کچھ گھر کا ماحول بدلے اور پتہ نہیں۔ میری لکھی چیزیں لاتے بھی ہیں یا نہیں۔' سہیلا نے تیزی سے نئی سلی اسکرٹ پر آئرن کرتے ہوئے کہا۔

'سچ ہے، پاشا کی خاموشی نے تو غم منانے کی سمجھ بھی ہم سے چھین لی ہے کہ کب رویا جائے اور کب خاموش رہا جائے۔'

'ارے نجمہ! میں یقین سے کہہ سکتی ہوں۔ پاشا اکیلے میں ضرور روتی ہوگی۔' سہیلا نے تیزی سے کہا۔

'ہاں اس میں شک کیا ہے؟ میں تو اکثر پریشان ہو کر کی ہول میں جھانکتی ہوں مگر کچھ چپ چاپ سوچتی رہتی ہیں۔ روتے تو کم ہی دیکھا ہے۔' نجمہ نے اداسی سے کہا۔

'ارے بھول جائیں گی، ذرا وقت گزرنے دو سب ٹھیک ہو جائے گا۔' سہیلا نے تیزی سے پلگ نکالتے ہوئے کہا۔

'نہیں شاید کبھی نہ بھول پائے، جو رشتہ ان میں اور محسن میں تھا وہ ایک معمولی میاں بیوی، مرد عورت کا نہیں تھا سہیلا۔'

'پھر کیا بھوتوں والا رشتہ تھا۔' سہیلا بولی۔

'اس رشتے اور اس احساس کا کوئی نام نہیں ہے۔ بس وہ محسوس کیا جا سکتا ہے۔ اس کے لئے لفظ کی ضرورت نہیں۔'

'تم ٹھیک تو ہو نا؟' سہیلا نے فکر مند ہو کر پوچھا۔

'ہاں، میں ٹھیک ہوں۔ تمہیں سب کچھ مذاق لگتا ہے کیونکہ تم تین سال پہلے اس سے بھی زیادہ احمق اور چھوٹی تھی۔ لیکن میں تو سب کچھ دیکھتی آ رہی ہوں۔ پاشا زندہ کیسے ہیں۔ میں ہوتی تو بچ اب تک

مر گئی ہوتی۔'

'پاشا کی جگہ کہیں تم تو پاگل نہیں ہو رہی ہو؟'

'شاید۔' نجمہ نے مشین بند کرتے ہوئے کہا۔

'مگر اس نے محسوس کیا کیا؟' نجمہ کی اداسی دیکھ کر سہیلا نے پوچھا۔

'کہا تو کہ لفظ وہ احساس پیدا نہیں کر سکتے، جو نظریں دیکھ کر سمجھ لیتی ہیں۔'

'کوئی فلم کی مثال دے دو نا!' سہیلا نے نجمہ کی مشکل آسان کر دی۔

'کچھ بولو بھی! ادھر پاشا خاموش ادھر تم جانے کیسی الٹی سیدھی باتیں کر رہی ہو۔' سہیلا نے اکتا کر پھر کہا۔

'پچھلی بار نوروز میں شادی سے پہلے جب محسن آئے تھے تو دونوں گھر کے پیچھے بیدِ مجنوں کے پیڑ کے نیچے بیٹھے تھے۔ انہیں نہیں پتہ تھا کہ میں پیچھے کھڑی انجیریں پھیلا رہی ہوں۔'

نجمہ کو پھر خاموش دیکھ کر سہیلا نے گشن گود میں لے کر کہا — 'پھر کیا ہوا؟'

'بس دونوں بیٹھے رہے، لیکن جن نظروں سے وہ ایک دوسرے کو دیکھ رہے تھے ان میں بس ایک ہی بات تھی کہ وہ ایک دوسرے کو جانے کتنی گہرائی سے سمجھ چکے ہیں۔'

'یہ کوئی بات ہوئی؟' سہیلا نے گشن کو دیوار سے لگایا۔

'تم سب باتیں نہیں سمجھتی ہو، اچھا ہے ورنہ سمجھنے والوں کے لئے یہ دنیا بڑی سخت ہے۔'

'توبہ ہے، کچھ پھوٹو تو!' سہیلا جھنجلا گئی۔ اس کے دماغ میں فلمی ناولوں کے اتنے رومانی سین گھوم رہے تھے کہ......

'محسن خاموشی سے پاشا کو دیکھ رہے تھے، پھر بہت آہستہ سے پاشا کی آنکھوں، ہونٹوں پر انگلی پھیری اور پاشا خاموش تنے سے پیٹھ لگائے آنکھیں بند کئے بیٹھی تھیں۔ اس وقت لگ رہا تھا کہ دنیا سے سارے جذبے، ساری حقیقتیں مٹ گئی ہیں۔ بس ایک سچائی رہ گئی ہے جو محسن اور پاشا کی آنکھوں میں تیر رہی تھی۔ وہ کشش، جو ایک دوسرے پر پھوٹ رہی تھی، لگا تھا، اس کی روشنی میں ساری دنیا نہا گئی تھی۔'

'پھر کیا ہوا؟' کچھ سننے کچھ جاننے کی امید اور بے چینی سے بھری ۱۴ سال کی سہیلا نجمہ کے سامنے آگئی۔

'دونوں خاموشی سے کھڑے ہوئے......'

'پھر؟' سہیلا کا دل دھڑکنے لگا۔

'کمر میں ہاتھ ڈالے چائے پینے اندر چلے آئے۔'

'بس!' سہیلا نے حیرت سے پوچھا۔

'اور کیا کرتے؟' نجمہ نے آنسو پونچھنا شروع کیا۔

'اف، نجمہ!' سہیلا نے برا سا منہ بنایا۔ اسے نجمہ کا دماغی پیچ بھی ڈھیلا لگنے لگا تھا۔ کھسیا کر اٹھنے لگی تب ہی باہر کسی کے پیروں کی آواز سنائی پڑی۔

'شاید پاشا ہے۔' سہیلا اچکی۔ نجمہ تیزی سے باتھ روم میں چلی گئی۔

نوروز قریب ہے۔ گھر میں اس کی آمد کی کوئی امنگ نظر نہیں آرہی ہے پھر بھی پاشا بڑی سی پلیٹ میں گیہوں بو رہی ہے تاکہ نوروز تک انکھوئے لمبے ہو جائیں۔

'پاشا! چلو تھوڑا شاپنگ کر کے آتے ہیں۔'

'آج نہیں محمود، پھر کسی دن۔'

'وعدہ رہا نا۔ بہت فرمائشیں ہیں۔ وہ بھی لڑکیوں کی زیادہ ہیں۔ اور میں ٹھہرا اس معاملے میں ایک دم کورا۔'

'آج معاف کرو۔ میں امریکہ لوٹنے سے پہلے تمہاری ساری شاپنگ کرا دوں گی۔'

'ٹھیک ہے میں چلتا ہوں۔'

رات کو کھانے کے بعد سارے لوگ کمرے میں بیٹھے گپ مار رہے تھے تبھی ان کو چیخ سی سنائی پڑی۔ سب بنا کچھ سمجھے انجانے میں ہی پاشا کے کمرے کی طرف بھاگے۔ پاشا بری طرح آنسوؤں میں ڈوبی تڑپ رہی تھی۔ اس کی بے چینی، بے قراری کو دیکھ کر فرزانہ خانم نے اسے اپنی گود میں بھر لیا، 'میری بیٹی، میری پاشا، بولو کیا ہوا تمہیں؟ یکایک کیا ہو گیا میری جانا! بول میرے بیٹے!'

فرزانہ خانم بلبلا کر سوال کر رہی تھیں۔ باقی لوگوں کو سانپ سونگھ گیا تھا۔ یکایک اس باندھ کے ٹوٹنے کا سبب؟ اس پورے مہینہ میں کوئی ایسا لمحہ کسی کو یاد نہ تھا کہ جس میں پاشا مسکرائی ہو یا روئی ہو۔ آنکھیں ضرور بتاتی تھیں کہ یا تو رات بھر سوئی نہیں یا پھر روئی ہے مگر یوں سب کے سامنے ٹوٹ کر بکھری نہیں تھی۔ آج تو پانی سے بھرے تالاب میں ڈوب رہی ہے۔ پہلے دن اسی منظر کی چاہ میں عورتیں ناامید لوٹی تھیں اور آج بنا کسی وجہ کے ٹوٹتے باندھ کو روکنے کا حوصلہ کسی میں نہ تھا، بلکہ سب اس تیز بہتے سیلاب میں بہہ گئے تھے۔ کسی کو پتہ نہ تھا کہ اتنے دنوں بعد یوں کورس میں رونے کی وجہ کیا ہے؟

موقعے بہت آئے تھے۔ اس دن جب ٹیلر محسن کا سوٹ لایا تو سب نے پاشا کی دلدوز چیخ سننے کی امید میں سانس روک لی تھی کہ اسے سنبھالا کیسے جائے گا؟ مگر کچھ بھی نہ ہوا۔ وہ خاموشی سے کانپتے ہاتھوں سے سوٹ کا بنڈل اٹھائے نرم چال سے سگریٹ سے نکلے دھوئیں کی طرح آہستہ آہستہ کمرے کی طرف بڑھی۔ اسے یوں جاتا دیکھ کر فرزانہ خانم دیوانہ وار پیچھے بھاگیں لیکن پاشا الماری میں سوٹ ٹانگ کر لوٹ آئی۔ جانے وہ دھوئیں کی بل کھاتی بند لکیر کہاں گم ہو گئی؟ سب کو سکتہ سا ہو گیا۔ سمجھ نہ سکے کہ کیا کرے۔ پہل سہیلانے کی۔ وہ نل کی تیز دھار میں برتن دھونے لگی۔ نجمہ نے پریشان ہو کر تیزی سے پٹرے پر رکھے ساگ کو چاقو سے کاٹنا شروع کر دیا۔ فرزانہ خانم اسی طرح پگلائیں جب کچھ نہ سمجھ پائی تو ایک دم سے واشنگ مشین میں صاف چادروں کے ساتھ ماریا کا آدھا بنا سویٹر بھی ڈال دیا۔

پاشا حوض تک آئی اور ربر لگا کر پیڑوں پر پانی ڈالنے لگی۔ علی فقیہی اپنے کو روکتے روکتے بھی ہاتھ میں پکڑی تسبیح کو توڑ چکے تھے۔ پیروں کے پاس دانے بکھرے پڑے تھے۔

بس محمود ہاتھوں کو گردن کے پیچھے کئے خاموشی سے کرسی پر بیٹھا پاشا کو دیکھ رہا تھا۔ پاشا کی آنکھوں

میں گھرے بادل کتنے نیچے اتر آئے ہیں۔ کاش! برس ہی جاتے! پاشا اس کے ساتھ اسی گھر میں کھیل کود کر پلی بڑھی تھی۔ اس کی ہر غلطی کا الزام اپنے اوپر لے لیتی۔ محمود پاشا کے چچا کا لڑکا تھا۔ گاؤں میں اتنی بڑی کاشت کاری کو چھوڑا نہیں جا سکتا تھا۔ اس وجہ سے محمود چچا کے گھر رہ کر پڑھا اور یہیں سے جرمنی پھر امریکہ گیا۔ اس کا دل پاشا کے لئے ایک دوست کے ساتھی کی طرح دکھتا تھا۔ اس کے سب سے اچھے دوست محسن کے ساتھ پاشا کا تین سال رومانس رہا اور پھر صرف سات ماہ شادی شدہ زندگی! پاشا کے دکھ کو کیسے بانٹوں؟ ایسی غیرت دار ہے کہ کسی کو اپنا ہمراز بھی تو نہیں بناتی۔ لگتا ہے محسن کی یاد کا زہر اسے ختم کر دے گا۔

مگر آج پاشا کی آنکھوں سے چھائے بادلوں کو یوں ٹوٹ کر برستے دیکھ کر اگر کسی کی آنکھیں نہیں بھیگیں تو وہ تھیں محمود کی۔ اسے بڑا اطمینان محسوس ہوا کہ چلو پاشا پھوٹی تو ورنہ یہ لاوا تو اس کو اندر اندر جلا کر راکھ کر دیتا۔ تبھی پاشا نڈھال 'م...... ہ...... را...... ن......' کہتی ہوئی بے ہوش ہو گئی۔

'کل سے امتحان شروع ہیں اور تم بچہ کھلا رہی ہو؟' فرزانہ خانم نے ماریہ کو ڈانٹا جو تین مہینے کے بچے کو گود میں لئے تھی۔

'بس اب کتاب کھول کر بیٹھو!' علی فقیہی کی ڈانٹ سے ماریہ بچے کو لے کر جانے لگی۔

'ادھر لاؤ۔' پاشا نے ماریہ کو روکا اور اس کی گود سے بچے کو لے لیا۔ سب نے پاشا کو دیکھا۔ پاشا بچے کو گود میں لے کر آنگن میں پڑے جھولے پر بیٹھ گئی۔ 'کتنا اچھا لگ رہا ہے اسے گود میں لینا، جیسے بادلوں کو اٹھا رکھا ہو!' پاشا سوچنے لگی۔

'صدیقے کا ہے نا؟' پاشا نے ماریہ سے پوچھا۔

'ہاں۔' ماریہ کمرے کی طرف بھاگی۔

'ماں دیکھو۔ کیسے سنہرے بالوں والا سفید سا چینی گڈا لگ رہا ہے۔' کہہ کر پاشا نے بچے کے سر کو پیار کیا۔

'ماں پر گیا ہے، صدیقے بھی تو خوبصورت ہے۔'

بچہ گود کی گرمی اور جھولے کے دھیرے دھیرے ہلنے سے سو گیا۔

دھوپ انار کے پیڑ کے نیچے حوض تک آ گئی تھی۔ پاشا گود میں بچے کو لئے اسی طرح بیٹھی تھی۔ سب کے ہنسنے بولنے سے بچہ جاگ گیا اور پاشا کی چھاتی میں منہ مارنے لگا۔ پاشا کا منہ ایک عجیب احساس سے لال ہو گیا اور اسے گدگدی سی محسوس ہونے لگی۔ لگا سارے بدن میں کرنٹ سا دوڑ رہا ہے اور بدن کے سارے روئیں کھڑے ہو گئے ہیں۔ اس نے لیٹے ہوئے بچے کو گود میں اٹھا کر بٹھایا۔

'لاؤ میں بچہ واپس کر آؤں۔ بھوکا ہوگا۔' ماریہ بچے کو لے کر چلی گئی۔ پاشا کے پتھر جیسے بدن میں جو تھوڑی دیر پہلے ہلچل سی ہوئی تھی، زندگی پھوٹی تھی، پھر سو گئی۔ اور محمود کو لگا کہ پاشا کی آنکھوں میں تھوڑی دیر پہلے چمکتے موتی برف کی بارش میں بدل گئے ہیں اور وہ پھر خاموش جھولے کی زنجیر سے سر ٹکائے جانے کہاں کھو گئی ہے۔

بچہ آدھے سے زیادہ وقت یہیں پاشا کے پاس گزارنے لگا تھا۔ دودھ کی بوتل ساتھ بھیج دی جاتی تھی۔ بچہ بھی مست گود گود پھرتا رہتا تھا اور صدیقے خانم آرام سے دوپہر میں فلم شاپنگ وغیرہ ہو آتیں۔ وہ پندرہ دن کے لئے مائکے آئی ہیں۔ کل دوپہر کو واپس بھی جانا ہے۔ پندرہ دن گزر گئے، پتہ ہی نہ چلا۔

'میں تم کو، تمہارے جز کو اپنے میں ڈوبتا، اپنے میں کھلتا دیکھنا چاہتی تھی۔ تمہیں دوسرا جنم دینا چاہتی تھی۔ مگر...... میرے وجود کی سیاہی نے تم کو، تمہارے جز کو بھی مٹا دیا...... میں تم کو اپنے میں دہرانا چاہتی تھی۔ تمہیں اپنے آغوش میں سمیٹنا چاہتی تھی، مگر...... تمہاری سانسوں کی گرمی کی چاہ بس چاہ ہی رہ گئی۔'

'پاشا نیچے آؤ، دیکھو صدیقے خانم ملنے آئی ہیں۔' فرزانہ خانم کی آواز پاشا تک پہنچی ہی نہ تھی۔

'میرا وجود ریگستان ہے، برسوں کا پیاسا۔ جتنا بھی پانی برسے، خشک کا خشک۔ میں ننگی ریتیلی دھرتی ہوں جس پر دور دور تک نہ کوئی سایہ ہے، نہ پرچھائیں۔ بس تیز دھوپ سے چٹخی بڑی بڑی دراروں میں بھر بھری ریت کا ڈھیر ہوں، جو ہواؤں کے رحم و کرم پر ادھر سے ادھر اڑتی رہتی ہے۔' کہتے کہتے پاشا ئل کے نیچے کپڑوں سمیت کھڑی ہو گئی—'اف، کتنی گرمی ہے! تیز لو کے ان تھپیڑوں میں

ایک دن میں جھلس جاؤں گی۔'

نیچے بہتے پانی کو دیکھ کر فرزانہ خانم چونک اٹھیں۔ آخر پاشا اوپر کیا کر رہی ہے؟

'خالہ، میں چلتی ہوں۔ بس جانے کا وقت بھی ہو رہا ہے۔' صدیقے نے لمبے انتظار کے بعد کہا۔

'اچھا بیٹی، جانے پاشا کیا کر رہی ہے، جواب بھی نہیں دیا۔'

صدیقے خانم کے جانے کے بعد فرزانہ خانم اوپر پہنچیں۔ غسل خانے کا دروازہ بند نہ تھا، ورنہ اکتوبر کی اس ٹھنڈ میں پاشا کا جانے کیا حال ہوتا۔

'پاشا، یہ کیا؟ یوں کپڑوں سمیت کوئی نہاتا ہے! چلو کپڑے بدلو۔ کتنا ٹھنڈا پانی ہے۔'

'میں تو بس اپنے کو سیراب کرنے کے لئے نل کے نیچے کھڑی ہو گئی تھی، کتنی سوکھ گئی ہوں ماں دیکھو۔'

'اچھا چلو، یہ رہا گرم اسکرٹ اور سوئیٹر۔'

'تم رو رہی ہو! خوش قسمت ہو، ماں! یہاں تو اب آنسو ہی نہیں نکلتے۔ بس ریتیلی آندھیاں ہی چلتی ہیں۔'

'میں چائے بناتی ہوں، تم کپڑے بدلو۔' فرزانہ خانم جاتے جاتے باتھ روم میں تالا ڈال گئیں۔

باہر تیزی سے بارش ہو رہی ہے۔ پاشا کھڑکی کھولے باہر اندھیرے میں دیکھ رہی ہے۔ پت جھڑ میں ہونے والی اس بارش کا مطلب ہی دوسرا ہے۔ رنگ بدلتی پتیاں گرتے سوکھے پتوں سے سرخ راستے، چرمر چرمر کی آواز سے گونجتی فضا، پکتے پھلوں سے جھکی ڈالیاں — سب کچھ کتنا معنی خیز ہے! بہار کبھی سوچنے کا موقع ہی نہیں دیتی۔ وہ ایک ابال ہے — قہقہوں کا، خوشی کا، خوبصورتی کا۔ مگر یہ بارش! پاشا دروازہ کھول کر باہر باغ میں نکل آئی۔ پانی کی بوندیں سر اور اس کے بدن کو بھگونے لگیں۔ اس بارش کی زبان میں سمجھتی ہوں۔ مگر میرے جذبے کو کیا یہ ٹپکتی بوندیں سمجھ سکتی ہیں؟

پاشا دھیرے دھیرے چلتی ہوئی کیاری کے پاس کھڑی ہو گئی۔ کاش! تمہارے لمس سے چھوتی یہ

بوندیں زمین پر گر کر کچھ بن جائیں؟ جنہیں میں اپنا بلکہ تمہارا اور میرا کہہ سکوں۔ مجھ سے اچھے یہ پھل پھول ہیں جو اپنا پراگ، اپنے بیج ہواؤں سے دور دور بکھیر کر اپنے جز کو جنم دیتے ہیں۔ اور میں تم کو کھو کر دوبارہ نہیں پا سکتی ہوں۔ تمہارے سارے زندہ لمس، جو میرے جسم پر موجود ہیں، انہیں جما کر میں مہران نہیں بنا سکتی ہوں...... نہ تمہارا رشتہ دنیا کی کسی چیز سے باندھ سکتی ہوں۔ نہ ان پھولوں سے، نہ چاند تاروں سے، نہ اپنے آپ سے...... کیا ایسا ہو سکتا ہے کہ میں اپنے جسم کا حصہ، جس پر تمہارے لمس کی گرمی ہے، اسے اس دھرتی پر بو دوں...... کچھ تو نکلے گا...... مہران نہ سہی...... کوئی پھول، کوئی پودا، کوئی تنکا!...... کچھ بھی، کچھ تو کہنے کے لئے ہو کہ یہ میرا اور تمہارا ہے، صرف ہمارا، صرف ہمارا!

صبح کیاری کے کیچڑ میں لت پت پاشا کو دیکھ کر فرزانہ خانم نے بال نوچ ڈالے اور سارے کپڑے پھاڑ ڈالے۔ بڑی مشکلوں سے علی فقیہی اور محمود پاشا کو اندر لائے۔ نجمہ اور سہیلہ نے روتے کانپتے پاشا کے کپڑے بدلے۔ محمود نے ایمبولنس کے لئے فون کیا۔ علی فقیہی نے کانپتے ہوئے بیوی کو ڈانٹا— 'اپنے کو سنبھالو، ورنہ مجھے کچھ ہو جائے گا، کہا نہ، زندہ ہے، زندہ...... بے ہوش ہو گئی ہے۔ میری بات مانتی کیوں نہیں ہو؟'

ایمبولنس آنے پر محمود نے رضائی میں لپٹی پاشا کو اندر لٹایا۔ گھر میں وہ رونا پیٹنا اور بھیڑ جمع ہو گئی تھی کہ لگتا تھا، دوبارہ کوئی موت ہو گئی ہے۔ محمود اور نجمہ پاشا کو لے کر چلے گئے۔

علی فقیہی نے اوپر والے نل کا کنکشن تو اسی دن کٹوا دیا تھا مگر بارش کا کنکشن کٹوانا ان کے بس کی بات نہ تھی، ورنہ وہ یہ بھی کر کے دکھا دیتے۔

نجمہ اور محمود کو جاگتے ہوئے آج چوتھا دن ہے۔

کبھی کبھی لگتا ہے، نمونیا پاشا کو جینے کا حق چھین لے گا۔ مگر ڈاکٹر جی جان سے لگے ہیں۔ کل سے پاشا کی بیہوشی ٹوٹی ہے، مگر جس طرح کی باتیں وہ کہتی ہے، اس سے لگتا ہے کہ بیماری سے اچھے ہونے کے بعد وہ اپنے ہوش میں نہ ہو گی۔

'محمود، میں گھر جا رہی ہوں، تمہیں کچھ چاہئے؟'

'نہیں، مگر تمہیں کیا ضرورت پڑ گئی، مجھے بتاؤ، میں لاتا ہوں۔'

'نہیں، میرے ہی جانے سے کام بنے گا۔'

'اب سہیلہ بھی تو آنے والی ہے، ٹھہرو نا!'

'میں نے کہا نا! مجھے جانا ہے۔ جانے کیوں، کبھی کبھی آپ ضد کرنے لگتے ہیں۔' نجمہ جھنجلا گئی۔

'اچھا جاؤ۔' محمود نے بہت دھیرے سے کہا۔ عجیب اتفاق ہے کہ چچا کے گھر چار لڑکیاں اور اس کے گھر چار بھائی۔ دونوں طرف کے فقدان کی وجہ چچازاد بھائی بہنوں میں بلا کا پیار تھا۔

یکایک پاشا نے منہ ادھر ادھر تیزی سے کرتے ہوئے گہری گہری سانس لینا شروع کر دیا۔ پھر تیزی سے چہرے کے سامنے ہاتھ چلانے لگی، جیسے کچھ ہٹانے کی کوشش میں ہو...... اف یہ لہریں...... کتنا پانی ہے...... میں میں...... ڈوب......' پاشا بیہوش ہو گئی۔ محمود کبھی ماتھے پر ہاتھ رکھتا، کبھی ہاتھ سہلاتا......'پاشا......! پاشا......!' دھیرے دھیرے محمود نے پکارا۔

'کون؟ مہران......'

'میں محمود ہوں، پاشا!' یہ سننے سے پہلے پاشا بخار کی تیزی میں دوبارہ بے ہوش ہو گئی۔ باہر کار رکی اور تھوڑی دیر بعد سارے لوگ کمرے میں آ گئے۔ سہیلہ سب کے لئے چائے انڈیلنے لگی۔ نجمہ گلدان کے پھول بدلنے لگی ...... 'اے! فرزانہ کی چائے ابھی مت انڈیلو۔' علی فقیہی نے کہا— فرزانہ خانم کچھ پڑھ پڑھ کر پاشا کے پورے جسم پر پھوک مار رہی تھیں۔ ان کا تو کام ہی سقے خانوں، امام باڑوں میں دعا کرنا رہ گیا تھا۔

سب کے جانے کے بعد نجمہ نے تھیلے سے کمبل نکالا۔ 'محمود، میری مدد کیجئے۔'

نجمہ نے اوپر سے کمبل اوڑھانا شروع کیا اور نیچے کے کمبل کو محمود ہٹاتا گیا۔ پھر جب نجمہ کمبل اچھی طرح پاشا کے گرد لپیٹ چکی تو محمود نے اوپر سے دوسرے کمبل ڈال دیئے۔

'ایک بات کہوں، اگر غصہ نہ ہو تو؟'

'کہیئے۔'

'یہ کمبل اوپر سے بھی تو ڈال سکتی تھیں!'

'ہاں، مگر پھر گھر جا کر اس خاص کمبل کو لانے کی ضرورت کیا تھی!'

'کیا مطلب؟'

'یہ کمبل محسن کا ہے۔'

'مگر......!'

'خدایا، محمود آپ تو یوں مگر، کیوں، کیسے نہ پوچھئے۔ کیا آپ کو بھی یہ سب بتانا پڑے گا؟' نجمہ کہہ کر رونے بیٹھ گئی۔ 'ہر وقت سوال سوال خود کچھ نہیں سمجھ سکتے ہیں کیا؟' نجمہ کی بے بسی غصے میں بدل گئی تھی۔

محمود حیرت زدہ سا نجمہ کو دیکھتا رہا۔ کہاں اس کے جذبات کو اس نے ٹھیس پہنچائی ہے؟ پھر کچھ سوچ کر اس نے لمبی سانس کھینچی، شاید اس کی سمجھ میں سب کچھ آ گیا تھا۔ پاشا کے قریب جا کر نیچے کے کمبل کو تھوڑا آگے کھینچ کر اسے پاشا کے چہرے کے نیچے ٹھیک سے دبا دیا۔

پاشا خواب میں بڑبڑائی — 'میرا گھر یہیں گلی میں تو تھا، کہاں گیا؟...... یہاں تک تو راستہ ٹھیک ہے۔ آگے سب کچھ دھوئیں میں کیوں لپٹا ہے...... کچھ نظر ہی نہیں آ رہا ہے۔ مہران! مہران! تیرے بابا کا گھر کتنی دیر سے تلاش کر رہی ہوں۔ تجھے یاد ہے...... نہیں...... چلو کسی سواری پر بیٹھ کر ڈھونڈتے ہیں...... مگر میرے دونوں پیر تو کیچڑ میں سنے ہیں...... میری چپلیں کہاں ہیں...... میں نے کالے کپڑے کیوں پہن رکھے ہیں؟ میرے لعل ڈھونڈ تو سہی...... سڑک پر کتنی بھیڑ ہے۔ اف، یہیں کونے پر تو تھا میرا گھر، جس میں میں رہتی تھی...... کہاں گیا آخر......؟

نجمہ اور محمود پاشا کے ادھر ادھر کھڑے صرف اس کے ہاتھ کو سہلا رہے تھے۔ پاشا کے اچھے ہونے کی امید تو بندھ گئی تھی مگر ڈر لگتا تھا کہ کہیں پاشا پاگل ہو گئی تو؟ یہ الٹی سیدھی باتیں! مہران کون ہے؟ کسی کو کیا معلوم! جب پچھلی چھٹیوں میں محسن آیا تھا تو ان کے بیچ جو باتیں ہوئی تھیں، وہ اتنی معمولی

تھیں، مگر محسن کی موت نے انہیں جانے کیا بنادیا تھا۔

'سنو! میں دوبارہ نوروز کی چھٹیوں میں آؤں گا اور اگر کوئی خوش خبری نہ ملی، تو اس کی کمی نوروز کے شب کو پوری کروں گا...... لڑکا ہوا تو 'مہران' نام رکھیں گے اور اگر لڑکی تو 'مہرماہ'! ایک دم ٹھیٹھ ایرانی نام مجھے اچھے لگتے ہیں۔' بلکہ چلتے چلتے اس نے الوداعی بوسے کے وقت بھی شرارت سے کہا تھا، 'خدا حافظ مہران کی ماں!'

نوروز آیا اور چلا بھی گیا، بلکہ نوروز آنے سے پہلے ہی سب کچھ لٹ گیا...... امید، خوشی — سب کچھ سوکھے پتوں کی طرح نامعلوم سمت کی طرف اڑ گئی۔

کل سے پاشا کی حالت میں کافی سدھار ہے۔ آنکھیں کھول کر وہ ادھر ادھر دیکھتی بھی ہے۔ کروٹ بدل کر کچھ کھا پی لیتی ہے۔ ایک دن صبح اٹھ کر نجمہ سے بولی — 'میری انگوٹھی دیکھو ٹھیک ہے، میری ہمت نہیں پڑ رہی ہے دیکھنے کو۔'

'کیوں؟ ٹھیک تو ہے۔'

'رات عجیب سا خواب دیکھا کہ بیچ کا یہ نگ اتنا بڑا ہوگیا ہے جیسے بڑی سی چٹان، پھر میرے دیکھتے دیکھتے اس کے دو ٹکڑے ہوگئے اور انگوٹھی میں لگے دوسرے نگ جھڑ گئے ہیں۔ عجیب بدصورت سی انگوٹھی ہوگئی ہے اور میں تم سے کہہ رہی ہوں نجمہ ...... نجمہ جان! میرے نگ مجھے ڈھونڈ دو، یہیں کہیں گرے ہیں۔'

'ارے وہ تو خواب کی بات ہے، دیکھتی نہیں، انگوٹھی صحیح سلامت ہے۔' نجمہ نے انگوٹھی والا ہاتھ پاشا کو دکھاتے ہوئے کہا۔

'تمہارا دل چاہے تو اٹھ کر بیٹھو، تھوڑا اچھا لگے گا۔' محمود نے کہا۔

'اٹھا دو۔' پاشا نے کہا۔

دونوں نے تکیے لگا کر پاشا کو بٹھا دیا اور سامنے والی کھڑکی کے پردے ہٹا دیئے۔ 'اف، کتنے دنوں بعد آسمان دیکھا ہے۔ رنگ ہی بھول گئی تھی!'

'دو مہینے! خود تو بازار نہ جانے کے بہانے سے بیمار پڑ گئی اور میری خریداری رہ گئی۔' محمود نے مذاق میں کہا۔

'تمہیں یاد ہے! میں تو بھول گئی تھی۔' پاشا ہلکے سے مسکرائی۔

'چائے انڈیلوں پاشا؟' نجمہ نے کہا۔

'ہاں، تم لوگوں کو بڑی تکلیف دی ہے میں نے۔' پاشا نے دکھی ہو کر کہا۔

'بہت زیادہ! ٹھیک ہوگئی، یہ کیا کم ہے ہمارے لئے!'

کھڑکی سے باہر کا منظر — سوکھے ننگے پیڑ، نیلا آسمان، جس پر سفید بادلوں کے دھبے ہیں۔ پاشا انہیں دیکھتی رہی۔

'یہ ننگے پیڑ مجھے بڑے اپنے سے لگ رہے ہیں، نجمہ! کتنی مشابہت ہے ہم دونوں میں!' پاشا نے گہری آواز میں کہا۔

'تو میں پرسوں چلا جاتا ہوں، تمہاری اجازت ہے، پاشا!'

'پھر کب آؤ گے؟'

'جلدی ہی آؤں گا۔ چھٹی ملنا تو مشکل ہے، مگر پھر بھی آؤں گا ضرور، چاہے دو دن کے لئے ہی کیوں نہ آنا پڑے!'

آج پورے تین ماہ بعد پاشا گھر لوٹی ہے۔ اس بیماری نے جہاں پاشا کو جسمانی طور سے جھنجوڑ دیا تھا وہاں دماغی صدمے میں دوا کا کام بھی کیا تھا۔ طوفان کے بعد جو سکون ہوتا ہے، وہی پاشا میں آ گیا تھا۔ بس ادھر ادھر بکھری، اڑی، ٹوٹی پھوٹی چیزوں کو دوبارہ جگہ پر رکھنا تھا اور یہ کام گھر کا ہر آدمی کر رہا تھا کہ پاشا دوبارہ زندگی جینے کے قابل ہو جائے۔

اسپتال سے لوٹ کر پاشا نہ خواب میں ہے نہ مستقبل کی امید میں، بلکہ جو ہے اسے اپنانے کی کوشش میں آمادہ لگتی ہے۔ کئی جگہ درخواست بھیجنے کے بعد وہ دو جگہ انٹرویو میں کامیاب ہوئی۔ 'کاغذ' کی

ریسپشنسٹ میں اور نرسری میں۔ بہت سوچنے پر اس نے فیصلہ کیا، ہر اعتبار سے 'کاخ یخ' کی نوکری بہتر ہوگی...... مگر پریشانیاں بڑھ جائیں گی...... کم تنخواہ ہونے پر بھی نرسری کی نوکری میں سکون ہے۔ شاید وہاں بچوں کے بیچ وہ اپنے مہران کو پالے۔ یہ سوچ کر اس نے ماں باپ کی مرضی کے خلاف نوکری کرلی۔

زندگی نئے ڈھرے پر چل رہی تھی۔ پاشا گھر لوٹ کر بچوں کے لئے فوٹو چارٹ ان کے لئے دوسری چیزیں بنانے، پڑھنے میں لگی رہتی۔ یہ دیکھ کر گھر میں سب کو سکون ملا کہ چلو، پاشا سنبھل گئی۔

اسی بیچ ایک دن محسن کا دوست پاشا کے پاس اسکول پہنچ گیا۔ اپنی ٹریننگ ختم کرچکا تھا اور محسن کا ایک پیکٹ پاشا کو تھما کر چلا گیا۔ پاشا کو ہوش نہ رہا کہ وہ اس سے کچھ پوچھتی، شکریہ کہتی۔ بس اپنی جگہ پر جم کر رہ گئی تھی، جیسے تیز برف باری میں دب گئی ہو۔ گھر آکر اس نے پیکٹ کھولا۔ محسن کو لکھے اس کے کچھ خطوط تھے۔ ایک کتاب تھی — 'بے بی کیر'۔ لگا، دل پر پھر ریت اڑ اڑ کر ٹیلوں کی شکل میں جمع ہونے لگی ہے۔ ایک مخملی ڈبیا تھی۔ کھولا تو اس میں مہین سی زنجیر میں لگے ننھے ننھے الماس اور ایک چھوٹا سا پرچہ — 'خوشخبری کی خوشی میں'۔ سیٹیاں، شور — لگا کئی ٹرینیں پلیٹ فارم پر دھڑ دھڑ کر کے ایک دوسرے سے لڑ گئی ہیں۔ کئی اور پیکٹ تھے — سہیلہ، نجمہ، ماماں، بابا، ماریہ کے نام...... اسے لگا، اس کا دم گھٹ رہا ہے۔ وہ تیزی سے کمرے سے باہر نکلی۔ اسے چکر آرہا ہے۔ اس نے گھبرا کر کاریڈور کی لائٹ جلائی، پھر ایک ایک کر کے سارے گھر کی لائٹ جلا کر وہ بے دم کرسی پر بیٹھ گئی۔

'کیا ہوا پاشا، ٹھیک تو ہو؟' نجمہ کی آنکھیں کبوتر کے پنکھوں کی طرح پھڑ پھڑا رہی تھیں۔

'ٹھیک ہوں نجمہ! بس لگا، میرے چاروں طرف گہرا اندھیرا چھا گیا تھا۔ چلو کمرے میں اپنے اپنے تحفے لے لو۔ محسن نے نوروز کے لئے خریدے تھے۔' دونوں بہنیں معاملہ بھانپ گئی تھیں۔ اس وجہ سے ماحول ہلکا کرنے کے لئے وہ باتیں کرنے لگیں۔

'اچھا تو وہ مسٹر اسکول پہنچ گئے تھے۔ یہاں بھی آئے تھے صبح! ہمارے مانگنے پر بولے — 'میں تو پاشا کو ہی دوں گا۔'

'تم لوگوں نے کچھ خاطر وغیرہ کی؟ میں تو کچھ کہہ بھی نہ پائی تھی۔'

'ارے پاشا، نجمہ تو بگڑتی رہی ہے۔ میں نے وہ خاطر کی، اس کی سات پشت یاد کریں گی۔' سہیلہ نے جوش میں کہا۔

'تمہاری زبان کو دیکھ کر ڈرتی ہوں، جانے کب کیا کہہ جاؤ!' نجمہ بولی۔

'ڈبہ نہ دینے کی وجہ بتائی کہ میں پاشا کو دیکھنا چاہتا ہوں۔ محسن نے تو سب کے دل میں حسد کی آگ سلگائی تھی۔ ہم سب پاشا سے ملنے کو بے چین تھے کہ اس زمانے میں جب ہر چیز دولت سے تولی جاتی ہے تو یہ لوگ پرانی لو اسٹوری جیسے جذبات میں کیسے جیتے ہیں!'

'بڑی باتیں ہوئیں تم سے!' نجمہ نے شوخی سے کہا۔

پاشا خاموشی سے پیکٹ کو خالی کرنے لگی، پھر بڑی کڑواہٹ سے بولی، 'خدا کے لئے کتنا آسان ہے ادھر کی مہر اُدھر کرنا۔ ادھر کی اُدھر۔ مگر مہروں کے دل سے کوئی پوچھے کہ ان پر کیا گزرتی ہے!'

محمود آیا ہوا ہے۔ گھر کی حالت دیکھ کر اسے بڑا سکون ملا۔ پاشا ایکدم نارمل ہے۔ سب کچھ ٹھیک ٹھاک چل رہا تھا۔ ایک دن محمود نے فرزانہ خانم سے کہا— 'خالہ! پاشا سے آپ نے کبھی دوسری شادی کی بات کی؟'

'نہیں۔'

'مگر خالہ! زندگی یوں نہیں گزرے گی۔ سمجھدار ہے، سب کچھ سمجھ رہی ہے، زندگی سے سمجھوتہ تو کرنا ہی پڑے گا۔'

'وہ تو ہے، بیٹا، لیکن ہمت کس میں ہے؟ دل تو میرا بھی یہی چاہتا ہے۔ ابھی تو سب گزر جاتا ہے۔ مگر ڈھلتی عمر کا ساتھی تو ہونا چاہئے۔ میں بھی کب تک بیٹھی رہوں گی— بہنیں بھی اپنے اپنے گھر کی ہو جائیں گی۔'

'میں بات کروں گا۔' محمود نے سوچتے ہوئے کہا۔

'لیکن بیٹا، بہت سنبھل کر۔ کانچ کے جیسا تو دل ہے اس کا۔ ٹوٹ گیا تو کرچی کرچی بٹورنے میں

سالوں لگ جائیں گے۔ بڑی مشکل سے تو سنبھلی ہے۔'

'جانتا ہوں، خالہ۔'

ایک دن پاشا جیسے ہی اسکول سے باہر نکلی تو محمود کو کھڑا پایا۔

'تم یہاں؟'

'ہاں، میں بازار سے لوٹ رہا تھا، وقت دیکھا تو سوچا، تمہیں لیتا چلوں۔'

'شکریہ! چلو، کار کدھر کھڑی کی ہے؟'

'ادھر ہے۔' دونوں پیدل چل کر کار تک آئے۔

'چلو پہلے کہیں چل کر کچھ پیا جائے۔'

'ٹھیک ہے!' کار سڑکوں کے چکر کاٹ کر ایک ریستراں کے آگے کھڑی ہو گئی۔

اناس اور خربوزے کے شربت کا آرڈر دے کر محمود نے سگریٹ جلائی۔

'محمود، بچوں کو لے کر مجھے باہر جانا ہے۔ سوچتی ہوں، کیوں نہ گھر کی طرف ہی چلوں۔ چچا سے بھی مل لوں گی۔ بچوں کو قالین کی بنائی وغیرہ بھی دکھا دوں گی۔'

'خیال اچھا ہے۔ اگلے ہفتے مجھے بھی جانا ہے۔ تم جاؤ گی کیسے؟'

'بس سے! اسکول بس سے! تب تک نجمہ، سہیلہ، ماریہ سب کی چھٹیاں ہوں گی۔ سب چلیں گے۔'

'ٹھیک ہے۔ تمہاری بس، ہماری کاریں، ریس بڑھیا رہے گی۔' دونوں ہنس پڑے...... 'پاشا! لگتا ہے، نرسری میں کام کرنا تمہیں بہت اچھا لگتا ہے، مگر کچھ آگے کی بھی سوچی ہے؟'

'کیوں نہیں! ایک بار آگے کی سوچی تھی تو سب برباد ہو گیا۔ اب کل کے بارے میں سوچنا ہی بند کر دیا ہے۔'

'جس طرح ہمت کر کے زندگی شروع کر دی ہے، مستقبل کی بھی سوچ ڈالو۔'

'زندگی جینا کہاں شروع کی ہے، بلکہ روز صبح جینے کی طاقت جمع کرتی ہوں، رات تک اسے خرچ کر

کے اس امید میں سو جاتی ہوں کہ کاش! میری یہ آخری رات ہو۔ مگر صبح کی سفیدی پھر جینے پر مجبور کر دیتی ہے۔'

محمود کو لگا، پاشا کے اندر کھولتے پانی کے دہانے ابھی ٹھنڈے نہیں ہوئے ہیں۔ وہ بات کرے یا نہ کرے؟ کر ہی ڈالے، ہو سکتا ہے، نتیجہ اچھا ہی نکلے۔

'ایک بات پوچھوں؟'

'پوچھو۔'

'برا لگے تو معاف کرنا۔ یہ...... مہران...... کون تھا؟'

'مہران......' پاشا اتنا کہہ کر صوفے کے پیچھے ٹک کر بیٹھ گئی — 'مہران ایک خیالی خواب تھا، جو ہمارے یعنی محسن اور میرے دماغ نے دیکھا تھا۔ یوں سمجھو، وہی ہماری آرزو، ہماری تمنا، ہماری خوشی تھا...... مگر اب تو محمود، رات اتنی طویل ہو گئی ہے کہ خواب کے سچے ہونے کا وقت ہی نہیں رہ گیا ہے۔ اپنی زندگی کا سورج تو ہمیشہ کے لئے ڈوب گیا ہے۔' پاشا نے شربت کا گھونٹ بھرا۔ آنکھوں میں ہمیشہ چھائے رہنے والے بھاری بادل، لگا، بھاپ میں تبدیل ہونے لگے اور بنا برسے زمین پر اتر آئے...... 'خیر، چھوڑو...... تم کب شادی کر رہے ہو؟ اب تو انجینئر بھی بن گئے۔ کہیں کسی کو امریکہ میں پسند تو نہیں کر آئے ہو؟' پاشا نے اپنے غم کے اوپر قابو پا لیا تھا۔ اسی لئے شوخی سے بولی۔

'نہیں، چونکہ کسی کی ذمہ داری کندھوں پر تھی، اس لئے کئی بنتی باتوں کو بگاڑ کر چلا آیا ہوں۔'

'اف!' پاشا ہنس پڑی — 'تو لگتا ہے، لڑکی یہیں ہے۔ ذرا اس کے بارے میں معلوم کر سکتی ہوں، جس کی ذمہ داری سے آپ جھکے ہوئے ہیں؟' پاشا نے شرارت سے کہا۔

'تمہاری!، پاشا...... مہران...... ہمارا اور تمہارا ابھی تو ہو سکتا ہے۔ محسن میرا جگری دوست تھا اور تم میرے ساتھ پل کر بڑھیں، میری ساتھی، میرے چچا کی بیٹی ...... نہ اس کے مرنے کا غم بھول پایا ہوں، نہ تمہیں غم میں دیکھ سکتا ہوں۔' کئی دنوں سے متھنے والی بات اس نے ایک ساتھ اگل دی۔

پاشا کے رنگ بدلتے چہرے کو دیکھ کر محمود اپنی بات کا اثر ڈھونڈ نہ سکا۔ پاشا خاموش، گلاس میں پڑے

شربت کو ہلاتی رہی پھر نارمل ہو کر بولی۔ 'محمود، آج کے بعد بھی میرا غم بانٹنے کی کوشش مت کرنا۔۔۔ یہ غم ایسا نہیں ہے، جو خوشی میں بدلا جا سکے..... ہمارے تمہارے مہران کا مطلب ہے کہ میں اپنے جسم سے محسن کا ہر لمس مٹا دوں۔ ہر وہ لمس، جو مجھے جینا سکھا رہا ہے، اسے پونچھ ڈالوں..... جب میں دل اور دماغ سے اسے نہیں مٹا سکتی تو پھر جسم سے اسے کیوں مٹاؤں، کیا مجبوری ہے؟'

'مگر.....'

'میں سمجھ رہی ہوں محمود، دیکھو جی رہی ہوں اور خوش رہنا بھی آ گیا ہے۔'

'ٹھیک ہے، پاشا..... مگر یہ صرف تمہارا جذباتی نظریہ ہے۔ حقیقت تم نے تسلیم کر لی ہے۔ اس کو اسی طرح محفوظ رہنے دو۔ نئے کاغذ پر نئی زندگی بھی تو شروع کر سکتی ہو؟'

'کوئی ضروری ہے، ایک بار جی ہوئی زندگی کو دوبارہ دہرایا جائے؟..... نوکری کر رہی ہوں۔ کھانے بھر کا کما ہی لیتی ہوں۔ بڑھاپے میں جب بدن تھک جائے گا تو سات بھائی بہنوں کی اس بہن کو کسی کے گھر میں سر چھپانے کی جگہ مل ہی جائے گی۔ کوئی نکالے گا نہیں، مجھے اس کا یقین ہے۔'

'یہ سب ٹھیک ہے، لیکن یہ فیصلہ اتنی جلدی نہ کرو۔ سوچنے کے لئے جتنا وقت چاہو، لے لو۔ میں سالوں انتظار کر سکتا ہوں۔'

'اپنی زندگی میرے ساتھ خراب نہ کرو، محمود! مجھ سے بہتر جگہ اس کا استعمال کرو۔ جہاں اس کی ضرورت ہو..... جہاں اس کی قدر ہو سکے۔' پاشا ٹھہری اور بہت سنبھل کر بولی۔۔۔ 'اور پھر محمود! میں بھی کوئی شامی کاغذ☆ تھوڑے ہی ہوں کہ جب ضرورت پڑی، اسے دھو کر دوسرا فرمان لکھ دیا۔۔۔ میں انسان ہوں اور انسان کے دل پر لکھے حروف بار بار دھوئے نہیں جا سکتے ہیں۔'

'انہیں دھونے کی کیا ضرورت ہے، انہیں محفوظ بھی تو کیا جا سکتا ہے۔' ایش ٹرے میں سگریٹ کو بجھاتے ہوئے محمود نے پاشا کی ڈبڈبائی آنکھوں کی طرف دیکھا۔ پاشا خاموش رہی، پھر اٹھتے ہوئے بولی۔۔۔ 'محبت اور ہمدردی کا فرق تو تم جانتے ہو نا، محمود؟'

رومال سے ماتھے پر چھلک آئی بوندوں کو پونچھتے ہوئے محمود نے آہستہ سے کہا۔۔۔ 'مجھے معاف کرنا پاشا!'

☆ امیر خسرو کے زمانے کی کاغذ کی جگہ استعمال کی جانے والی سلک، جو بار بار دھو کر شاہی فرمان لکھنے میں استعمال کی جاتی تھی

آب توبہ

دو دن پہلے بھاری برف گری تھی۔ پیڑ پودے، در و دیوار، پہاڑ اور میدان — سب سفید چادر سے ڈھک گئے تھے، مگر کل رات کو ہوئی بوندا باندی سے برف کی سختی پگھل گئی تھی اور اب تنگ گلیاں بری طرح کیچڑ پانی سے بھر گئی تھیں۔ سوسن بہت سنبھل سنبھل کر قدم رکھ رہی تھی۔ پھسلن بھی تو غضب کی تھی۔ چاروں طرف سے اس نے چادر سمیٹ کر سینے پر جما کر کے دونوں ہاتھ سے پکڑ رکھی تھی۔ یکایک سامانوں سے بھری وین تیزی سے گلی میں داخل ہوئی۔ اب وہ اس تنگ گلی میں کہاں بچ کر جائے۔ دکانوں کے دروازے بھی بند تھے، سوسن و زینب دیوار سے چپک کر کھڑی ہوگئیں اور وین فراٹے بھرتی ہوئی، کیچڑ اچھالتی پاس سے گزر گئی۔ پیچھے سے زینب بولی، 'اف! کتنا بدتمیز آدمی تھا!' سوسن پریشان سی کھڑی تھی۔ اس کا چہرہ، چادر اور پیر سب کیچڑ سے لت پت ہوگئے تھے۔ 'عجیب حال ہے کب کون راہ چلتا کیچڑ اچھال دے، کچھ پتہ نہیں چلتا۔' وہ دکھی ہوا ٹھی۔ آنکھوں سے تڑپتی دکھ کی لہروں کو اس نے زینب سے چھپایا اور اٹھتی ہوئی ٹھنڈی سانس کو سینے کی قید میں ہی گھٹنے دیا۔

دوسری گلی میں غضب کا ڈھلان تھا۔ دونوں پیر جما جما کر نیچے حمام خانے کی طرف اتر رہی تھیں۔ حمام خانے کا دروازہ کھول کر سیڑھیاں اتریں اور اندر داخل ہوگئیں۔ بدن کی حرارت اور کھولتے پانی کے ابال سے حمام خانہ ہمیشہ کی طرح آج بھی گرم تھا۔ دونوں نے چپلیں اتاریں۔ سامنے بہت ساری عورتیں کپڑے پہن اور اتار رہی تھیں۔ کچھ بالوں کو سنبھالنے میں لگی تھیں۔ وہ دونوں بھی جاکر قالین پر بیٹھ گئیں اور ساتھ لائی گٹھری کو کھول کر کپڑا بچھایا اور اس پر کھڑی ہو کر کپڑے اتارنے میں لگ گئیں۔ حمام خانے کی مالکن، جو روپے گن کر تھیلے میں رکھ رہی تھی، سوسن کو دیکھ کر بٹوے کو اپنی کالی چھینٹ کی فراک میں رکھتی ہوئی تیزی سے آگے بڑھی۔

'سلام سوسن خانم! کب آئیں؟ اچھی تو ہو، کب تک رہو گی؟' ایک سانس میں وہ کئی سوال کر گئی۔

'سلام! میں ٹھیک ہوں۔ بس کل صبح آئی ہوں۔ پرسوں چلی جاؤں گی! تم سناؤ، سب ٹھیک ٹھاک چل رہا ہے نا؟' سوسن نے بھی ایک سانس میں سارے جواب دے ڈالے۔

'ارے کہنے اور دیکھنے سے تو میں بھلی چنگی ہوں۔ سب کچھ ٹھیک ٹھاک بھی چل رہا ہے۔ مگر جو دل پر گزرتی ہے اسے تو خدا ہی جانتا ہے۔ خدا جھوٹ نہ بلوائے، بیٹی! تمہارے چچا نے اس سال یہ تیسرا 'صیغہ' کل کیا ہے وہ بھی ایک یہودن سے! بچے اپنے گھروں میں مست ہیں۔ بس، میں اکیلی آخری حمام کا انتظار کر رہی ہوں۔ مروں تو جان چھوٹے۔ تنہائی کی زندگی بھی کوئی زندگی ہے، وہ بھی زندگی کے آخری پہر میں۔' صنوبر خانم کے چہرے پر سے جاڑے کی جاتی ہوئی دھوپ نے بھی جیسے اپنی آخری کرنوں کو سمیٹ لیا ہو۔

'کیسی بات کر رہی ہو آج، صنوبر خانم! ہمت سے کام لو۔ پھر تمہیں کمی کس بات کی ہے؟' سوسن نے صنوبر کو ہمت دلائی۔

'لو اور سنو! کسی کا میاں ہر تین ماہ بعد 'صیغہ' کرے — اور تم اس سے کہو، کچھ ہوا ہی نہیں۔' صنوبر خانم سینہ پیٹ کر ہاتھ نچا نچا کر بولیں۔

'ٹھیک تو کہہ رہی ہے سوسن — تم بھی صیغہ کر لو صنوبر خانم! تبھی وہ بوڑھا کھوسٹ سدھرے گا۔ قبر میں پیر لٹکائے ہیں اور میاں کو ہری ہری سوجھ رہی ہے۔' زینب نے اکتا کر کہا۔ وہ صنوبر سے بہت چڑھتی تھی، کنجوس، مکھی چوس ایک ایک پیسہ دانت سے پکڑ کر خرچ کرتی ہے، اسی لئے میاں بھاگا ہوگا — بھابھی کو اب کون سمجھائے — دو دن کے لئے آئی ہیں، بک بک تو سنانی ہی پڑے گی۔

'توبہ کرو، توبہ!' صنوبر خانم لرز گئیں۔ پھر دکھی ہو کر بولیں، 'مجھ سے کون اس عمر میں صیغہ کرے گا۔ سفید بال دیکھو۔' انہیں اپنی اس مجبوری کا بھی غم تھا، بالوں کی لٹ زینب کو دکھاتے ہوئے بولیں، 'اور جو کرے گا، وہ میرے روپئے سے کرے گا۔ اکیلا پن تب بھی کاٹے گا۔ اور پھر مجھے کون سے روپئے کاٹتے ہیں، جو بیٹھے بٹھائے کسی ایرے غیرے نتھو خیرے پر خرچ کروں! پھر بات بدلنے کے لئے بولی، 'یہ چوڑی کہاں سے لی؟ شاہ رضا سے خریدی ہے؟'

'ارے نہیں، یہ تو ہندوستان سے میری دوست لائی ہے۔' سوسن نے ہنس کر کہا۔

'واہ! کیا سوغات ہے! ہندوستان بھی کیا ملک ہے! کیا زمین ہے! بہت کچھ سن رکھا ہے میں نے، موقع ملا تو اس ملک کو دیکھ کر آؤں گی، مگر جاؤں گی کس کے ساتھ؟' تب ہی کسی عورت نے پیسہ دینے کے لئے انہیں پکارا، 'ابھی آئی۔' کہہ کر صنوبر خانم چلی گئیں۔ سوسن اور زینب اپنے کپڑے اتارنے میں لگ گئیں۔ جب بدن پر صرف پینٹی رہ گئی تو دونوں نے بالوں سے کلپ نکالی، صابن، کنگھے اور شیشے کا تھیلا لیا اور اندر دوسرے کمرے کی طرف بڑھیں۔ دونوں کمروں کے بیچ ٹھنڈے پانی کا چھوٹا سا حوض تھا۔ زینب پیر دھو کر اندر چلی گئی۔ سوسن نے جیسے ہی پیر ڈالا، گنگنا اٹھی، ٹھنڈا برفیلا پانی تھا۔ اس کی ہڈی میں سنسناتی سی ٹھنڈی لہر دوڑ گئی اور اسی کے ساتھ ایک شدید خواہش کسی پر کٹے زخمی پرندے کی طرح اس کے دل کے آنگن میں اڑنے کی ناکام کوشش کرتی، چھپٹاتی اپنے ہی خون میں ترلوٹنے لگی — کاش، میں جم جاتی! میں برف بن جاتی۔ پھر کوئی خواہش مجھے پگھلا کر یوں کیچڑ کے دلدل میں نہ گھسیٹ سکتی۔ خواہش ہی کیا، تب وہ ایسی سخت، ساکت، خاموش، غیر جذباتی برفیلی چٹان ہوتی کہ اس پر سورج کی گرم کرنیں بھی اپنا اثر نہ ڈال پاتیں اور تب وہ پہاڑوں کے اونچی چوٹی پر صدیوں تک خاموش، پاکیزگی کا سرچشمہ بنی، نیلے آسمان کو تاکتی رہتی ...... آہ...... خواہش کرنا کتنا خوبصورت ہے اور کتنا آسان بھی...... ایک دم سے پیچھے کسی عورت کے آکر کھڑے ہو جانے اور کندھے پر اس کے ہاتھ کے لمس کے احساس سے سوسن چونکی اور پیچھے دیکھا تو سچ مچ ہی کئی عورتیں اس کو سوالیہ نظروں سے گھور رہی تھیں۔ اس نے گھبرا کر دونوں پیر ٹھنڈے پانی سے باہر نکالے اور گھوم کر دوسرے کمرے میں آئی۔

حمام خانے میں آج ضرورت سے زیادہ بھیڑ تھی۔ ننگے جسموں کی بھرمار تھی۔ اسی بدن کی خوبصورتی پر لوگ مرتے ہیں! اس وقت کیسے گھنونے، بدصورت، ٹھنڈے پھیکے لگ رہے ہیں۔ ہر عورت کا ننگا بدن سوسن کو اس کے چہرے پر پیوند سا لگ رہا تھا۔ ننگا پن کتنا بدصورت ہوتا ہے! مگر انسانی کمزوری کا آغاز تو اس ننگے پن سے ہی شروع ہوتا ہے۔ زینب کونے میں چپ چاپ کھڑی تھی۔ جگہ کہیں نہیں تھی۔ آج اسکول میں چھٹی ہونے کے سبب بچے زیادہ نظر آ رہے تھے اور شاید بھیڑ کی وجہ بھی یہی تھی۔

زینب کو ایک کونے میں نل خالی نظر آیا، مگر وہاں آبادی کا گھنا پن سب سے زیادہ تھا۔ ایک عورت

سات بچوں کے ساتھ بیٹھی تھی۔ سب سے چھوٹے بچے کو اپنی ننگی پھیلی ٹانگوں پر بٹھائے بری طرح مل مل کر نہلا رہی تھی۔ باقی بچے شاید ملائی سے تھک گئے تھے اور شیشے سے دمکتے لال چہرے لئے تیزی سے کھیرا اور انار کھا رہے تھے۔ دوسرے کونے میں تین چار بوڑھی عورتیں بیٹھی ایک دوسرے کا بدن ملتی گپ مار رہی تھیں۔ ان کے پاس ہی سونے کے سکوں کے زیوروں سے لدی دبلی پتلی لڑکی سر پر شیمپو لگا رہی تھی۔ دوسرے کونوں میں بھی یہی حال تھا۔ مجبور ہو کر زینب نے خالی طشت پانی سے بھرا اور درمیان کے بغیر نل والے حصے میں بیٹھ گئی — 'چلئے سوسن! جب تک ہم کیسا کرتے ہیں تب تک کوئی نہ کوئی جگہ خالی تو ہو ہی جائے گی۔'

سوسن کے اندر پھر پہاڑی آبشار کا شور بڑھ گیا تھا، پانی پتھر پر سر پٹکنے لگا۔ مگر کیا مجال جو ندی بن کر آنکھوں سے بہہ نکلے۔ دل میں ہوک اٹھی — 'آب توبہ' کے لئے بھی جگہ نہیں ہے، شاید گناہگار کے لئے سارے جہاں کا پانی خشک ہو جاتا ہے۔ دونوں آمنے سامنے بیٹھ گئیں۔ زینب کچھ نہ کچھ بول رہی تھی، مگر سوسن اپنے ہی خیالوں میں ڈوبی تھی۔

مل مل کر آج وہ گناہ کے سارے نشان مٹا دے گی۔ ہوس کے سارے دھبے دھو ڈالے گی۔ کیسی نفرت پیدا ہو گئی ہے اسے اپنے اس بدن سے! کبھی کبھی تو لگتا ہے، اس بدن کو ہی مٹا دے۔ اسی کی خواہش سے آج اس کی روح تڑپ رہی ہے۔ اس کی انا اس کے بدن کی قید میں پڑی دم توڑ رہی ہے۔ اس کا غرور احساس کمتری کی آندھی میں جانے کہاں اڑ گیا ہے۔ جنگل میں پھیلی آتش اس کے خون میں پھیل کر اس کے پورے جسم کو شعلوں میں بدل رہی ہے۔ کاش، یہ جوالہ اس کے وجود کو جلا کر راکھ کر دے! یوں سلگتے رہنا اسے برداشت نہیں ہو رہا ہے۔ اسے یقین ہے، جہنم کے شعلوں کی تپش بھی اتنی ناقابل برداشت نہیں ہو گی، مگر یہاں تو روئیں روئیں میں دہکتا آگ کا سمندر، لال بہتا دریا، جہاں تک احساس کی آنکھیں جاتی ہیں، بس آگ ہی آگ ہے، لپٹیں ہی لپٹیں! سرخ، نارنگی، زرد! کبھی کبھی یہ آگ اس کے لئے زیادہ کربناک ہو جاتی ہے، جب بھیگی لکڑی سی سلگتی ہے اور اٹھتے دھوئیں کے بیچ سوں سوں کرتی ہڈیوں کے بیچ چیختی ہوئی روتی ہے۔ اسے پتہ ہے، آتش فشاں کی یہ گرمی غصہ کی ہے۔ یہ تپش ندامت کی ہے۔ یہ لپٹیں نفرت اور جھنجلاہٹ کی ہیں اور یہ آگ حقیقت میں پشیمانی اور بے لطفی کی ہے۔

اس نے تیزی سے اپنے ننگے بدن پر پانی ڈالنا شروع کر دیا ہے۔ اسے لگا، دہکتے لہکتے انگارے پانی کی بوندوں سے چھن من کر بجھ رہے ہیں اور سیاہ کوئلوں میں بدل رہے ہیں۔ بجھتے کوئلوں کی تپش، بھاپ کے گرم بادلوں کی لہک میں اس کا دم گھٹ رہا ہے۔ طشت کا پانی یوں ختم ہوتے دیکھ کر زینب نے کہا، 'سوسن، یہ سفید اتولیجئے، اور آپ کا کیسا کہاں ہے؟'

سوسن کو جیسے ہوش آگیا، وہ یہاں تھی ہی کب؟ وہ تو اپنے ہی وجود کی بھول بھلیا میں کھوئی سرنگ در سرنگ ڈوبتی جارہی تھی۔ سوسن زینب کے اس اشارے سے جھینپ گئی۔ چاروں طرف نظر ڈال کر وہ سفید ابدن پر ملنے لگی، پھر کیسار گڑنے لگی — اپنی پوری طاقت سے، جیسے اپنے دل کے سارے عقدہ کو بدن پر کیسے کی سخت کھردری رگڑ سے خالی کرنا چاہ رہی ہو۔ سفید بدن پر اس تیز رگڑ سے میل کی بٹیں کیا نکلتیں، وہاں تو سرخ دھبے پڑنے لگے تھے۔ تبھی پیچھے سے آواز آئی —

'لاؤ، تمہاری پیٹھ میں مل دوں۔' سوسن نے مڑ کر پیچھے دیکھا۔ شکریہ کہہ کر اس نے 'کیسا' اس عورت کے ہاتھ میں تھما دیا، جو ادھیڑ عمر کی مگر زندگی کی چاہت سے بھرپور چہرے والی تھی۔ سینے بھاری ہو کر آگے نکلے ہوئے بڑے سے پیٹ پر رکھے تھے۔ پتلے گیلے بال بھاری شانوں پر چپکے تھے۔ بدن پر پینٹی بھی نہ تھی۔ آرام سے پالتی مارے بیٹھی تھی۔ جب سوسن کی پیٹھ مل چکی تو سوسن کو بھی رسماً پوچھنا پڑا، اور اس کی گدبدی، چمپئی، چکنی پیٹھ پانی ڈال ڈال کر ملنی پڑی۔ اس عورت نے بڑی میٹھی مسکراہٹ سے شکریہ کہا اور دھیرے سے شرارت بھرے انداز میں بولی، 'تمہارے سینے کیسے خوبصورت ہیں۔ سچ، جیسے گدرائے انار۔'

سوسن نے گھبرا کر سینے پر نگاہ ڈالی، کہاں...... ؟ کہاں ہے خوبصورتی؟ وہاں تو صرف چندن کی شاخوں پر لپٹے زہریلے سانپ کے دانتوں کے بے شمار نشان تھے — نیلے کالے نیلے، اف! کتنی بے دردی سے ادھیڑ ادھیڑ کر اسے کھنگولا تھا اس نے! کتنا خالی پن، کتنا پھیکا پن دیا تھا! منہ کا ذائقہ آج تک کڑوا، کسیلا ہو رہا ہے۔

'کیوں، اتنا گھبرا کیوں رہی ہو؟ ایسی بھی کیا شرم جیسے کہ کنواری ہو!' اس نے آنکھوں کے اشارے سے پیٹ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے مسکرا کر کہا۔ سوسن نے اپنے پیٹ پر پڑے نشان دیکھے اور اطمینان کی ایک سانس لی۔ یہی تو ایک نشان بچا ہے اس کے بدن پر جو اس کی ممتا کا، عورت ہونے کا

فخر ہے، ورنہ لوبان کی طرح اس کا وجود آگ میں جل کر کب کا بھسم ہو چکا ہے۔ سوسن کھلی کھلی میٹھی سی ہنسی ہنسی۔ 'ہاں، میرے دو بچے ہیں —ایک لڑکا اور ایک لڑکی۔ ''بس!' وہ عورت انگوٹھیوں سے بھرے ہاتھوں کو ہونٹوں پر رکھ کر قہقہہ مار کر بولی، 'میرے دس بچے ہیں اور اس کے بعد پھر گیارہ ہوا۔...... 'وہ شرم بھرے فخریہ انداز سے ہنسی۔ جس میں ہلکا سا ناز تھا اور اس کی خوشگوار ازدواجی زندگی کی جھلک بھی۔

'آپ سنبھالتی کیسے ہیں؟' سوسن کو لگا، اس کا دم گھٹ رہا ہے۔ گیارہ بچے!

خدا اس برے دن سے سب کو بچائے۔

'عورت کا اور کام ہی کیا ہے!' وہ ہنسی اور پھر سینے کی طرف اشارہ کر کے بولی، 'یہ خدا نے کس لئے دیئے ہیں؟ خدا کے بعد پیدا کرنے کا حق عورت کو ملا ہے اور میں عورت ہوں۔ سینے نہیں دیکھتی ہو، کیسے بھاری ہو رہے ہیں! ہر بچے کو دو سال تک اپنا دودھ پلایا ہے—اور پھر بچے تو جوانی کی نشانی ہوتے ہیں۔' اس کے چہرے پر گیارہ بار کئے گئے اپنی محبت کے اعلان کا رنگ جھلک رہا تھا، جس میں فخر تھا، چنوتی تھی، اعتماد بھی تھا۔ سوسن کو کہیں سے سانپ کی سرسراہٹ اپنے بدن کے چاروں طرف محسوس ہونے لگی، جیسے سانپ اس کا جسم اپنے لچیلے، ٹھنڈے، چکنے بدن میں دھیرے دھیرے کس رہا ہو اور اپنا منہ کھول کر اس کے دودھیا سینے کو اپنے منہ میں دبا کر زہر کا نیلا پن بلور جیسے تن پر پھیلانے لگا ہو۔ اف، گھونٹ گھونٹ یہ زہر کب تک مجھے پینا پڑے گا۔ میں مر کیوں نہیں جاتی؟ بڑی مشکل سے وہ اپنی جگہ سے اٹھی۔ دوسری طرف بنے فواروں والے کمروں کی طرف بڑھی۔ زینب پہلے ہی جا چکی تھی۔

فوارہ کھول کر وہ پاگلوں کی طرح اپنا بدن رگڑنے لگی۔ اس امید پر کہ شاید بدن پر پڑے لاکھ کے لال سخت نشانوں پر بوسوں کی مہریں دھل جائیں، گناہ کے حروف مٹ جائیں اور زمین اس کے بدن سے باہر زہریلا نیلا پانی اپنے میں جذب کر لے۔ یہی تو ہوگا کہ دھرتی کے کچھ حصوں پر زہریلے اودے پھول کی کٹیلی جھاڑیاں اگ آئیں گی، جو حقیقت میں اس کے گناہ کی شاہد، اس کی داستان آنے والے لوگوں سے کہیں گی اور بس۔ اس نے ہونٹوں ہی ہونٹوں میں دعائے توبہ پڑھنی شروع کر دیں۔ خدا کے آگے وہ بری طرح گڑگڑا رہی تھی۔ فوارے کی بوچھاروں کے ساتھ دونوں

آنکھیں بری طرح برس رہی تھیں، جیسے چٹخے شیشے سے بارش کی بہتی سیدھی دھار ایکایک رک کر پھر سیدھی بہنے لگی ہو۔

آج سے دس سال پہلے سوسن کی شادی کامران سے ہوئی تھی۔ گھریلو زندگی خوشگوار تھی۔ کسی بھی طرح کی پریشانی نہ تھی، مگر اپنے شوق کے سبب اپنے سے بلائی پریشانی کبھی کبھی دونوں کو الجھادیتی تھی، جس کی اہمیت زیادہ نہیں تھی۔ کامران انجینئر تھے— گھروں کے نقشے بنانا، ویران جگہوں کو بسانا اور بیوی بچوں پر جان چھڑکنا، یہی زندگی تھی ان کی۔ سوسن ماہر نفسیات تھی۔ بچوں کے ایک اسکول میں وہ بحال تھی۔ بچوں کی نفسیات، ان کی نشوونما، ذہانت، ان سب کو دیکھ کر وہ ان کی راہوں کا انتخاب کرتی تھی۔ اس وجہ سے بچوں کے ماں باپ سوسن کا نہ صرف خیال کرتے تھے، بلکہ اس کو خدا کے بعد اپنے بچوں کا راہ نما مانتے تھے۔ سوسن کا اپنے خاندان، دوستوں اور پڑوسیوں میں سبھی جگہ بہت قدر ہوتی تھی۔

ایسا بھی نہیں تھا کہ سوسن کی زندگی میں سب کچھ اچھا ہی اچھا ہو۔ اوپر سے دیکھا جائے تو سب کچھ اچھا ہی تھا، لیکن اس اچھائی کے پیچھے اسے کتنا درد سہنا پڑتا ہے، وہی جانتی ہے۔ اگر وہ سائیکلوجسٹ نہ ہوتی تو شاید ایک عام بیوی، ایک عام ماں، ایک عام شہری کی طرح رہتی، ایک معمولی عام سی زندگی جیتی، مگر اسے تو سوچنے کی، ہر کام کے اچھے برے اثرات، ہر واقعہ کو پہلے اور دوسرے واقعہ سے جوڑنے کی عادت سی پڑ گئی تھی۔ وہ بھی اب دماغی طور سے کوئی سیدھی سادی عورت نہیں رہ گئی تھی۔ جتنا اس کے لئے انسانی دماغ واضح ہو رہا تھا اتنا ہی وہ تانوں بانوں میں الجھی، انہیں سلجھانے میں مصروف رہتی تھی۔ اس کے پاس پریشانیوں کی لمبی لائن تھی، مگر دوسروں کی، جنہیں اسے سلجھانا ہوتا تھا، جیسے— باقر زادے نے جب سے اپنی بیوی کو طلاق دیا تھا تو ان کی پانچ سال کی لڑکی کو سوتے میں چلنے اور رونے کی عادت پڑ گئی تھی۔ محقق کے گھر میں روز روز لڑائی سے بچہ کلاس میں دبا، ڈرا، ناخن چباتا رہتا تھا۔ دوسروں کی چیزیں خراب کرتا تھا۔ یہ دیکھ کر سوسن نے کامران کے ساتھ رشتہ ہمیشہ خوشگوار رکھا۔ کچھ برا لگا تو دوا کے کڑوے گھونٹ کی طرح اسے پی گئی، کیونکہ وہ اپنے بچوں پر کسی طرح کا برا اثر نہیں دیکھنا چاہتی تھی۔

میٹنگ سے نکل کر بھی شمشاد بڑے انہماک سے اس سے امجد کے بارے میں باتیں کرتا رہا۔ پانچویں

کلاس کا طالب علم امجد عجیب نفسیاتی بیماری کا شکار تھا۔ پڑھنے میں بہت تیز، لیکن کبھی کبھی جانے کیوں وہ امتحان میں سادی کاپی دے دیتا۔ اس کی بہکی بہکی باتیں، اس کی اوٹ پٹانگ حرکتیں دیکھ کر ماں باپ، ٹیچر سبھی فکر مند ہو اٹھتے تھے کہ اس بچے کو کیا ہو جاتا ہے؟ پانچویں کلاس وہ پاس کر چکا تھا اور اب چھٹی کلاس میں وہ کون سے سبجکٹ لے، اسی کو لے کر کسی دوسرے اسکول کا سائیکو جسٹ، جو نیا نیا یورپ سے ڈگری لے کر لوٹا تھا اور سوسن کے اس طالب علم میں بڑی دلچسپی دکھار ہا تھا، اپنا سارا علم انڈیل رہا تھا کہ کسی طرح اس بچے کا مسئلہ حل ہو جائے۔ سب کو پتہ تھا کہ اس کے گھر کا ماحول تو ٹھیک ہونے سے رہا، ماں کلب سے جو اکھیل کر صبح کو گھر لوٹنا چھوڑے گی نہیں، باپ اس غم میں پیتا ہے۔ پھر کیوں نہ بچے کو ہی سنبھالا جائے۔ شمشاد اتنی بات کر رہا تھا کہ مجبوراً سوسن کو کہنا پڑا کہ اسے جانے میں دیر ہو رہی ہے، باقی باتیں کل ہوں گی۔

'اگر اعتراض نہ ہو تو آدھا گھنٹے ہم یہیں کہیں بیٹھ کر باتیں کرتے ہیں۔ پھر آپ چلی جایئے گا۔ مجھے کل جانا بھی ہے، پھر مسئلہ بھی تو ٹیڑھا ہے یوں ٹالا بھی تو نہیں جا سکتا ہے۔ کل یہی بچے ہمارے ملک کو سنبھالیں گے۔ کچھ کمی رہ گئی تو ہم آپ اپنے کو معاف نہیں کر پائیں گے۔' ایسا جواز سن کر سوسن لاجواب سی کھڑی رہ گئی تھی۔

'گھر چلئے۔' مجبوراً سوسن کو کہنا پڑا۔ سارا اسکول خالی ہو رہا تھا، ایسے میں وہاں ٹھہرنا اسے پسند نہ تھا۔ پسند تو اسے دفتر کے مسائل گھر لے جانا بھی نہ تھا، مگر کیا کرتی۔ شمشاد تو ہاتھ دھو کر امجد کے پیچھے پڑ گیا تھا۔ سوسن اپنے اس سلوک سے خوش نہیں تھی، کیونکہ وہ اپنے بچوں کے دماغ پر ان کے دوستوں ساتھیوں کے مسائل کو سنا کر کسی طرح کا بوجھ نہیں ڈالنا چاہتی تھی، لیکن اس وقت مجبور ہو گئی تھی اور شمشاد کو گھر چلنے کی دعوت دے بیٹھی تھی۔ شمشاد تو ایسا بیٹھا اور کامران کی باتوں میں ایسا ڈوبا کہ رات کے کھانے کے بعد ہی اپنے گھر لوٹا۔ اور اس کے بعد وہ کئی بار آیا۔ ہمیشہ یورپ کے تجربات سے بھرا ہوا، انہیں سناتا ہوا، سوسن کو اس نے بہت ساری تصویریں وہاں کے اسکولوں کے بچوں کی دکھائی تھیں۔ جنہیں دیکھ کر اور سن کر سوسن کو لگا تھا کہ اس کا ملک بھلے ہی نقل میں آگے ہے، مگر حقیقت میں بہت پیچھے ہے۔ جہاں عورتوں پر ہی مختلف قسم کے الزامات لگائے جاتے ہوں، وہاں بچوں کی ترقی کیا ہو پائے گی۔ اوپری تام جھام اتنی آگئی ہے کہ ہر کام میں کسی کو اس کا خیال ہی

نہیں رہتا کہ اس کام کا مقصد، اس کی روح تو کہیں نہیں کھو گئی ہے؟ بس، مردہ جسم کی سجاوٹ اور ایک بھیڑ، شو یاترا جیسی...... کب سدھرے گا یہ سب...... سوسن شمشاد کی باتوں کو سن کر گھبرا کر سوچتی۔ اس کا دل ملک کے لئے غمزدہ ہوتا، عورتوں کے لئے تڑپتا، اس کو منزل بہت دور نظر آتی۔

پانی کی طرح سطح پر پھڑ پھڑاتے سرمئی کبوتر کی طرح تم میرے دل کے آس پاس آ آکر منڈلاتے رہے، لوٹتے رہے، کیونکہ میں نے اپنے دل کی سطح پر تمہیں پل بھر بھی ٹھہرنے نہ دیا تھا، جانتے ہو کیوں؟ کیونکہ پانی کی طرح بہنا مجھے پسند ہے۔ زندگی میں حرکت چاہتی ہوں اور پھر پانی کی طرح کا یہ شفاف رقیق، اپنے ہی رنگوں کا میرا مزاج کسی کو ساتھ لے کر بہنا چاہتا ہے، مگر تم ہو کہ ٹھوس سطح کی تلاش میں مجھ جیسی کے وجود کے ساگر پر منڈلا رہے ہو، اپنے کو پل بھر جمانے کے لئے اور بے بوند بھر چکھنے کے لالچ میں پریشان۔

سوسن شمشاد کی آنکھوں کا پیغام سمجھنے لگی تھی۔ شمشاد ہی کیا، شمشاد جیسے سارے لوگوں کے دل کا حال جانتی تھی، مگر اس کے دل میں ایسا کچھ کرنے، کچھ بھوگنے، کچھ پانے کی نہ جستجو تھی، نہ ترنگ۔ اس کے دامن میں سب کچھ تھا۔ حقیقت میں ایسا کچھ کرنے یا ان پیغاموں کے جواب دینے کی نہ اسے چاہ تھی، نہ ضرورت۔

مردوں کے ساتھ کام کرنے میں اسے ایک ہی شکایت تھی کہ وہ عورت کے کام، ذہانت سے زیادہ اس کے عورت ہونے میں دلچسپی رکھتے ہیں، جیسے ان کا عورت ہونا ان کی زندگی کی کامیابی ہے۔ ہر رشتہ عورت مرد کی سطح پر جا کر ٹک جاتا ہے۔ کیوں وہ صرف دماغ، صرف کام، صرف حصولیابی نہیں رہ پاتا؟ ٹک ضروری ہے۔ قدرت کا یہ قانون ہے، وہ جانتی ہے، مانتی ہے، محبت کے بغیر کسی بھی تخلیق کا وجود میں آنا ناممکن ہے، لیکن قدرت کے اس فطری قانون کو ہر عورت مرد کے رشتے میں نافذ کیا جانا عجیب نہیں ہے کیا؟ اسے بڑا عجیب سا لگتا ہے، جب لوگوں کا دائرہ کام سے ہٹ کر اس کی شخصیت کے چکر کاٹنے لگتا اور وہ جھنجلا کر سوچتی، آخر کب تک عورتوں کی یہ تصویریں مرد کے فریم میں گھٹتی چیختی رہیں گی؟ اسی لئے وہ کچھ عرصے کے بعد اپنے انداز و سکنات سے واضح کر دیتی کہ وہ امرت کا پیالہ ضرور ہے، مگر ہاتھوں کی پہنچ سے بہت دور۔ آسمان پر چمکتے سب سے روشن تارے

کی چمک سے آنکھیں سینکی جا سکتی ہیں، مگر اسے توڑا نہیں جا سکتا ہے۔ اسی کھلے پن کے سبب اس کے نجی تعلقات میں عورتوں سے زیادہ مردوں کی تعداد تھی۔ کبھی درار نہ پڑی، کبھی کچھ عرصہ بعد اسے سمجھ جاتے کہ سوسن کسی بھی لجلجے رشتے کو زندگی میں قائم نہیں کر سکتی ہے۔ وہ زندگی میں مٹھاس، پاکیزگی، شفافیت اور سچائی کو پسند کرتی ہے۔ جب میٹنگ میں نئے مرد اس سے ملتے، باتیں کرتے تو کچھ عرصہ بعد وہ اپنی جنم جات مانگ پر چلنے لگتے۔ ان کا غیر مناسب برتاوا سے عجیب لگتا، لیکن وہ اپنا رعب بنائے رہتی اور ایسا سلوک کرتی جیسے وہ ان کا نہ اشارہ سمجھتی ہے، نہ مطلب، مگر خود سے کہتی: 'پھڑ پھڑانے دو۔ اس سمندر پر کوئی نہیں ٹک سکتا ہے۔ اور پھر یہ کوئی عشق کے پرندے تھوڑے ہی ہیں، جو سر پٹک کر مر جائیں گے۔ یہ تو وہ موسمی پرندے ہیں، جو موسم کے ساتھ آتے ہیں اور موسم کے بدلتے ہی لوٹ جاتے ہیں۔ دروازے پر لگے ہر بند تالے کو چونچ سے کھولنے کی ان کی ناکام کوشش اور پھر دوسری سمت کی جانب ان کی اڑان، ان کی تاریخ صرف دو لفظوں کی ہے — آنا اور جانا۔ ان کی نہ کوئی تمدن ہے، نہ تہذیب۔ بس، آزادی کے پجاری ہیں۔ ہر چیز پر چونچ مارنا ان کا ایمان ہے، نہ یہ عشق پہچانتے ہیں نہ عرفان۔ یہ صرف ایمان خراب کرتے ہیں، اپنا بھی اور دوسروں کا بھی۔'

مگر یہ نظریہ، یہ جذبہ، یہ سب تو بہت پہلے کی بات ہے، جب غول کے غول کبوتر آسمان سے اڑتے ہوئے نیچے اترتے اور اپنے تھکے بدن کو اس کے چاندی جیسے جھلملاتے وجود میں شرابور کرنا چاہتے تھے اور وہ فخر میں ڈوبی پہاڑ کی چوٹی سے نکلی مسلسل گرتی روشن دھارا کی شکل میں اپنے کو بہتا پاتی تھی۔ کبوتروں کی تشنگی کو پل پل بڑھاتی ہوئی، لیکن کیا مجال، جو کسی بھی کبوتر کو لمحہ بھر بھی اپنے دل کی منڈیر پر ستانے بھی دیا ہو، مگر ...... وہ جنگلی کبوتر جانے کن پہاڑی دروں، سمندروں کو پار کرتا ہوا، اپنے وحشی پنکھ پھڑ پھڑاتا ہوا آیا اور اس کے وجود کے ساگر کو اس نے بوند بھر چکھا نہیں، بلکہ ایک سانس میں ہی پورے کا پورا پی گیا تھا، اس کی آنکھوں کے سامنے، اور وہ ٹھگی سی اس کی پیاس کو بجھتا دیکھتی رہی تھی۔

وہ اسے خالی کر کے اڑ گیا اور وہ ندی کی چھوڑی راہ کی طرح خالی، ننگی، جلتی کایا لئے ننگے پتھروں سے ٹکراتی، پیاس سے پاگل تڑپ رہی ہے۔ ایک پیاس، ایک تشنگی اس کے پتھریلے وجود کو دہکا رہی ہے۔

پیاس بھی کیسی نادانی بھری ہے۔ خالی ندی کی سطح کو دوبارہ بھرنے کی، کہیں کمان سے نکلا تیر بھی کبھی واپس آیا ہے؟

معمولی سی ملاقات کب اور کیسے اتنی گہری ہو گئی اور بدن کے وصل میں بدل گئی، اسے کچھ یاد نہیں۔ بس، لمحہ بھر کے لئے ایک جوار اٹھا تھا— میلوں لمبا اوپر، اس کی شخصیت سے کٹ کر بہت اونچا، مگر چاند کو نہ چھو سکا تھا اور بھاٹا بن کر ساحل پر پچھاڑیں کھاتا، اس کو توڑتا پھوڑتا، اس کا سب کچھ بہا کر دور لے گیا تھا۔

سوسن کا خیال تھا، دو انسانوں کی مڈ بھیڑ، ایک چھوٹی سی ملاقات شبنم کی طرح پاک ہوتی ہے اور وصل شباب کی انتہا پر پہنچ کر موسلا دھار بارش میں بدلتا ہے۔ تب نئے پھول کی پنکھڑی اسے ناز سے اپنے جسم پر شبنم کی بوند کی طرح سجاتی نہیں ہے، بلکہ موسلا دھار بارش سے دھل کر، کھل کر، نکھر کر وہ اور عروج پر پہنچی۔ مگر یہاں...... دراصل اس وصل میں ایسا کچھ نہ تھا۔ یہاں نہ تو نکھار تھا، نہ رنگ، نہ خوشبو، مسلسل بارش کی طوفانی رفتار نے پھول کی پنکھڑیاں دھوئی نہ تھیں بلکہ چھترا دی تھیں اور اب ٹھونٹھ سا پراگ ہوا کے رحم و کرم پر اپنی خوبصورتی، اپنا کنوارہ پن ہار کر جھول رہا تھا۔ بد صورت، خالی، مردہ، پھیکا، بے سمت...... شمشاد نے اسے دھوکہ دیا، لیکن بڑی چالاکی سے دھوکہ دیا! اسے عورت مرد کا نفسیاتی زاویۂ نظریہ سمجھا کر سیکس پر بحث کر کے اس کے اندر کی سوئی اس معصوم بھولی، سادی عورت کو اتنا جگا دیا تھا کہ وہ خود نہ جان پائی کہ ایک سائیکلوجسٹ دوسرے سائیکلوجسٹ کی سائیکلوجی سے کھیلنا چاہتا ہے۔ وہ ان ساری باتوں سے لاعلم، دھیرے دھیرے شمشاد کے اتنا قریب آگئی کہ اس پر اس کا ہر طرح کا بھروسہ بڑھتا گیا۔ کبھی کبھی سوچتی، کتنے دنوں بعد اتنا سلجھا، پڑھا لکھا آدمی دیکھنے کو ملا ہے۔ شاید برسوں تک یورپ میں رہا ہے، یہ اسی کی دین ہے۔

مگر اس قربت کی قیمت جو سوسن نے چکائی، اس کو بعد میں پتہ چلا کہ گناہ کے بارے میں ایسا خوبصورت نظریہ، ایک زندگی سے بھرپور وضاحت، گناہ اور ثواب کی تعریف کو جس مہارت سے شمشاد نے بیان کیا تھا کہ وہ بھی ایک نئی حیرت انگیز دنیا کو سمجھنے کی جستجو کو دبا نہ سکی اور مچل کر ہر طرح کی گفتگو کرتی سوچنے لگی تھی کہ آخر گناہ کیا ہوتا ہے؟ پرایا مرد کیا ہوتا ہے؟ جسم کی لذت کا سکھ بغیر کسی ذمہ داری کے کیا جائے تو کون سا جنتی احساس دیتا ہے؟ بدن حقیقت میں کتاب ہے اور کتاب کا پورا پڑھنا ضروری ہے۔ ادھوری کتاب بھلا کیا مزا دیتی ہے! ابھی تک اس نے یہ ادب کیوں

نہیں پڑھا؟ ابھی تک وہ کیوں اس سائنس کی طرف سے آنکھیں بند کئے تھی؟ زندگی کا کتنا اہم پہلو ہے۔ دنیا کی تخلیق کا راز یہی ہے۔ کتنی بھولی ہے وہ! ان ساری باتوں کو جاننے کی بچپنی میں نئی دنیا کی تلاش اس کے سفر میں گم دماغی جھولے میں جھولتی وہ علم کے آسمان کو چھونا چاہتی تھی، ساتھ ہی ساتھ سینے میں بغاوت کے آتش فشاں کو دبائے سب کچھ بدل ڈالنے کے رجحان سے تڑپتی اس عورت نے اپنے کو سب کچھ جاننے سمجھنے کی راہ پر چھوڑ دیا تھا۔ خیالات سے، دماغی طور سے دھیرے دھیرے وہ شمشاد کے زیادہ قریب ہوتی گئی۔ مگر سننے اور جاننے کی حد تک۔ لیکن وہ جانتی نہ تھی کہ ہر حد کے بعد دوسری حد کی شروعات ہوتی ہے اور اڑنے والا پرندہ ہر حد کو پار کر جاتا ہے، اور اس انجانے پن میں اس نے اپنا سب کچھ شمشاد کو سونپ دیا۔ خوشبو، رنگ، زندگی بھر کا اپنا سرمایہ۔

سوسن کو شیشے کی ہر چیز سے چڑھ سی ہوگئی تھی۔ آخر وہ اب تک ثابت کیوں بچا ہے؟ اور اسی جھنجلاہٹ کو لے کر ایک ایک کر کے وہ ہر شیشے کو توڑ رہی ہے۔ اس کے وجود کا شیشہ جب درک گیا، چیخ گیا، اس میں بال آگیا تو پھر کسی بھی شیشے کو ثابت رہنے کا حق نہیں ہونا چاہئے۔ اسی لئے وہ کھسیائی سی ہر شیشے کو توڑتی تھی۔ گھر میں شیشے کے برتن یا تو ٹوٹے ملتے یا پھر کوڑے دان میں چکنا چور۔ کھڑکی، دروازوں کے شیشے کہیں نہ کہیں سے چٹخے تھے۔

سوسن کو لگتا، اس کے پیروں کے نیچے سے کسی نے ٹھوس زمین چھین لی ہے اور وہ دلدل میں گردن تک پھنسی چھٹپٹا رہی ہے۔

راتوں کی نیند کب کی اس سے روٹھ چکی تھی۔ اب تو یہ عالم ہے کہ جب بھی وہ بستر پر لیٹتی، اسے اپنی خود سپردگی یاد آجاتی۔ وہ سارے لمس، پھر اس لمس میں ڈوبا اس کی بیوی کا اور مختلف عورتوں کے لمس گڈمڈ ہو جاتے۔ اسے اپنے عضو سے نفرت ہونے لگتی، اپنی ساری شخصیت سے نفرت! دل میں پچھتاوا، گہرا پچھتاوا ہوتا، وہ کہاں گری؟ گندگی سے بھرپور نابدان میں! اس کا دل مچلنے سا لگتا۔ اس کی غلطی کہاں پر تھی، جو یوں انجانے ہی کسی کی ہوس کا نشانہ بن گئی۔ اسے بہت کچھ ملا، مگر اس کو کچھ نہ ملا، سوائے روح کو کچوٹتی آہ و بکا کے، جو گھن کی طرح اسے مسلسل کھوکھلا کر رہی ہے۔ اور اسی بچپنی میں وہ ٹیریس پر ٹہلتی رات گزار دیتی۔

شمشاد نے اپنے کو کیسا صاف ستھرا، سلجھا ہوا دکھایا تھا۔ عام مرد کے چھچھورے پن سے اوپر اٹھ کر۔ نکلا وہ عام ہی مرد — چھچھورا، گھنونا، شہوت پرست۔ اور چونکہ وہ سائیکو جسٹ تھا، اس لئے پہلے اس نے سوسن کے دماغ کو پڑھا۔ پھر اس کے ہر اہم پہلو پر سیاہ لائن کھینچی، مہرے بٹھائے اور پھر آسانی سے اپنی منزل پالی۔ ورنہ جہاں کسی دستک پر دروازہ نہ کھلا ہو، وہاں یوں پورے گھر کے لٹ جانے کا کیا مطلب؟

اس دن شمشاد کے آفس میں میٹنگ تھی۔ سوسن کو بھی بلایا تھا اور میٹنگ کے بعد بھیڑ چھٹنے لگی، اسکول پہلے ہی خالی ہو چکا تھا، صرف وہی دو رہ گئے تھے۔ شمشاد کی لچھے دار باتوں کی کہیں انتہا ہی نہیں تھی۔ سوسن نے گھڑی دیکھی۔ گھبراہٹ چھپائے بیٹھی رہی۔ اتنے عرصے سے وہ شمشاد کو جان رہی ہے، مگر اسے کبھی بھی وقت کا خیال کرتے نہیں دیکھا۔ یورپ میں رہ کر جانے کیسے وقت کی قیمت سمجھ نہ سکا؟ اس نے پرس اٹھایا، تھوڑا پہلو بدل کر اٹھنے کی کوشش کی اور تبھی بغیر کچھ کہے شمشاد نے ایک دم سے سوسن کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیا...... سوسن کچھ کہے...... اسے روکے، اس نے سوسن کو اپنے قریب کر اس کی گردن کا بوسہ لے لیا۔ سوسن حیران سی ٹھگی رہ گئی...... دوسرا مرد...... جنت کا احساس...... نئی دنیا کی تلاش اور اس کی حصولیابی...... ساری باتیں ٹکڑوں میں ناچنے لگیں۔ جب تک وہ حیرت کے دائرے سے نکلتی، اپنے کو بچاتی، شمشاد کا ہاتھ اس کے بدن کے نازک ملائم حصوں پر پہنچ گیا۔ ایک چبھن، ایک مسلن...... پرس اس کے ہاتھ سے چھوٹ گیا۔ شمشاد نے اپنی انگلیاں باہر نکالیں۔ اسے سونگھا، گہری لمبی سانس — 'کتنی پیاری مہک ہے۔ لو، خود سونگھو اپنے جسم کی خوشبو کو۔' پھر وہ سب کچھ ہوتا چلا گیا، جس کا سوسن کو وہم و گمان نہ تھا۔ بس، اس نے تڑپ کر شمشاد کے بڑھتے ہاتھ کو روکتے ہوئے اتنا کہا اور اپنے کو چھڑایا تھا— 'اس کھنڈر میں تمہیں کیا ملے گا؟ نہیں، نہیں۔ مجھے چھوڑ دو۔ میں کوئی لڑکی نہیں ہوں، پلیز، شمشاد، مجھے سمجھو......'

'کھنڈر ہی میں تو خزانہ ہوتا ہے اور مجھے اسی کھنڈر کی تلاش ہے۔' شمشاد نے اس کے گالوں کو، بغل کو، سینے کو تیزی سے سونگھتے ہوئے کہا، 'عجیب خوشبو ہے تمہارے بدن کی۔' جب تک وہ اپنے کو چھڑاتی، احتجاج کرتی، سب کچھ اتنا آگے بڑھ گیا تھا، جہاں کوئی بھی روک تھام اب اپنا معنی کھو بیٹھی تھی۔ نازک لتر کی مانند اس کا جسم اور اونچا چوڑا قد آور درخت!

نہیں! نہیں! سوسن نے ٹیرس پر ٹہلتے ہوئے سوچا۔ کمزور اس کا بدن نہ تھا، بلکہ اس کا دل تھا۔ گناہ کو

دیکھنے کی جستجو، بے تابی، رومانس...... مگر وہ سب کچھ...... کچھ بھی نیا دے نہ پایا۔ تیز نکیلی سوئی نے پرانے کپڑے پر سے ادھیڑتی مضبوط بخیہ کے ساتھ کپڑے کے تانے بانے بھی نوچ ڈالے تھے۔

سوسن نئی پرانی دنیا کے خلا میں جھول رہی تھی۔ دماغ اور دل کا یہ عالم تھا کہ گویا وہ دائرہ نما جھولے پر جھول رہی ہو۔ اس ہنگامی واقعہ سے اس کا دماغ تال میل نہیں کھا رہا تھا۔ وہ خاموش تھی، بس لگ رہا تھا کہ اس کے ادھ ننگے بدن سے کوئی اس کی روح کو کھینچ رہا ہے اور وہ سن پڑتی جارہی ہے۔ شمشاد جانے اس کی اس خاموشی کو کیا سمجھ رہا تھا اور اسی حالت میں اسے لگا جیسے وہ بیہوش ہو گئی ہے۔

ہوش میں آنے پر محبت بھرے الفاظ، وعدے، مگر سوسن کو ایسا لگ رہا تھا کہ اس کے وجود پر ڈاکہ پڑ گیا ہے، چوری ہو گئی ہے۔ آج ان باتوں میں پوشیدہ راز کو جاننے کا تجسس مٹ گیا تھا۔ لگا تھا، کچھ بھی نیا جاننے سمجھنے کو نہیں رہ گیا ہے۔ پچھلے دس منٹ کی اس دہشت میں اس نے اپنا خزانہ لٹا دیا، جسے تیس برسوں سے وہ بڑی لگن سے سنبھال کر رکھی تھی۔ کبھی یہ سچا موتی اس نے کامران کو سپرد کیا تھا اور اسی دولت کو یوں کوڑیوں کے مول بھی نہ بیچ سکی!

دُھنکے کے ہاتھوں روئی کی طرح اپنی شخصیت کو بس دُھنتا دیکھتی رہی تھی، جیسے وہ ایک ڈراونا خواب دیکھ رہی ہو۔ سارا بدن سن تھا۔ اس دن شمشاد کی زندگی میں وہ پچاسویں عورت تھی۔ اٹھارہ برس سے آج تک اس نے عورتوں سے لذت یابی کا تجربہ ہی حاصل نہیں کیا تھا، بلکہ اتنا کچھ ان میں پڑھا تھا، دیکھا تھا کہ وہ بڑی آسانی سے ان پر ریسرچ کر سکتا ہے، مگر اس کے ریسرچ کا موضوع تو یہ نہ تھا! وہ کیوں دوسروں کے بتائے راستے پر چل پڑی؟ ہفتوں عورتوں کے ساتھ ہوٹلوں میں بند رہا ہے، غیر ملکوں کی سیر کی ہے۔ وہ عورت کو خوب پہنچانتا ہے۔ اس کی باتوں میں عورت کے لئے احترام کا ذرہ برابر بھی جذبہ نہ تھا، ایک دم بازارو انداز سے سستی باتیں کر رہا تھا۔ اس کا یہ انداز سوسن کے لئے نیا تھا۔ سوسن کو لگا تھا، لاشوں سے بھرے کنویں میں اس کی ریڑھ کی ہڈی توڑ کر اسے ڈال دیا گیا ہے۔ اسے شمشاد کے سینے سے ایسے بدبودار سڑے گوشت کی بو آئی تھی کہ وہ اپنی ابکائی بڑی مشکل سے روک سکی تھی۔ گناہ کیا اتنا بدصورت، اتنا بدبودار ہوتا ہے؟ اتنا بے معنی اور دامن خالی، لٹا پٹا سا؟ چوری کا پھل، وہ بھی اتنا کڑوا!

عورتوں کی لمبی لسٹ بتا کر شمشاد سوسن کو متاثر کرنا چاہتا تھا۔ اسے خوش قسمت بنانا چاہتا تھا کہ اتنے گھاٹوں کا پانی پی کر بھی اس کے سمندر کو پینے کے لئے وہ بےچین تھا۔ پی کر مدمست بھی ہے، مگر سوسن کو لگا کہ وہ بازی ہار گئی ہے۔ اس جوئے میں داؤ پر لگائی ساری پونجی ہار بیٹھی ہے۔ وہ ان عورتوں کی صف میں شامل ہو گئی ہے، جن کو صرف شمشاد نے دیکھا تھا، مگر افسوس! سوسن اپنی طرح کی عورت اسے نہ دکھا سکی۔ کیسا بھاری نقصان کیا ہے شمشاد نے اپنی چاہ کی ویدی پر سوسن جیسی عورت کا......!
اور خود سوسن نے کتنا نقصان خود کو پہنچایا ہے۔ دنیا کی کوئی بھی چیز اس ہار کو جیت میں نہیں بدل سکتی ہے۔ حقیقت میں وہ شمشاد کو کچھ نہ دے سکی تھی، جو دیا، اس کی شمشاد کے پاس کمی نہ تھی۔ شمشاد اسے خاموش دیکھ کر بولا — 'میں اتنا کچھ کہہ گیا، مگر تم خاموش ہو! تم بھی تو کچھ کہو اس مدھر ملن کے بارے میں۔' شمشاد سوسن کے منہ سے کچھ سننا چاہتا تھا، مگر وہاں تو حیرت میں ڈوبی محض اذیت ناک خاموشی تھی۔

سوسن سنبھل چکی تھی۔ وہ سوچ رہی تھی کہ کیا بولے؟ اپنی آئینے جیسی شخصیت کی دراریں شمشاد کو وہ دکھانا نہیں چاہتی ہے۔ بھلے ہی اس کی شخصیت کے آئینے میں لوگوں کو ایک ہی چہرے کے دو مختلف پیکر نظر آئیں — ٹھیک ہے، وہ جان بوجھ کر یا انجانے ہی اس اندھے کنویں میں کود ی ہے، مگر وہ ٹوٹے زخمی گھٹنوں پر کسی کی بھی ہمدردی کا پھاہا نہیں رکھے گی اور نہ ہی وہ اپنا زخم، ٹھونٹھا پن شمشاد پر ظاہر کرے گی کہ وہ لٹ گئی، ٹھگی گئی، چھلی گئی۔ وہ کیوں یہ رونا لے کر بیٹھے! پھر شمشاد ہے کون! ایک گندا نابدان ہے، جہاں جانے کتنے گھروں کی گندگی گرتی ہے۔ اچھا ہے، اپنی ناک بند کر کے وہ ادھر سے گزر جائے۔

خیالوں میں ڈوبی سوسن ٹہلتے ٹہلتے وہیں ٹیریس پر لیٹی چپ چاپ ستاروں کو تاک رہی ہے۔ وہ جس دن ٹوٹی تھی، ٹھیک انہی ستاروں کی طرح بکھر اٹھی تھی — ہزاروں کی تعداد میں۔ اور اب پچھلے ایک ماہ سے اس کی جسم نما عمارت کی ایک ایک اینٹ میں لونا لگ رہا ہے۔ وہ کب تک اسے اٹھائے رہنے کا بھرم پالے گی۔ کسی دن ایک دم سے ڈھہ جائے گی تب شاید کامران انجینئر ہو کر بھی اس عمارت کو دوبارہ کھڑی نہیں کر پائیں گے، نہ اس کے جسم کی ویرانی کو آبادی میں بدل پائیں گے۔ وہ بےچین ہو کر کھڑی ہو گئی۔ اندر آئی۔ کتابیں الٹنے لگی۔ پھر اکتا کر لوک گیت کا کیسیٹ لگایا اور آنکھیں بند کر کے صوفے پر لیٹ گئی۔ تبھی سوسن کے کانوں میں بھیانک قہقہے گونجنے لگے۔ ان عورتوں

کے، جن پر کبھی اس نے انگلی اٹھائی تھی، ان لڑکیوں کے، جن کو اس نے اونچ نیچ سمجھایا تھا۔ وہ سب کہہ رہی ہیں — 'جھوٹی، بگولا بھگت کہیں کی! کتنی سیتا ساوتری بنتی تھی۔ شمشاد کے گرم الفاظ میں پگھل گئی! کیسا کہتی تھی کہ مرد بھنورا ہے، پراگ کا رسیا، نہ کہ پھول کا، اور عورت پھول نہیں ہے کہ جو چاہے اسے توڑ لے، سونگھ لے، مسل دے۔ وہ انسان ہے جسے عزت چاہئے، احترام چاہئے۔ ترقی کرنے کے لئے آزادی چاہئے، کھلی فضا چاہئے۔' سوسن نے اپنی پوری طاقت سے انگلیاں کانوں میں ٹھونس لیں۔

آج گھر کے ٹینک میں ایک خوبصورت مچھلی کی موت اور سوسن کی اداسی۔ ایک کا جوڑا مر گیا۔ مگر کیوں؟ جب کہ دوسری مچھلیاں خوش اچھلتی کودتی تیر رہی ہیں۔ کیا غم تھا اس کو؟ کیا وہ مریض تھی؟ یہ مچھلی کہیں...... کہیں اس نے میری طرح گناہ کو دیکھا، اسے چکھنا تو نہیں چاہا تھا؟ سوسن کے سارے بدن میں جھرجھری سی دوڑ گئی۔ مچھلی تو بغیر پانی کے مرتی ہے اور یہ پانی میں ہی مر گئی؟

کتنی خوبصورت موت ہوئی ہے اس کی!

کاش، میں بھی اس طرح مر سکتی۔ اسی گھر میں جہاں میری روح بستی ہے، جو مجھے جان سے بھی زیادہ پیارا ہے۔ یہیں، اسی اپنی جنت میں مر جاؤں، اسی پیار کی بارش میں، تاکہ ان جہنمی شعلوں سے تو نجات ملے گی۔

سوسن کو لگا، سچ مچ موت اس کو ڈھونڈ رہی ہے اور کسی بھی لمحہ اس کے دروازے پر دستک دینے والی ہے۔ اسے ایسا خوشگوار احساس ہوا جیسے موت، خوبصورت خاموش موت، اپنی ساری خوبصورتی کے ساتھ اس کے روئیں روئیں میں چھانے لگی ہو۔

اس نے کالی، نارنگی مچھلی کے مردہ جسم کو ٹینک سے نکالا۔ اس کے گیلے جسم کا بوسہ لیا — 'میں تیری موت کو سمجھتی ہوں، تیرے غم کا احساس ہے مجھے، لیکن میری موت کو سمجھنے والا کل کون ہوگا؟ میری ننھی مچھلی......!' شاید وہ جنگلی کبوتر بھی نہیں، جس نے اپنے وحشی پروں میں جکڑ کر اسے پھڑ پھڑانے بھی نہ دیا اور امرت کی ایک ایک بوند تک پی گیا۔ اس نے مری مچھلی کی لاش سنبھال کر

گل پاس کی بیل کے نیچے گاڑ دی۔

پرندے بے زبان ہیں تو کیا، اپنے جوڑوں کو پہچانتے ہیں نا؟ اپنے جوڑوں کے ساتھ اڑتے ہیں، چارہ ڈھونڈتے ہیں، گھونسلے میں لوٹتے ہیں، مگر مجھ جیسے انسان، جس کے پاس زبان ہے، عقل ہے، اس کا جوڑا کون ہے؟ وہ، جس نے دو بچے دیئے، گھر دیا، پیار اور بھروسہ دیا...... یا وہ کبوتر، جس نے اس سے تجاوز کیا— مگر بغیر کسی رشتے کے نام سے؟ اس کے دونوں پلے خالی ہیں، نہ وہ باوفا رہی، نہ بیوفا ہے۔ وہ تو کچھ بھی نہ بن سکی۔

اس کی زندگی کا یہ موڑ کتنا حیرت انگیز ہے۔ جو کبھی پسند نہ کیا ہو، جو کبھی چاہا نہ ہو، وہ سب ایک ہی جھٹکے میں ساری مریاداؤں کو، سارے قوانین کو توڑتا، اس کا سب کچھ چھین کر لے گیا۔ آخر کیوں؟ اس میں یہ کمزوری، یہ نشہ، یہ محبت، یہ شہوت— کب، کیوں اور کیسے جنمی؟ کب دبے پاؤں اس کے وجود کا تالا کھول دیا گیا؟ رات کو سوتے میں وہ چونک اٹھتی۔ عجیب خالی خالی سا احساس لئے جیسے وہ لٹ گئی ہو، اور خالی اوٹ، اونچی چھت والے کمروں میں باولی ہوا سیٹی بجاتی پوری عمارت کو ہلاتی بہہ رہی ہو۔

کتنی نفرت تھی اسے ان باتوں سے، اور وہ سب باتیں اس کے ساتھ ہوئیں۔ اسے ان عورتوں، لڑکیوں سے کتنی سخت نفرت تھی، جو ترقی کے نام پر آوارگی کرتی ہیں۔ نئی راہ عورتوں کو نہیں دیتی ہیں بلکہ کھلی راہ بند کرتی ہیں۔

اسے ان عورتوں سے نفرت تھی، جو شادی شدہ مردوں سے رشتہ قائم کرتی ہیں اور دوسری عورت کا حق چھینتی ہیں، ان کے گھر کو مسمار کرتی ہیں۔ اسے ان لوگوں سے نفرت تھی، جو اپنے نظریات کی قربانی ذرا سی عیش و عشرت پاکر کر دیتے ہیں۔ اسے ان عورتوں سے چڑھ تھی، جو مردوں کے آگے جھک کر غلط طریقے سے وہ سب حاصل کرتی ہیں جو ان کا حق ہے، مگر جانے کیوں، وہ سب حاصل کرنے کے لئے جسم سے ہو کر گزرتی ہیں۔

اپنے کو آگ میں تپاتی نہیں ہیں، سونے میں نہیں ڈھال پاتیں، بس آسانی سے سب کچھ پانا چاہتی

ہیں۔ یہ تجارت ہے، یہ کھلی تجارت۔ آج بھی، رنگ وروپ کو بدل کر بھی، اسی ناد میں جانوروں کے لے چارہ سانتی ہیں۔ یہ ترقی نہیں ہے، یہ بھٹکن ہے۔

مگر آج وہ خود ان سارے الزاموں کی صلیب پر چڑھی ہے۔ وہ ساری عورتیں جو آج جدوجہد کر رہی ہیں— کاش، اسے پتھر سے ماریں، لہولہان کر دیں اور اس کی بوٹیاں چیل کوؤں کو کھلا دیں۔ اس نے ان کے بھروسے کو توڑا ہے۔ ان کے آدرش کی مورتی توڑی ہے...... وہ گناہگار ہے۔ کیوں نہ...... وہ ...... خودکشی کر لے...... مگر بچے...... ؟ کامران...... ؟ انہوں نے کیا کیا ہے؟ ان کی کیا غلطی تھی؟ آخر وہ اس بات کو اتنا تول کیوں دے رہی ہے؟ کیا ہوا اگر اس نے کسی کے ساتھ جسم کا رشتہ قائم کر لیا؟ اسنے کسی کو دھوکہ تو نہیں دیا، کسی کو مارا تو نہیں، کسی کو لوٹا تو نہیں، پھر کیوں وہ یوں پریشان ہے؟ جو کیا، صرف اپنے جسم کے ساتھ کیا ہے، پھر اپنے گھر کو اجاڑنے پر کیوں تلی ہوئی ہے؟ کیوں، وہ کیوں اتنی گھٹ رہی ہے؟ کس سے غلطی نہیں ہوتی ہے؟ کتنی بار اس نے خود ایسے رشتوں کے بارے میں کہا ہے کہ جسم کچھ نہیں، روح ہی سب کچھ ہے۔ اگر روح کسی کی ہو جائے تو جسم کا کیا ہے؟ مگر اب وہ کیوں قدامت پسندی کی بیڑی پیروں میں ڈال رہی ہے؟ کیوں، کیوں......؟ اب صرف موت ہے، جو مجھے سکون دے سکتی ہے، مگر کیا مہناز اور عباس کو بھی کبھی...... دوسرے بچوں کی طرح سائیکلوجسٹ کے پاس جانا پڑے گا؟ ان کے پیچھے ان کی ماں کی خودکشی کی کہانی چلے گی......؟

نہیں، نہیں!

خدا کے لئے نہیں!

میں زندگی بھر اپنی مردہ لاش اپنے سینے پر اٹھائے گھوموں گی، مگر اپنے بچوں کو ایسا کچھ نہ دے کر جاؤں گی جو زہر بن کر انہیں زندگی بھر گھلاتا رہے۔ کامران، جو میرے مجازی خدا ہیں، میرے شوہر، میرے دوست، میرے محبوب، انہیں نہیں پتہ کہ میں...... میں پاک نہیں رہ گئی ہوں، مگر پھر بھی میں مروں گی نہیں۔ میں اپنی اس ہار کے بعد بھی زندہ رہوں گی...... یہ ہار نہیں، بلکہ ایک نئی دنیا کی کھوج اور اس سے پیدا نفرت ہے...... جس نے مجھ سے، خود اپنے جسم سے نفرت کرنا سکھا دیا ہے۔ شاید زندگی کی یہ کثافت کبھی دیکھ نہ پاتی، مگر میرا دامن جہاں سارے تجربات سے تجربات.

وہاں یہ کڑوا بھی سہی۔ شاید یہ تلخ تجربہ کل کسی کے کام آجائے......! اگر کسی کے نہیں تو اپنی بیٹی مہناز کے ہی......

شمشاد دوسری لڑکیوں کے ساتھ گھومنے لگا۔ سوسن ذہنی کرب میں چھٹپٹاتی رہی۔ اسے حیرت ہوتی، اس کے اندر کی عورت کتنی مضبوط ہے، کیا اذیت دے رہی ہے، کب معاف کرے گی اسے؟ شاید کبھی نہیں۔

اس دن گھبرا کر وہ عبدالعظیم گئی۔ مذہبی جگہ پر پہنچ کر اسے لگا، اس کے دل کو سکون حاصلہو رہا ہے۔ وہ سکون ڈھونڈ رہی ہے، اسے مل جائے گا، اس کی کھوئی دنیا اسے مل جائے گی۔ جب وہ اندر حرم سے باہر نکلی اور گھر کی طرف لوٹنے لگی تو راستے میں ایک مولوی نے اس سے جانے کیا کہا۔ وہ سمجھی، شاید اس کا ہاتھ کھلا ہے یا سر، اس لئے وہ خفا ہو رہے ہیں کہ ٹھیک سے چادر اوڑھو۔ اس نے گھبرا کر چادر سے اچھی طرح چہرہ اور ہاتھ ڈھکا، مگر وہ پھر کچھ بدبدایا اور پاس آیا۔ پھر اس نے جو کچھ کہا اور سوسن نے جو کچھ سنا، اس کو سن کر سوسن چکرا گئی۔ وہ 'صیغہ' کرنے کی بات کر رہا تھا۔ صرف دو گھنٹے کے لئے، سوسن کو ایک دھکا سا لگا۔ کیا کچھ نہیں ہوتا ہے اس سرزمین پر! بس، کڑواہٹ کو نگلنے کی بات ہے اور آنکھ کھلی رکھنے کی۔ سوسن نے بڑے ٹھنڈے لہجے میں کہا، 'صیغہ کیا تھا، مولوی صاحب! وقت کی کوئی پابندی نہیں تھی، ہر طرح کی آزادی تھی، پھر بھی آج تک جہنم کی آگ میں جل رہی ہوں۔ آپ بتائیے، ایسا کیوں ہے؟ آپ کو کیا یہ آگ نہیں جلاتی؟' سوسن کی بات سن کر مولوی ٹپٹایا۔ پھر سوسن بولی، 'یہاں سکون کے لئے آئی تھی۔ آپ سے یہ لفظ سن کر لگا، میری پشیمانی فضول ہے۔ آپ مولوی ہیں اور......۔'

'پھر یہاں کیا کر رہی ہو کھڑی کھڑی؟ اس طرح مرثیہ مت پڑھو۔ جاؤ، آب توبہ اپنے اوپر ڈالو، دعائے توبہ پڑھو۔ جاؤ، جاؤ، خدا تمہیں سکون دے گا۔' مولوی مڑا اور تیزی سے دوسری پھولدار رنگ برنگی چادروں کے پیچھے بھاگا۔ سوسن کو نئی راہ نظر آئی۔ یہیں شاہ عبدالعظیم میں کتنی بار چادروں میں لپٹی عورتوں پر آب توبہ ڈالتے ہوئے دیکھا تھا۔ شاید اسے بھی سکون مل جائے۔ حرم سے لوٹ کر وہ طمانیت اور امید سے بھر اٹھی تھی۔ اسے لگا تھا، اس کے خیالات کی گرمی اسے دوبارہ مل جائے

گی، ہر وقت متھتا یہ خیال اس کو آزاد کر دے گا۔ اسی امید میں وہ اس حمام خانے میں تہران سے دور مشہد میں اپنے سسرال کے گھر کے پاس آ کر خدا سے معافی مانگ رہی ہے۔ اس گھر میں تو وہ پاکیزہ دلہن بن کر اتری تھی، یہیں گناہ دھو کر دوبارہ شوہر کے قریب جائے گی۔ اپنی جنت دوبارہ جینے...... دوسرے جنم کے بعد!

سوسن نے آب توبہ سر پر ڈال کر اور دعائے توبہ پڑھ کر اپنے کو اس احساس سے نکال لیا تھا، جو تل تل کر اسے مار رہی تھی، مگر اس کے خیالات کی گرمی، اس کی ڈگر، سب کچھ ختم ہو گئی تھی۔ اس نے بہت دیر میں گناہ دیکھا اور اس حادثے نے اسے ہلا کر رکھ دیا تھا۔ جب کبھی بچوں کی کیس ہسٹری میں وہ ان کی ماؤں کے بارے میں کچھ نامناسب سا پڑھتی تو پریشان ہو اٹھتی۔ اب پہلے کی طرح ان پر غصہ نہ ہوتی، بلکہ ایک ہمدردی اور دکھ کے ان کی زندگی کا ٹوٹا پن دیکھتی۔ لگتا، یہ بھی سماج کے سڑے گلے نظام کا ایک حصہ ہے۔ بڑی مچھلی چھوٹی مچھلی کو نگلتی ہے۔

ہر روز شمشاد کے ساتھ گھومتی نئی عورتوں، نئی لڑکیوں کو وہ روک نہیں سکتی تھی۔ کیسے بتاتی، کیا کہتی؟ پھر کسے اچھی، جدوجہد سے خالی زندگی پسند نہیں ہے۔ سبھی جینا چاہتے ہیں۔

سوسن کا دل ہمیشہ بھرا رہتا۔ کس کے سامنے وہ اسے انڈیلے۔ کس سے کہے کہ وہ ایک کڑوا تجربہ رکھتی ہے، آؤ میرے ساتھ اسے بانٹ لو اور مجھے اپنے کندھے پر سر رکھ کر رونے دو، میرے لئے کچھ کہو۔ مجھے اس سوچ کی کھائی سے، تھکن کی اس دلدل سے نکال لو۔ میرے لئے زندگی سے بھرپور باتیں کہو...... مجھے پاک کر دو۔ میرے خیالات کو، میرے جذبات کو پہلے جیسا شفاف اور پانی کی طرح بہتا ہوا مقدس روشن تجربہ دے دو، جو ہر اوبڑ کھابڑ راستے سے اچھلتا گنگناتا ہوا پاک صاف، اپنے رنگ میں ڈوبا بہتا رہتا تھا، مگر کس سے کہے......؟ کامران......؟ ان کا سکھ چھیننے کا اسے کیا حق ہے؟ وہ سب کچھ جان کر جی نہ سکیں گے۔ اسے معلوم ہے...... پھر کوئی دوست...... نہیں، کبھی نہیں۔ وہ دوست اپنے دوست سے کہے گا اور وہ اپنے دوست سے۔ پھر وہ بدنام، گناہ بے لذت کی مقتل گاہ پر شہید!

پھر وہ کیا کرے؟ تبھی اس کی بیٹی مہناز نے کچن کا دروازہ کھولا اور پوچھا، 'ممی، میں اندر آ سکتی ہوں؟'

سوسن نے گردن ہلادی۔پاس آکر مہناز بولی، 'ممی، یہ دختر خون گیر کیا ہے؟'

'یعنی خون لینے والی لڑکی؟' سوسن نے پیاز چھیلتے ہوئے کہا۔

'میں سمجھی نہیں،پانی لینا تو معلوم ہے، مگر خون لینا؟ کیا وہ ڈاکٹر ہوتی تھی؟'

سوسن ہلکے سے مسکرائی۔ بیٹی کے گالوں کا بوسہ لیا۔ اس کے ہاتھوں سے کتاب لے کر بولی، 'ٹھیک ہے، تم ٹھیک سمجھی ہو، مہناز۔ پہلے پرانے زمانے میں ڈاکٹر آج کی طرح تو ہوتے نہ تھے کہ پینسلین کا، ٹٹنیس کا انجکشن دیں۔ وہ تو گھریلو دوا، جنگلی جڑی بوٹی پر یقین رکھتے تھے۔ پرانے قبیلوں میں ایسی لڑکیاں ہوتی تھیں جو جانور کے سینگ سے مریض کے بدن کے کسی حصے سے خون چوس کر تھوک دیتی تھیں۔ ان کا ایسا ماننا تھا کہ گندا خون نکل جانے سے مریض ٹھیک ہو جاتا ہے۔'

'اف، کتنی ڈراونی بات ہے!' مہناز کی آنکھیں پھٹ گئیں، 'کتنا درد سہنا پڑتا ہوگا!'

'آج بھی آپریشن چاقو سے ہوتا ہے نا!'

'وہ تو ہے ممی، مگر......'

'مشہد جانا تو دادی کی کمر دیکھنا۔ وہاں پر چاقو کے ڈھیروں نشان ملیں گے۔ حمام خانے میں چیرا لگنے کا رواج تھا، وہ بھی اس لئے کہ فاسد خون کا بہہ جانا اچھا ہوتا ہے۔ یہاں تک کہ پہلے جب کوئی بہت اوپر سے گرتا تھا اور خون نہ بہتا تھا تو اس کا علاج حکیم اس کے ماتھے پر چاقو سے چیرا لگا کر کرتے تھے تاکہ خون اندر جمع نہ ہو کر باہر بہہ جائے اور مریض مرے نہیں بلکہ صحت یاب ہو جائے۔ سمجھ گئی؟'

'سمجھ گئی، مگر یہ تو بتایئے، آپ، آج پکا کیا رہی ہیں؟'

'کوکو سبزی، پلاؤ، باد مجنوں...... کیوں، ٹھیک ہے؟ تمہیں تو پسند ہیں نا؟'

'مگر ممی، مجھے اس کھانے کے بعد کیک کھانا بھی پسند ہے۔' مہناز نے ماں کے گال کا بوسہ لیتے ہوئے کہا۔

'کیک بھی بنادوں گی، بس! اور کچھ کھانا ہے؟'

'نہیں! ممی، یہ حمیدہ خانم کب لوٹیں گی؟ آپ سے ہفتے بھر کی چھٹی لے کر گئی تھیں، اور اب اتنے دن ہو گئے، نہیں لوٹیں! آپ تھک جاتی ہیں نا اتنا کام کر کے؟'

'نہیں، کام ہی کتنا ہے، پھر مجھے تو اچھا لگتا ہے۔' سوسن نے سبزی کاٹتے ہوئے کہا۔ حقیقت میں وہ گھریلو کاموں میں مصروف ہو کر بہت کچھ بھول جاتی ہے۔

مہناز چلی گئی۔ سب کہتے ہیں، مہناز ایکدم سوسن کی طرح ہے۔ وہی خوبصورتی، وہی ملائمیت، وہی تیز ذہانت، دوسروں کے درد پر تڑپ جانے والا دل۔ سوسن اپنے بچپن میں کھو گئی...... وہ کتنی تیز تھی! آج تک شیراز میں اس کے گھر اور محلے والے اس واقعہ کو یاد کرتے ہیں۔ وہ یہی کوئی آٹھ برس کی ہو گی۔ گرمی کی دوپہر، رمضان کا مہینہ۔ محلے کی ساری دکانیں بند۔ بس علی آغا کی دکان کھلی تھی۔ گھر سے وہ کھجور لینے نکلی تھی۔ کیا کرے؟ علی آغا کا پتہ تھا۔ پکا مذہبی آدمی تھا اور اپنے نظریات کے سبب کبھی بھی عورت اور بچوں کے ہاتھ سودا نہیں بیچتا تھا۔ کہتا تھا، دونوں معصوم اور مظلوم ہیں۔ ان سے پیسہ لینا گناہ ہے۔ مگر اب وہ کیا کرے؟ شاید آج دے دے۔ سب دکانیں بند ہیں۔ وہ آگے بڑھی، علی آغا سے کھجور مانگے۔ اس نے نہیں دیئے۔ سبب بتایا تو بھی بولا، 'چلو، بھاگو، اس دھوپ میں کہاں گھوم رہی ہو! جب دکان کھلے تو آکر لے جانا۔ یہاں اس دکان سے سامان نہیں ملے گا۔' سوسن کو غصہ آیا۔ سیدھے محلے کی کوتوالی پہنچی۔ شکایت کی کہ دکاندار سامان رکھ کر بیچ نہیں رہا ہے۔ سپاہی کو اتنی سی بچی پر تعجب بھی ہوا، خوشی بھی۔ علی آغا کو کھجور سوسن کے ہاتھوں بیچنے پڑے۔ سوسن کی اس حرکت پر کوتوالی میں تو سب حیرت زدہ رہ گئے تھے۔ مگر آٹھ سال کی بچی کی اس بیباک بہادری پر پورے محلے نے دانتوں تلے انگلی دبائی تھی۔ تب سے سوسن بچوں میں ایک آئیڈیل بن گئی تھی۔ ہر بات میں سچ بولنے والی، کسی سے نہ دبنے والی، تیز، تیز ذہانت کی یہ لڑکی، خاص کر محلے کے سارے لڑکوں کے دانت کھٹے کر دیتی تھی۔ وہ حقیقت میں سوسن سے نہ صرف گھبراتے تھے بلکہ اس کا لوہا بھی مانتے تھے۔

آج وہی سوسن ٹوٹ رہی ہے۔ وہ سوسن کبھی نہیں ٹوٹے گی۔ ٹھیک ہے، اس نے گناہ دیکھا، اسے بھوگا بھی۔ یہ بھی سچ ہے کہ وہ اپنی جستجو چھپا نہ پائی۔ مگر اس کا اختتام یہیں ہو جاتا ہے کہ اس نے وہ تجربہ دہرایا نہیں اور یہی اس کی جیت ہے، ہاری بازی بھی تو جیتی جا سکتی ہے۔ اس کے ہاتھ سینے کے -

تپکن پر پہنچے۔ یہ چمکتے رستے زخم اس کی جیت کی نشانی ہیں۔ اس سے بول کر، کہہ کر، انہیں چھو کر وہ اپنے کو خالی کرے گی۔ یہ تو حقیقت میں اس کے گناہ کے سورج ہیں، جو باقی زندگی اسے روشنی دیتے رہیں گے کہ عورت کہیں بھی غلط ڈھنگ سے مرد کے آگے گھٹنے نہیں ٹیکے گی، چاہے وہ عورت ساری دنیا میں ایک ہی ہو، مگر ہے تو صحیح!

سوسن کے چہرے پر اطمینان کی چمک تھی۔ ہاتھ تیزی سے سبزی کاٹ رہے تھے۔ سوسن تھوڑی دیر کے لئے اس فکر سے آزاد ہوئی تھی۔ دوبارہ اس میں ڈوب گئی۔ گدھ کے جنگلی پروں کی پھڑپھڑاہٹ، مردہ گوشت کی بو، یاخدا! کب سے نہ اس نے کچھ پڑھا ہے، نہ لکھا۔ کیا کرے وہ...... سب کچھ چھوٹ گیا ہے، آنا جانا۔ سارا دن گھر کی چہاردیواری میں اپنے کو قید کئے گھر کے کاموں میں اپنے کو الجھائے رکھتی ہے...... تھوڑی دیر کے لئے مور کی طرح ناچتی ہے، مگر پیر دیکھتے ہی رک جاتی ہے۔ کتنے ادھورے کیس پڑے ہیں......؟

اب وہ رکے گی نہیں۔ ذرا سی حماقت پر اپنا سب کچھ نہیں گنوائے گی۔ وہ ماں ہے، بیوی ہے، ٹیچر ہے۔ ایک ملک کی شہری ہے، اس کی ذمہ داریاں بہت ساری ہیں، وہ ان سب کو نبھائے گی...... وہ اپنے کو مرنے نہیں دے گی۔ وہ آج تک اپنے لئے نہیں جی، پھر آج اپنے لئے، صرف اپنے لئے مرے کیوں؟

اس نے ٹاپ کے بٹن کھولے، کروسیٹ ڈھیلی کی اور سلاد کاٹنے کے باریک، تیز چاقو سے سینے کے سفید اناروں پر ابھرے چاند کے دھبوں جیسے نشانوں کو غلط کرنے کے لئے کئی جگہوں پر نشان لگایا۔ خون چھلکا...... بوند بنا اور ٹپکا...... دھاریں ڈیلٹا بناتیں کروسیٹ میں ڈوبنے لگیں، ٹاپ کو تر کرتی اسکرٹ میں جذب ہونے لگیں...... سوسن اٹھی۔ اندر باتھ روم میں گئی۔ کپڑے اتار ڈالے۔ آئینے پر نگاہ ڈالی، 'واقعی میرے سینے بڑے حسین ہیں۔ قندھاری، سرخ گدرائے خونی انار!' آگے بڑھی، ٹب میں کھڑی ہو گئی۔ خون اس کے پیٹ سے ہوتا، جانگھوں کو تر کرتا، پیروں کو بھگونے لگا...... شاور کھول دیا...... پانی سے دھلتے چہرے پر ایک اطمینان تھا، خوشی تھی، جیسے وہ ایک روشن دھار ہو اور پہاڑ کی اونچی چوٹی سے مسلسل کبوتروں کی تشنگی کو پل پل بڑھاتی بہہ رہی ہو، چہرے پر طمانیت بھری مسکراہٹ، ایسی مسکراہٹ جیسے پرندہ قید سے ابھی ابھی آزاد ہوا ہو— کھلے آسمان میں پر

پھڑ پھڑاتے، اونچا اڑنے کے لئے۔

مگر سوسن کی یہ آزادی بھی جانے کتنے دیر کی ہے۔ کون جانے، کل پھر ذہن میں چھپا وہ چڑی مار اسے چپکے سے پکڑ کر دوبارہ کہیں پشیمانی کے، شرمندگی کے پنجڑے میں قید نہ کردے اور پھر اس کی روح پنجڑے کی تیلیوں سے سر پٹک پٹک کر کہیں فریاد نہ کرے کہ مجھے آزاد کردو۔ مجھے اس گناہ کی سلاخوں سے نکال دو! مجھے میرے خیالات دے دو، مجھے میری چھوٹی سی دنیا واپس کردو۔

غنچہ دھن

غسل خانہ دعاؤں کی آواز سے گونج رہا تھا۔ فوارے کے نیچے کھڑی مہرماہ بدن کا ایک ایک حصہ بڑے جتن سے مل مل کر دھو رہی تھی۔ پاکیزگی اور ناپاکی وسوسہ کی شکل میں اس کے دل ودماغ میں بس گئی تھی۔ مہرماہ کو غسل خانے کے اندر گھسے ہوئے دو گھنٹے سے زیادہ ہوگئے تھے۔

'نہا چکیں؟' باہر سے سہیلہ خانم کئی بار یہ سوال بیٹی سے کر چکی تھیں۔

'جی، ماماں! آپ نے مجھ سے کچھ کہا؟' مہرماہ کے ہونٹ دعا پڑھتے ہوئے رک گئے۔ پانی کے شور کے درمیان اس نے اونچی آواز میں سہیلہ خانم سے پوچھا۔

'ارے، نہا چکیں تم؟' سہیلہ خانم نے اپنے سوال میں مٹھاس لاتے ہوئے پوچھا۔

'نہیں ماماں!...... ابھی کہاں؟'

'بارہ بج رہے ہیں...... اسکول تو گیا...... ' سہیلہ خانم بڑبڑاتی ہوئی کچن میں لوٹ آئیں۔

'اب تو پھر سے غسل کرنا پڑے گا، بیچ میں بول جو دی میں!' مہرماہ نے ٹھنڈی سانس بھری۔

نہاتے نہاتے اس کا ہاتھ بھول سے دیوار کو چھو گیا۔ 'اف کیا مصیبت ہے!' کہہ کر اس نے کہنی کے اوپر سے نیچے تک ہاتھ کو تین بار پھر غوطہ کیا۔ نہا کر جب وہ ٹب سے باہر نکلنے لگی تو بے خیالی میں اس کا ہاتھ گھنٹی کے بٹن سے ٹکرایا۔ غسل خانے کے باہر کا لال بلب جل اٹھا اور گھنٹی بجنے لگی۔

سہیلہ خانم کے ہاتھ ریحان کی پتی توڑتے توڑتے رک گئے۔ وہ گھبرائی ہوئی باورچی خانے سے نکل کر آنگن کی طرف لپکیں۔ خدا خیر کرے۔ دروازہ بھی اندر سے بند ہے، کہیں بے ہوش نہ ہوگئی ہو؟' ہانپتی ہوئی وہ غسل خانے کے دروازے کو زور زور سے پیٹنے لگی۔

'مہرماہ...... مہرماہ، کیا بات ہے؟ تم ٹھیک تو ہو نا؟'

'کچھ نہیں، ماماں۔' مہرماہ نے تولئے سے بدن پونچھتے ہوئے کہا۔

'پھر بیٹی، گھنٹی کیوں بجائی تھی؟' سہیلہ خانم نے بہت بے چینی کے ساتھ پوچھا۔

'میں نے تو نہیں بجائی گھنٹی؟' اندر غسل خانے میں بدن پونچھتے پونچھتے مہرماہ کے ہاتھ رک گئے۔

'خیر!' سہیلہ خانم جانے کے لئے مڑیں۔

'یااللہ......! میں تین بار نہاچکی ہوں...... تھک گئی ہوں ماماں، اب تو!' مہرماہ کی بھاری ہوتی آواز سہیلہ خانم کے کانوں میں پہنچی۔

'بس، اب چوتھی بار خدارا مت نہانا، ورنہ نمونیہ ہو جائے گا!' سہیلہ خانم نے جھنجلاہٹ دباتے ہوئے کہا۔ اندر خاموشی رہی۔

'گرم پانی بھی ختم ہو رہا ہو گا۔ میرا کہنا مانو بیٹی تو کپڑے بدل لو۔' سہیلہ خانم نے بہلایا۔ اندر خاموشی کو توڑتی فوارہ کھلنے کی آواز ابھری۔

'سن رہی ہو مہرماہ، میں کیا کہہ رہی ہوں؟' اس بار سہیلہ خانم کی آواز میں غصہ سے بھری دھمکی تھی۔

'اف ماماں...... بنا نہائے میں رہ نہیں پاؤں گی!' اندر سے رندھی سی آواز ابھری۔

'ارے صرف کندھا پانی سے دھو ڈالو، میری گڑیا۔ ویسے غوطہ کی ضرورت بھی کیا ہے؟ نہانے سے پہلے سارا غسل خانہ تمہیں نے تو دھویا تھا نا؟ شاباش......! اب کپڑے بدل ڈالو۔ جنوری کا مہینہ ہے۔ سنو، میں نے آج قورمہ سبزی بنائی ہے۔ پلاؤ دم پر ہے......! بس کھانا لگا رہی ہوں!' سہیلہ خانم نے بیٹی کو اس کی پسندیدہ چیزوں کا نام لے کر پھسلایا۔

'نہیں......! نہیں، ماماں......!' مہرماہ کے رونے کی آواز فوارے کی آواز میں بھی ابھر رہی تھی۔ سہیلہ خانم بے چین ہو گئیں۔ دروازے کی طرف اٹھا ہاتھ بے اختیار نیچے گر گیا۔ پاؤں پٹکتی غصہ اور غم میں بڑبڑاتی کچن کی طرف بڑھیں—'کیسا عجیب بدلہ لیا ہے خانم جان نے مجھ سے؟'

جس دن مہرماہ نہاتی اس دن گھر میں ہنگامہ بپا ہو جاتا تھا۔ سہیلہ خانم صبح سے ہی اپنے کو جلی کٹی سنانا

شروع کر دیتی تھی۔ 'لڑکی دادی پر گئی ہے!' جب تک خانم جان زندہ رہیں ان کے دل کا ناسور بنی رہیں اور اب مرنے کے بعد وہ مہرماہ کی وسوسہ کی بیماری میں ناسور کی طرح بہہ رہی ہیں۔ انہیں آخری دنوں میں وسوسہ کی ذہنی بیماری ہو گئی تھی۔ پاک رہنے کا جنون تھا۔ تبھی نہاتیں تو نہاتی چلی جاتی تھیں۔ ناخن سے بال تک کو ہزار بار پانی سے پاک کرتی تھیں۔ اسی سال کی ہو کر مری تھیں۔ پندرہ سال ان کا ساتھ رہا ہے، جس میں سے آخری دس سال وسوسہ اور وہم سے پریشان تھیں۔ مریں بھی تو ڈبل نمونیہ میں، مگر مہرماہ تو صرف بارہ سال کی ہے۔ ساری زندگی گزارنا ابھی باقی ہے۔

سہیلہ خانم نے پلاو پز کا پلگ نکالا۔ کھانا تیار تھا، مگر شوہر آفس سے اور بیٹی حمام خانہ سے نہیں نکلے تھے۔ وہ چپ چاپ گملوں میں پانی دینے لگیں۔ ان کی ساس خانم جان انہیں آخر تک پسند نہیں کر پائی تھیں۔ اس کی وجہ ساس کی بیوہ بہن کی بیٹی زر نگار تھی، جس سے وہ امجد کی شادی کرنا چاہتی تھی۔ امجد آغا نوکری کے سلسلہ میں اصفہان گئے تو ایک دن میدان شاہ میں گھومتے ہوئے انہیں بہزاد مشہور قدیم ایرانی مصور کا شاہکار جیتا جاگتا نظر آ گیا تھا۔ اس پر وہ دل و جان سے نثار ہو گئے تھے۔ لوگ میدان شاہ میں آکر فنکاروں کے شہ پارے خریدتے تھے۔ منہ مانگی قیمت ادا کرتے تھے۔ امجد آغا سہیلہ نام کی پینٹنگ کے لئے اپنا سب کچھ قربان کر دینے کو تیار تھے۔ خانم جان نے سر پیٹ لیا تھا۔ بار بار یہی کہتی جا رہی تھیں 'ہوش میں آؤ بیٹا، اصفہان کی عورتیں چہرے سے جتنی سفید چمڑی کی ہوتی ہیں اس سے زیادہ ان کا خون سفید ہوتا ہے۔ دیکھنے میں مصری کی ڈلی کی طرح میٹھی اور ٹھوس، کھانے والے کے منہ میں پانی بھر آئے، مگر کردار ایسا ملائم ملائی جیسا کہ ...... پوچھو مت، جس نے چاہا اس کے ہاتھوں میں لپٹ گئی!'

ماں کی سخت تنقید کے باوجود امجد ایک ٹانگ پر کھڑے رہے۔ سہیلہ خانم اصفہان سے شیراز آگئیں' مگر خانم جان زہریلے تیر سہیلہ کے سینے میں پیوست کرنے سے باز نہیں آتی تھیں۔

'اصفہانی عورتیں...... ' سنتے سنتے ایک دن سہیلہ خانم کے منہ سے نکل ہی پڑا۔

'خانم جان، آپ بھی عورت ہیں، پھر عورت ذات کی مذمت کیسی؟ مشہد کے مرد کیا کم برے مشہور ہیں، مگر آپ کے گھر میں...... ؟' اس دن سے ہی طعنہ کم ہوتے ہوتے لگ بھگ ختم ہی ہو گیا تھا۔ امجد آغا کے والد مشہد شہر میں دس پشتوں سے رہتے آئے تھے۔

'ماماں—!' مہرماہ کی آواز سے سہیلہ خانم چونک پڑیں۔

کیا مہر؟' کہتی ہوئی سہیلہ خانم ہاتھ کا ہزارہ رکھتی ہوئی کمرے سے باہر نکلیں۔

'ماماں...... سچ میں بہت تھک گئی ہوں!' مہرماہ کا سفید بے داغ چہرہ ڈھل کر کورا لٹھا نظر آرہا تھا، جس پر نیلی نسیں کچھ زیادہ ہی ابھری نظر آنے لگی تھیں۔

'کیسے سمجھاؤں اپنی بیٹی کو میں!' سہیلہ خانم نے اسے آگے بڑھ کر پکڑا اور آتش دان کے نزدیک صوفے پر بٹھایا۔ پیالے میں ٹماٹر کا گرم سوپ انڈیلا اور مہرماہ کے ہاتھ میں تھمادیا۔

دروازے کی گھنٹی بجی۔ امجد آغا داخل ہوئے۔

'ارے مہر جان، اسکول نہیں گئیں کیا؟ طبیعت تو ٹھیک ہے نا تمہاری؟' امجد آغا بیٹی کو گھر میں دیکھ کر پریشان ہوگئے۔

'کچھ نہیں بابا......!' مہرماہ جھینپ گئی۔

'کھانا لگ گیا ہے!' سہیلہ خانم نے اعلان کیا۔

'آئی، ماماں۔' کہتی ہوئی مہرماہ سوپ کا خالی پیالہ اٹھا کر میز کی طرف بڑھی۔

کھانے کی میز پر خاموشی چھائی رہی۔ امجد آغا بیوی کے چہرے پر چھائی فکر کو پڑھ چکے تھے۔ خاموشی میں ہی خیریت دیکھی۔ ادھر سہیلہ خانم سوچ رہی تھیں کہ خانم جان جب بھی کوستیں تو یہ ضرور کہتی تھیں کہ 'جس طرح کسی نے میرے دل کو دکھ دیا ہے، خدا اس کے دل کو بھی درد سے آشنا کرے'۔ یہ طعنہ انہیں مہرماہ کے چاروں طرف سانپ کی شکل میں کنڈلی مارے بیٹھا نظر آرہا تھا۔

مہرماہ کے لئے پیغام پر پیغام آرہے تھے۔ سہیلہ خانم بتاتے بتاتے تنگ آچکی تھیں کہ مہرماہ صرف بارہ سال دو ماہ نو دن کی ہوئی ہے۔ مہرماہ بارہ کی ہے اور وہ خود اٹھائیس سال کی ہیں۔ ان کی عمر کی لڑکیاں تو آج بھی پڑھ رہی ہیں۔ نجمہ اور شیریں پی ایچ ڈی میں لگی ہوئی ہیں جبکہ وہ ایک جوان لڑکی کی ماں بن

چکی ہیں۔ ٹھیک ہے ان کی شادی پندرہ سال کی عمر میں ہو گئی تھی، مگر اس کا مطلب یہ نہیں کہ خاندانی روایت بن جائے؟ بیس سے پہلے وہ مہرماہ کو بیاہنے سے رہیں۔'

امجد آغا آتے رشتوں سے بے حد مطمئن نظر آرہے تھے۔ ایک دو لڑکے انہیں پسند آئے تھے۔ سہیلہ کے کہنے پر بولے۔ 'جو حالات ہنگامہ پرور چل رہے ہیں، اس میں اپنی عزت اسی طرح بچا سکتے ہیں، ورنہ......!'

'مگر یہ تو جیتے جی لڑکی کو کنویں میں ڈھکیلنے والی بات ہوئی!' سہیلہ جواز دیتیں۔

'میں نہیں چاہتا سہیلہ کہ جو کچھ ہو رہا ہے وہ ہماری زندگی کا حصہ بن جائے! تم سمجھو تو آج سیاست کا بھوکا اژدہا جوان خون کا پیاسا ہے۔ کہاں تک، کب تک مہرماہ کو بچا کر رکھو گی؟ وہ اژدہا جوان جسم کی خوشبو سونگھتا ہمارے گھر میں بھی داخل ہو جائے گا۔ کنواری اور شادی شدہ لڑکی میں، لڑکی اور عورت کا فرق ہو جاتا ہے۔ اگر مہرماہ کو کچھ ہو گیا تو میں اپنے کو معاف نہیں کر پاؤں گا۔ آگے تمہاری مرضی ہے!' کہہ کر امجد آغا نے دوسری طرف کروٹ بدلی۔

سہیلہ خانم چپ چاپ لیٹی بیٹی کے بارے میں سوچ رہی تھیں کہ کیا کیا جائے؟ اسکول ختم کرلے گی اس سال؟ کالج میں اگلے سال داخل ہو گی، چار سال بعد انٹر کر کے کالج، اس کے بعد کیا یونی ورسٹی جائے گی؟ تین سال سے تہران یونی ورسٹی بند ہے۔ فکر کی کیا بات ہے۔ چار سال تک یہ حالت برقرار تھوڑے ہی رہے گی؟ مہرماہ کی شادی کر دی تو جانے کتنے ارمان کمہلا جائیں گے۔ شاید آگے پڑھ بھی نہ سکے۔ لڑکا کتنا بھی ٹھوک بجا کر ڈھونڈو، مگر ہو گا تو وہ بھی آدم کی اولاد، کمزوریوں کا پلندہ۔ امجد کا کہنا ٹھیک ہے، مگر وہ فرشتہ مجھے ملے گا کہاں جو میری بیٹی کو آرام سے رکھ سکے؟

نیند سے آنکھیں بوجھل ہونے لگیں۔ کروٹ بدل کر انہوں نے آنکھیں بند کر لیں۔ نیند میں غرق دماغ پر ایک خوب صورت سی شبیہ ابھری، شادی کے سفید لباس میں ہنستی ہوئی مہرماہ پھولوں کا گلدستہ ہاتھوں میں لئے کھڑی تھی۔

پڑوس میں اٹھتے شور سے امجد آغا کی آنکھیں کھلیں۔ پھر سہیلہ اور مہرماہ بھی جاگ گئیں۔ اندھیرے

میں ایک دو ہوائی فائر ہوئے، پھر خاموشی چھا گئی۔ سامان الٹنے پلٹنے، سوال کرنے کی تیز آوازیں خاموشی کو توڑ کر پھیلنے لگیں۔ پھر رات کا سناٹا چیرتی ہوئی کمیٹی کی گاڑی اسٹارٹ ہوئی۔ پڑوس میں سسکی کی مدھم آوازیں ابھریں اور پھر کالا اندھیرا ہر شور، ہر غم، ہر بے چینی کو پی گیا۔

امجد آغا آہستہ سے کھڑکی کے پاس جا کر کھڑے ہوگئے۔ آسمان صاف تھا۔ تارے بکھرے ہوئے تھے۔ ان کے بیچ دوج کا پھیکا چاند مدھم روشنی پیڑوں اور سڑک پر بکھیر رہا تھا۔ وہ تھوڑی دیر سامنے سانپ کی طرح بل کھاتی سڑک کو دیکھتے رہے، پھر بستر پر لوٹ آئے۔

'کیا کوئی تھا؟' سہیلہ خانم نے پوچھا۔

'کون ہوگا سوائے اندھیرے کے؟' امجد آغا نے لیٹتے ہوئے کہا۔

'جانے بے چاروں کے گھر سے کیا کیا اٹھا کر لے گئے ہیں؟ دونوں لڑکیوں کا جہیز تیار تھا۔ کل شام کو سارے زیور صاف ہو کر آئے تھے' ٹھنڈی آہ بھرتے ہوئے سہیلہ خانم بولیں۔

'اس وقت جانا مناسب نہیں ہے۔ کل صبح جا کر پوچھیں گے۔' جمائی لیتے ہوئے امجد آغا بولے۔

'اگر جہیز لٹ گیا تو سمجھو نفیسہ خانم زندہ نہیں بچیں گی۔ تنکا جوڑ جوڑ کر دونوں لڑکیوں کا جہیز جمع کیا تھا۔'

'سبھی جی رہے ہیں سہیلہ، وہ بھی جئیں گی!'

'نہیں، امجد، ایسا نہ کہو' وہ ٹھہرے غریب لوگ۔ اس بڑھاپے میں اب کہاں سے لائیں گے یہ سب دوبارہ؟'

'خیر، خدا سب کا پالن ہار ہے!'

'ماماں......!'

'کون، مہرماہ؟'

'ہاں ماماں! مجھے ڈر لگ رہا ہے۔'

'آؤ، ہمارے پاس آجاؤ!'

مہرماہ تکیہ بغل میں دبائے کمرے میں داخل ہوئی اور امجد آغا و سہیلہ خانم کے بیچ میں لیٹ گئی۔ ماں باپ کی تھپکی سے مہرماہ نیند میں ڈوب گئی۔ صبح ہونے والی تھی۔ تینوں ایک دوسرے سے لپٹے پڑے سو رہے تھے۔

کلاس شروع ہو گئی تھی۔ مہرماہ آدھ گھنٹہ دیر سے پہنچی تھی۔ ہفتے میں کئی بار اس کی اسکول بس چھوٹ جاتی تھی۔ بعد میں ابا اسے اسکول چھوڑنے جاتے تھے۔ اسکول میں پرنسپل سے لے کر ٹیچرز تک سب مہر کو ٹوک ٹوک کر تھک چکی تھیں۔ جب ایک دن اسے اسکول سے نکال دینے کی دھمکی ملی تو مجبوراً امجد آغا کو اپنا منہ کھولنا پڑا۔ سب کچھ سن کر پرنسپل نرم پڑ گئی تھیں۔ ٹیچرز بھی اسے دیر سے آنے پر ٹوکتی یا ڈانٹتی نہیں تھیں مگر خود مہرماہ کھسیائی، پریشان رہتی تھی۔ لڑکیوں نے بھی اس کی اس دیر کرنے کی عادت پر چڑانا بند کر دیا تھا۔

اس وقت مہرماہ شرمندہ سی کلاس کے باہر سر جھکائے کھڑی تھی۔ اس کا دل رونے کو چاہ رہا تھا۔ آخر وہ کچھ بھی گندا کیوں نہیں دیکھ سکتی ہے؟ جب تک ہاتھ دھو نہ لے اسے متلی سی آتی رہتی ہے، من گھن سے بھرا رہتا ہے۔ اس کی دوسری سہیلیاں ہیں اور لڑکیاں ہیں، انہیں ایسا کیوں نہیں ہوتا ہے؟

گھنٹے کی آواز سے مہرماہ چونک پڑی۔ بلقیس خانم، اس کی ہوم سائنس کی ٹیچر، کلاس سے باہر نکلیں۔ ایک سرسری نظر انہوں نے مہرماہ پر ڈالی۔ کچھ کہنے کے لئے ہونٹ ہلے، پاؤں ٹھٹھکے مگر دوسرے پل وہ سینڈل کی کھٹ کھٹ کے ساتھ کاریڈور میں گم ہو گئیں۔ مہرماہ کی آنکھیں ڈبڈبا گئیں۔ یہ پل مہرماہ کے لئے جان لیوا تھا۔ بلقیس خانم بھی اسے سمجھ نہیں پاتی ہیں۔ وہ تو ہوم سائنس کی ٹیچر ہیں۔ ہمیشہ صفائی کی باتیں کرتی ہیں۔ اس لئے بے بس آنکھوں میں جمے پانی کو پیا اور اندر کلاس میں گھسی۔ لڑکیاں کاپی کتابیں سمیٹنے میں مصروف تھیں۔ وہ خاموشی سے چلتی ہوئی اپنے ڈیسک کے سامنے کھڑی ہو گئیں۔

'کیسی ہو، ماہ؟' رخسانہ نے پوچھا۔

'ٹھیک ہوں، تم کیسی ہو؟' مہرماہ نے اپنی پیاری سہیلی کو دیکھا۔

'میں ایک دم ٹھیک ہوں۔ لو—— یہ رہا ہوم ورک، اسے اتار لو'۔ رخسانہ نے کاپی ڈیسک پر رکھ دی۔

'شکریہ رخسانہ!' مہر نے مسکرانے کی کوشش کی۔ آنکھوں میں دنیا بھر کا احسان سمٹ آیا تھا۔

'مہرماہ کو سمجھا دو کہ کسی طرح کی سیاست میں حصہ نہ لے!' امجد آغا نے کوٹ ہینگر پر ٹانگتے ہوئے کہا۔

'یہ تو بہت مشکل کام ہے......! لڑکیاں بیچاری کیا جانیں سیاست کی الف ب، یہ تو پرنسپل کا حکم ہوتا ہے کہ لڑکیاں جلوس میں جائیں!' سہیلہ خانم نے سلاد کی پلیٹ میز پر رکھتے ہوئے کہا۔

'پھر بھی......!' امجد آغا نے ہاتھ دھوتے ہوئے کہا۔

'کہہ دوں گی، سمجھا دوں گی، مگر جب نمبر کٹنے کا سوال ہوا تو یہ سمجھ لو کہ لڑکی فیل ہوگی۔ اس وقت کچھ مت کہنا!' سہیلہ خانم نے شوہر کی پلیٹ میں چاول نکالے۔

'تم تو ہر بات پہلے سے طے کر لیتی ہو!' امجد نے پیاز چباتے ہوئے کہا۔

'حقیقت کہہ رہی ہوں، کامران اور ثمینہ کے ساتھ یہی ہوا ہے!' سالن نکالتے ہوئے سہیلہ خانم بولیں۔

'کتنے سال کی ہو گئی مہرماہ؟'

'چشم بددور، پورے تیرہ کی ہو گئی ہے۔ اگلے ہفتے سالگرہ ہوگی!'

'میں چاروں طرف کی خبریں سن سن کر اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ مہرماہ کی شادی کردوں، اسی میں ہماری بھلائی ہے ورنہ لڑکی کا معاملہ ہے۔ کچھ ہو گیا تو دکھ الگ، جگ ہنسائی الگ!'

'مجھے تو بیس سے پہلے مہرماہ کی شادی کرنی نہیں ہے۔'

'تمہارا دماغ خراب ہو گیا ہے۔ اس رات کو ہمارے پڑوسی کے گھر سے سارا سامان پاسدار اٹھا کر لے گئے، کچھ کر پائے وہ یا ہم پڑوسی؟ کل ہماری لڑکی کے ساتھ کچھ ہو گیا تو ہم کس کا دروازہ کھٹکھٹانے جائیں گے؟ کون کھولے گا ہمارے لئے اپنا دروازہ؟ کہاں اور کس سے مانگو گی انصاف جا کر؟ منصف

توخود چور سے کہتے ہیں چوری کرو، شاہ سے کہتے ہیں جاگتے رہو!' امجد آغا اپنے جذبات پر قابو پانا چاہ رہے تھے، مگر غصے سے کانپتے ہاتھوں پر بس نہیں رہ گیا تھا۔

'کم بولو امجد! دیواروں کے بھی کان ہوتے ہیں!' سہیلہ خانم نے گھبراتے ہوئے کہا۔

'ذرا سی بات پر ڈر بھی جاتی ہو!'

تبھی دروازے کی گھنٹی بجی۔

'مہرماہ آگئی۔' سہیلہ نے کہا۔

'آج بڑی دیر کر کے لوٹی؟' امجد نے کہا۔

'شاید بس خراب ہو گئی ہو گی یا پھر......!' کہتی ہوئی سہیلہ اٹھی۔

'آپ؟ آیئے، تشریف لایئے!' سہیلہ خانم نے کسی کا گرم جوشی سے استقبال کیا۔ امجد آغا کے کان کھڑے ہوئے۔

'کون ہے، سہیلہ جان؟'

'نادرہ خانم، مہرماہ کی جغرافیہ کی ٹیچر!'

'ابھی حاضر ہوا'۔ کھانا بیچ میں چھوڑ کر امجد آغا کچھ گھبرائے سے اٹھ گئے۔

'پریشانی کی کوئی بات نہیں، خانم! سب شام تک لوٹ آئیں گے—' نادرہ خانم کی آواز کانپ رہی تھی۔

'کیا ہوا؟' امجد آغا نے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے پوچھا۔

'پوچھ تاچھ کے لئے پاسدار لڑکیوں کو کمیٹی لے گئے ہیں!' سہیلہ خانم نے گھبراتے ہوئے لہجے میں کہا۔

'کیا—؟ غضب ہو گیا!' امجد آغا دھم سے صوفے پر بیٹھ گئے۔

'صبر سے کام لیں۔ لگ بھگ ہزار لڑکیاں ہیں۔ ساتھ میں کچھ ٹیچرز ہیں۔ سب لوٹ آئیں گی۔'
نادرہ خانم نے بدحواس لہجے میں کہا۔

'وہاں سے کون لوٹتا ہے، کون رہ جاتا ہے، ان کی مرضی پر منحصر ہے۔' امجد آغا نے سر پکڑ لیا۔

'میں چلتی ہوں۔' نادرہ خانم کھڑی ہو گئیں۔

'سہیلہ، ہم لٹ گئے، ہم رسوا ہو گئے— آہ!' امجد آغا نے سر صوفہ میں پٹکا۔

'آپ مرد ہیں، دل کڑا کریں، اگر آپ ہی ہمت کھو دیں گے تو سہیلہ خانم کا کیا ہو گا؟' نادرہ خانم نے دلاسہ دیا۔

'عورت اور مرد میں فرق ہوتا ہے۔ عورت پریشان ہو کر پریشانی مرد کو سونپ دیتی ہے۔ مرد تو مرد ہے، وہ اپنا دکھ تکلیف کس کے کندھوں پر ڈالے؟' اتنا کہہ کر امجد آغا کمرے میں بےچینی سے ٹہلنے لگے۔

رات سے صبح ہوئی، صبح سے رات، پھر دن سے ہفتہ گزر گیا مگر مہرماہ لوٹ کر نہیں آئی۔ کہاں، کس جیل خانے، کس کمیٹی میں قید ہے یہ بھی انہیں پتہ نہ چل پایا۔ کون کسے دلاسہ دیتا، دونوں کے دل جلے پھپھولوں سے بھرے ہوئے تھے۔

امجد اور سہیلہ کو روتے، جاگتے، پریشان ہوتے ہوئے زمانہ بیت گیا تھا۔ آنکھوں سے نیند کب کی روٹھ چکی تھی۔ رات ڈھل رہی تھی۔ دونوں کی کھلی آنکھوں کے سامنے مہرماہ کا چاند سا چہرہ گھوم رہا تھا۔

فون کی گھنٹی بجی۔

'خدا خیر کرے۔'، امجد آغا پلنگ پر اچھل کر بیٹھ گئے۔ فون کی گھنٹی کی ٹرن ٹرن کو وہ بدحواسی میں سنتے رہے، جیسے یقین کرنا چاہ رہے ہوں۔ آخر کچھ سوچ کر انہوں نے ہاتھ بڑھایا اور ریسور کان سے لگایا۔

'ہیلو!'

'ہیلو، یہ گھر امجد آغا کا ہے؟' ادھر سے کسی نسوانی آواز نے پوچھا۔

'ہاں، میں امجد بول رہا ہوں!'

'جی، آپ کے لئے مہر ماہ کا ایک پیغام ہے!'

'کہاں ہے مہر ماہ؟ میرے لخت جگر سے آپ کب ملی تھیں؟ کیسی ہے وہ......؟'

'آپ کچھ بتانے تو دیں!'

'معاف کیجئے گا، کیسی ہے میری بیٹی؟'

'ٹھیک ہے، اس نے کہلوایا ہے کہ اسے جلد ہی آزاد کرالیں!'

'مگر وہ ہے کہاں......؟'

'ایوین جیل میں!'

'آپ اس سے پھر......!'

فون دوسری طرف سے فوراً ہی رکھ دیا گیا۔ امجد آغا ریسور رکھ کر دونوں ہاتھوں میں منہ چھپا کر رونے لگے۔ سہیلہ خانم سجدے میں گر گئیں۔ 'اللہ تیرا شکر...... لاکھ لاکھ شکر، تو بڑا رحیم ہے۔ بیٹی کا پتہ تو چلا!'

مہینہ بھر گزر گیا، مگر مہر ماہ کا پتہ نہ لگ سکا۔ صبح سے دونوں کھانا پینا لے کر ایوین جیل کے سامنے جا کر بیٹھ جاتے تھے۔ اس کمیٹی سے اس کمیٹی، اس اسلامی عدالت سے اس اسلامی عدالت تک، ہر جگہ جا کر خاک چھان چکے تھے مگر مہر ماہ انہیں نہیں مل پائی تھی۔ دونوں کبھی سوتے تو خواب میں انہیں مہر ماہ زخمی حالت میں روتی کراہتی نظر آتی اور وہ خواب میں 'مہر ماہ—مہر ماہ' کہتے ہوئے جاگ جاتے تھے۔

اب روز اس امید میں ایوین جیل کے سامنے، سڑک کے اس پار آکر بیٹھ جاتے تھے کہ کبھی نہ کبھی کسی پتھر دل پاسدار کا دل پسیج ہی جائے گا۔ سہیلہ خانم ایک مہینہ میں گھل کر آدھی رہ گئی تھیں۔ سارے

دن ایوین جیل کے سامنے دوسرے ماں باپ، جو اسی انتظار میں ہوتے، ان سے بات چیت کر کے وقت کٹ جاتا تھا مگر رات؟ اکیلا گھر، خاموش دیواریں، جن میں مہرماہ کی یاد پیوست تھی۔

'سہیلہ تم پھر سے نماز پڑھنے لگو، دل کو سکون ملے گا۔' امجد آغا جو کبھی نماز نہیں پڑھتے تھے، جانماز تہہ کرتے ہوئے بولے۔

'اگر خدا دلوں کا حال جانتا ہے تو خود سب کچھ سمجھ جائے گا۔ وہ بڑا رحیم ہے۔ سب پر کرم کرنے والا ہے۔ جہاں اتنا ظلم ہو رہا ہو بے کسوں پر، وہاں خدا کا وجود کس کام کا؟ میرا یقین مذہب اور خدا سے اٹھ گیا ہے!'

'کفر مت بکو سہیلہ ......! خدا رحیم ہے۔ اس کی بارگاہ سے ناامید ہونا مومنوں کا کام نہیں ہے!'

'ساری زندگی عبادت کی تو اس کا صلہ یہ ملا، اب تم میری جگہ عابد بن گئے ہو، دیکھتی ہوں اس کا بدلہ کیا ملتا ہے!'

'تم ناامیدی میں ایسی بے تکی باتیں کر رہی ہو ورنہ ......'

'ناامیدی اگر خدا کے بندے میں آتی ہے تو اس کا ذمہ دار کون ہے؟ تین سال کا لمبا عرصہ گزر گیا، کیا ہماری نہیں کسی اور کی بیٹی قید خانہ میں ظلم سہہ رہی ہے؟ پھر بھی ہم خدا پر ایمان رکھیں؟ کون سا مذہب، کون سا اسلام؟'

'خدا کے غضب سے ڈرو سہیلہ!'

'میری معصوم بیٹی نے کیا کیا تھا؟ وہ تو خود ذہنی مرض کی شکار ہے، وسوسہ کے وہم نے تو یوں ہی اسے ادھ مرا کر رکھا تھا۔ جواب دو اس معصوم نے کیا گناہ کیا تھا؟'

'خدا انہی کا امتحان لیتا ہے جو اس کے قابل ہوتے ہیں۔ ہماری قوت برداشت کا وہ ......'

'بس امجد، بس کرو اپنی بھولی باتیں — میری قوت برداشت جواب دے رہی ہے۔ میرا دل مجھے بغاوت پر آمادہ کر رہا ہے۔ کسی گنہ گار کو یہ سزا ملتی تو میں سمجھتی کہ اس کے یہاں انصاف ہے مگر افسوس......'

'میں تو خدا کی رحمت پر یقین رکھتا ہوں ...... !اس سے بیٹی صحیح سالم لے کر رہوں گا!'

روز رات کو سونے سے پہلے تھکن سے چور بدن کے ساتھ ایسی ہی باتیں ہوتیں۔ جھنجلاہٹ اور تھکن کو آنسوؤں کی شکل میں بہاکر سہیلہ خانم خدا سے من ہی من مہرماہ کی سلامتی کی دعا مانگتی تھیں۔

ٹیلی فون کی گھنٹی بار بار بج کر رک جاتی تھی۔ سہیلہ خانم نیند میں ڈوبی پریشان پلنگ پر لیٹی تھیں۔ امجد آغا ریسیور بار بار اٹھا کر 'ہیلو ہیلو، کہتے تھے۔ تھک کر چور تھے، اوپر سے فون ٹھیک کام نہیں کر رہا تھا۔ صبح کے قریب فون کی گھنٹی پھر گھنگھنا اٹھی۔

'ہیلو' وحشت زدہ سے امجد آغا ریسور میں چیخے۔

'بابا......!'

'کون؟'

'بابا' میں مہر......!'

'مہرو...... میری جگر۔ میری نور نظر، میری خوشی تم......'

'بابا، مجھے اس جہنم سے نکال لو بابا، ورنہ میں۔ میں......'

'روؤ نہیں — بات کرو۔ کہاں ہو تم؟'

'مجھے نہیں پتہ بابا میں کہاں ہوں؟'

'کہاں سے فون کر رہی ہو بیٹی؟'

'آج رات ایک کمرے میں بند ہوئی تھی، وہیں پر یہ فون رکھا ہے!'

'اچھا، اس کا نمبر کیا ہے؟'

'بابا، ماماں کیسی ہیں؟'

'ٹھیک ہیں، لو ان سے بات کرو!'

'ہیلو، ماماں! مجھے یہاں سے آزاد کرالو، مجھے اپنے پاس بلالو۔ میں یہاں گھٹ کر مر جاؤں گی'۔

'ہاں......!'

سہیلہ خانم بے ہوش ہوگئیں، امجد آغا نے انہیں بستر پر لٹا کر فون اٹھایا، ، ہیلو مہر—فون کا نمبر بتانا......
ہیلو۔ ہیلو......'

ادھر سے کوئی جواب نہ ملا۔ فون کٹ گیا تھا۔ پانی لا کر سہیلہ خانم کے منہ پر چھینٹے مارے۔ ہوش میں آکر سہیلہ خانم نے دہاڑیں مار مار کر رونا شروع کر دیا تھا۔ گھر کی چھت لرز رہی تھی۔ امجد آغا گھبرا کر انہیں جھنجھوڑ رہے تھے۔

دروازے کی گھنٹی بج اٹھی: ٹرن ٹرن۔ امجد آغا چونک پڑے۔ اس وقت کون ہو سکتا ہے، کوئی پڑوسی؟

گھنٹی پھر بجی۔ وہ گھبرا کر باہر بھاگے۔ ادھر سہیلہ خانم اشتعال میں اپنا سر دیوار پر مارنے لگیں۔

'کہئے؟' سامنے پاسدار کو کھڑا دیکھ کر امجد آغا ڈر گئے۔

'شور کیسا ہے؟' پاسدار نے رائفل کندھے سے اتارتے ہوئے پوچھا۔

'میری بیوی کو شاید دورہ پڑا ہے!'

'تم نے تو کچھ نہیں کیا ہے؟ ہٹو دیکھنے دو!'

'دیکھئے، ہماری لڑکی جیل میں ہے۔ ابھی اس کا فون آیا تھا۔ اسی سے بات کر کے وہ اس حالت کو پہنچی ہے۔ مہربانی کر کے آپ ہماری پریشانی نہ بڑھائیں۔ وہ ابھی خاموش ہو جائے گی!'

'اوہ، تو یہ بات ہے؟ آپ کی لڑکی کا جرم کیا تھا؟ مجاہد تھی؟ فدائی تھی؟ بدکردار—؟'

'بس بس، وہ تو صرف ایک معصوم بچی تھی۔ گیہوں کے ساتھ گھن بھی پستا ہے۔ میری بیٹی بے گناہ تھی۔'

دُگھن، گیہوں کو کھوکھلا تو کرتا ہے، ایسا معصوم اور بے گناہ تو وہ بھی نہیں ہوتا کہ ان کے پسنے کا غم منایا جائے۔ بہر حال، اس مکان پر نظر رکھنی پڑے گی!' اتنا کہہ کر گردن ہلاتا ہوا پاسدار اپنے دوسرے ساتھی کے ساتھ سیڑھی اترتا ہوا فٹ پاتھ پر ہولیا۔

امجد آغا اسے پل بھر دیکھتے رہے۔ پھر اندر آکر بے ہوش سہیلہ پر پانی کے چھینٹے ڈالنے لگے۔ ماتھے سے خون بہہ رہا تھا۔ دانت پر دانت جمے تھے۔ دور دور نہ کوئی حامی تھا نہ مددگار۔ کسے بلائیں، کسے پکاریں؟ جو تھا وہ صرف شک اور پابندی تھی۔

چھ ماہ گزر گئے۔ جوان بیٹی کے جوان ماں باپ تیس پینتیس سال کی عمر میں ساٹھ پینسٹھ کے لگنے لگے تھے۔ پیسہ، طاقت جو بھی ان کے پاس تھا ان کے کسی کام نہ آیا۔ کسی نے بتایا، رشوت سے کام ہو سکتا ہے، مگر دیں کسے؟ رشوت پکڑے جانے کا بھی ڈر تھا۔ مہرماہ کا فون آئے ہوئے بھی تین ماہ گزر چلے تھے۔

اس کے الفاظ رات دن ان کے کانوں میں گونجتے رہتے تھے۔ کبھی کبھی ان کو دوسری باتیں سنائی ہی نہیں پڑتی تھیں۔ کانوں میں انہی لفظوں کی بھنبھناہٹ: 'بابا، مجھے اس جہنم سے نکال لو ورنہ میں گھٹ کر مر جاؤں گی!'

آہ! کیا کریں وہ؟ جان کوئی مانگتا تو وہ دینے کو تیار تھے مگر مانگنے والے تاجر کا پتہ بھی تو چلے؟

ایوین جیل جانے کی جگہ وہ اب کبھی کبھی راشن کی قطار میں بیٹھے آدھا کلو گوشت اور ایک کلو چاول کا انتظار کرتے تھے۔ پیٹ، دل، بھوک، محبت عجیب دکھ بھری ملاوٹ تھی ان کی تقدیر کی لکیروں میں۔

شام ڈھل رہی تھی۔ سہیلہ خانم خاموش گھر میں بیٹھی آنسو بہا رہی تھیں تبھی امجد آغا نے آکر بتایا—

'سہیلہ، کل ایک لڑکی جیل سے چھوٹ کر آئی ہے' زینت خانم بتا رہی تھیں!'

'پھر؟'

'چلتے ہیں، چل کر معلوم کرتے ہیں۔'

'روشن کی دادی کہہ رہی تھیں کہ وہی لوگ چھوڑے جارہے ہیں جو سرکار کے آدمی بن جاتے ہیں۔ پھر وہاں جانے سے کیا فائدہ؟'

'تو ہم کون سے سرکار کے دشمن ہیں؟'

'لڑکی کا پتہ چلے تو ہم......'

دونوں جب زینت خانم کے گھر پہنچے تو وہاں پر عورتوں کی کافی بھیڑ جمع تھی۔ زینت خانم آیت اللہ رحمانی کی بڑی قریبی جاننے والی تھیں۔ عورتیں اپنا دکھ درد ان سے کہنے جاتی تھیں۔ سہیلہ خانم کالی چادر سے بدن لپیٹے اندر کے کمرے میں ایک کونے میں جاکر بیٹھ گئیں۔ امجد آغا باہر دروازے پر رک گئے تھے۔

'کہو کیا تکلیف ہے بہن؟' پاس بیٹھی عورت نے سہیلہ خانم سے پوچھا۔

'لڑکی کا پتہ نہیں، بہن!'

'کیسے؟'

'اسکول سے کمیٹی لے جائی گئی تھی، پھر پتہ نہ چلا!'

'وہ پروین اعتصامی اسکول حادثہ؟'

'ہاں......ہاں......'

'ہاں، اس کی کافی لڑکیاں لوٹ آئی تھیں، کچھ اب آئی ہیں!'

'امید تو ہمیں بھی ہے، ویسے کافی لمبا عرصہ گزر گیا ہے!'

'اف! کیا عمر تھی بے چاری کی؟'

'مہر ماہ پندرہ کے اوپر ہو گی اب!'

'ارے...... شبانہ...... بیٹی تمہارے ساتھ وہ عجیب و غریب لڑکی کون تھی جس کی عادتوں کا ذکر تم کیا کرتی تھیں؟'

'کیوں، ماماں؟'

'ان کی بیٹی تھی شاید؟'

'کیسی تھی شکل اس کی؟' سہیلہ نے بے صبری سے پوچھا۔

'سفید رنگ، گال پر کالا تل تھا— آنکھیں اور بال اخروٹی رنگ کے تھے، گردن پر لہسن کا لال نشان تھا!'

'ہاں۔ ہاں، ایک دم میری مہرماہ— کیسی تھی وہ، بیمار تو نہیں تھی؟'

'پہلے ٹھیک تھی، پھر کھانا نہ کھانے کی وجہ سے بیمار رہنے لگی تھی۔ اس پر پاکی، ناپاکی کا بھوت سوار تھا۔ جیل میں وہ 'دیوانی' مشہور تھی۔ رات بھر روتی تھی!'

'آہ—!'

'آپ زینت خانم سے بات کریں۔ خدا نے چاہا تو لڑکی جلد ہی واپس مل جائے گی۔'

'کرتی ہوں باتیں ان سے۔' کہہ کر سہیلہ خانم، زینت خانم کے نزدیک جا کر بیٹھ گئیں جو ایک عورت کا درد دل سن رہی تھیں۔

'مگر زینت خانم اس میں میری کیا خطا؟ بارہ تیرہ سال کی لڑکیاں، ہمیشہ سے جاتی رہی ہیں۔' وہ عورت صفائی دیتے ہوئے بولی۔

'لڑکی مری کب؟' زینت خانم پھسپھائی۔

'ایک مہینہ ہو رہا ہے، غنچہ دہن تھی— یہ بات میں کیسے سمجھاؤں، یہ تو خود سمجھ جانے کی بات ہے۔ لڑکی کمسن بھی تھی اور کمزور بھی۔' عورت نے سخت لہجے میں کہا۔

'ہوا کیا تھا؟' بے چینی سے زینت خانم نے پوچھا۔

'ہونا کیا تھا! جو سب کے ساتھ ہوتا ہے وہی اس کے ساتھ ہوا۔ جرم سنگین تھا، مار پیٹ سے تو باغی لڑکیاں ڈرتی نہیں ہیں۔ یہی ایک خوف کارگر ہوتا ہے جس سے زیادہ تر لڑکیاں دہشت زدہ ہو کر گھٹنے ٹیک دیتی ہیں۔ انہی بے حیا لڑکیوں میں وہ بھی تھی۔ بلا کی ضدی..... کھانے کو ہاتھ لگانا تو گناہ سمجھتی تھی، ہر چیز گندی ناپاک تھی اس کی نظروں میں—اس رات سزا پانے والی لڑکیوں میں وہ بھی تھی۔ جس رات یہ سب ہوا اسی رات خون کا بہنا شروع ہوا، رکنے کا نام ہی نہیں لیا۔ غنچہ دہن تو تھی ہی، زور زبردستی میں دہن کے دونوں پٹ چر گئے......' وہ عورت کنکناتی سی بولی۔

'اوہ—عورت کا نصیب.....اس کا پروندہ ہے تمہارے پاس؟' زینت خانم نے ٹھنڈی سانس بھری۔

'یہ رہا!' اس عورت نے جیب سے کاغذ نکالا۔

'نام—مہرماہ، جرم—بغاوت، عمر—بارہ سال۔ اس کا مطلب ہے اب پندرہ کے اوپر ہو گئی تھی۔' زنیت خانم بڑبڑائی۔

'سب کی ایک ہی رٹ ہے کہ مجھے وہاں سے ہٹا کر دوسری جگہ بھیجا جائے۔ میں نہیں چاہتی ہوں زینت خانم—مہرماہ سچ مچ غنچہ دہن تھی، کمسن تھی—آگے سے میں یہ ناتجربہ کاری نہیں کروں گی لڑکی بھیجنے میں۔ پختہ لڑکیاں بھیجو تو جواب آتا ہے کہ 'چوزوں' کا گوشت زیادہ لذیذ ہوتا ہے۔ غلطی پوری کی پوری میری نہیں ہے!' وہ عورت ڈھیٹ لہجہ میں بولی۔

'مہرماہ مری کتنے دن بعد؟' زینت خانم نے کچھ سوچتے ہوئے پوچھا۔

'دو دن بعد!' جھٹ سے وہ عورت بولی۔

'دحاج آغا کو تم سے شکوہ کیا ہے؟' زینت نے بھنویں اونچی کر کے دیکھا۔

'لڑکی سے پوری لذت نہیں اٹھا پائے تھے کہ وہ مردہ کی طرح بے ہوش ہو کر اکڑ گئی تھی۔' نفرت سے بھیگے لہجہ میں وہ عورت بولی۔

'ٹھیک ہے۔ یہ پروندہ رکھو۔' کاغذ ان کے ہاتھ سے نیچے سہیلہ خانم کی گود میں گر گیا جو ان کی باتیں خاموشی سے سن رہی تھیں۔ تصویر پر نظر پڑی تو پاگل ہو اٹھیں۔ یہ انہی کی بیٹی مہرماہ کی بات ہو رہی

تھی— 'نہیں نہیں، ایسا نہیں ہو سکتا ہے۔'

'کیا بات ہے؟' وہ عورت تعجب سے بولی۔

'اس لڑکی کو وسوسہ تھا؟' سہیلہ خانم نے اسے جھنجھوڑا۔

'ہاں، ہاں، اسے شک کی بیماری تھی، مگر آپ کیسے جانتی ہیں؟' وہ عورت حیرت زدہ ہو کر سہیلہ کو گھورنے لگی۔

'یہ میری ہی بیٹی، مہرماہ ہے۔ خانم جان کی بددعاؤں کا پھل، پھوٹی قسمت کا تحفہ— آہ!' سہیلہ خانم غم سے نڈھال زخموں سے چور ہو کر بولیں۔

'ارے یہ تو بے ہوش ہو گئی!' وہ عورت سٹپٹائی سی چیخی۔

'پانی لاؤ۔' زینت خانم نے کہااور سہیلہ خانم کا سر سہلانے لگیں۔

'ان کے ساتھ پتہ نہیں کوئی ہے بھی یا نہیں؟' وہ عورت بولی۔

'پتہ نہیں، اکیلے ہی اندر آتی دِکھی تھیں۔' کسی نے کہا۔

'ہوش آگیا؟' زینت خانم نے دھیرے سے کہا۔

'کیسی طبیعت ہے؟' وہ عورت شرمندہ تھی۔

'ٹھیک ہوں!' اتنا کہہ کر سہیلہ خانم اٹھیں، پرونده ہاتھ میں مضبوطی سے دبا کر باہر نکلیں۔

'اسے کہاں لے جا رہی ہو؟' ایک دم سے وہی عورت چیخی۔ چہرے پر غصہ تھا۔

باہر امجد آغا کھڑے تھے، ان کے پاس لے جاکر سہیلہ خانم نے پرونده ان کے سامنے کھولا۔ 'کیا اسی لئے مجھے یہاں لائے تھے؟'

'یہ کیا ہے؟' امجد نے پوچھا۔

'تمہاری عبادت کا انعام، اور کیا؟' پاگلوں کی طرح بولیں سہیلہ۔

دروازے سے چادر میں لپٹی عورتیں جھانک رہی تھیں، جہاں پر سہیلہ خانم اور امجد کھڑے تھے۔

'یہ تو — یہ تو موت کا —' امجد کا خون نچوڑ گیا۔

'ہاں — تم نے وعدہ کیا تھا نا، مجھے میری لڑکی واپس دلاؤ گے! لاؤ میری لڑکی مجھے واپس دو۔' دونوں ہاتھوں سے سہیلہ خانم امجد آغا کو جھنجھوڑ رہی تھیں۔ عورتیں گھبرائیں، وحشت زدہ سی، دونوں کو دیکھ کر اصلی بات سمجھنے کی کوشش کر رہی تھیں۔

'مجھے میری لڑکی چاہئے، سن رہے ہو؟' سہیلہ چیخیں۔

'سہیلہ ہوش میں آؤ!' گھبراتے ہوئے امجد آغا بولے۔

'کہاں ہے تمہارا خدا، اسے پکارو' کہو کہ میری لڑکی واپس کرے!'

'سہیلہ اپنے کو سنبھالو!'

'تم ابھی تک کھڑے ہو — پکارو اپنے رحیم کو، وہ تو سب کا پالن ہار ہے......!'

'سہیلہ......!'

'پوچھو مذہب کے ٹھیکیداروں سے کیا نابالغ لڑکیاں غنچہ دہن نہیں ہوتی ہیں؟ ان کی اپنی لڑکیاں کیا ہوتی ہیں؟ مجھے جواب دو۔'

'کفر کی باتیں ہیں۔' کچھ آوازیں ابھریں۔ کچھ عورتوں کی آنکھیں بھر آئیں۔ سڑک پر پہرہ دیتے پاسدار شور اور چیخ و پکار کی آوازیں سن کر اندر آئے۔

'یہ آگئے مذہب کے پہرے دار! پوچھو ان سے کس دین و مذہب نے کہا ہے کہ کلی کی طرح نازک جسم والی لڑکیوں کو حلال کر دو اپنے ہوس کی چھری سے، پوچھو نا؟'

'بات کیا ہے؟' پاسدار نے پوچھا۔

پاسدار کو اشارے سے زینت خانم نے بلایا۔ انہوں نے اس کے کان میں کچھ کہا۔

'معاملہ گڑبڑ ہو سکتا ہے، پھر کیا کیا جائے؟' پاسدار سب کچھ سن کر بولا۔ زینت خانم نے پاسدار کے

کان میں پھر کچھ کہااور اندر فون کرنے خاموشی سے آہستہ آہستہ بڑھیں۔

'بولو، مجھے جواب دو۔' پوری طاقت سے سہیلہ خانم اپنا سر امجد آغا کے سینے پر مار رہی تھیں۔ امجد آغا سہیلہ خانم کو پکڑنے کی ناکام کوشش کر رہے تھے، مگر وہ بپھری ندی ہو رہی تھیں جوان کے قابو سے باہر تھیں۔

ہارن کی تیز آوازیں گونجیں۔ بوٹوں کی آواز سے گلی بھر گئی۔ زینت خانم کے احاطہ میں بندوق بردار پاسدار شہد کی مکھیوں کی طرح چھا گئے۔ انہیں دیکھ کر امجد آغا بری طرح دہشت زدہ ہو گئے۔ عورتوں کے دل ان کے کانوں میں دھڑکنے لگے۔ زینت خانم اور وہ عورت پیچھے کے دروازے سے نکل گئی تھیں۔

'مجھے میری بیٹی واپس کر دو۔' سہیلہ خانم نے روتے ہوئے کہا۔ اب ان پر دوسرا دورہ پڑا تھا۔

'کیا ہوا لڑکی کو؟' اس آدمی نے اکڑتے ہوئے مگر ذرا نرم لہجے میں پوچھا۔

'مر گئی۔' کسی نے کہا۔

'نہیں نہیں، اسے جان بوجھ کر مارا گیا ہے۔ وہ بے گناہ تھی۔' سہیلہ تڑپ کر بولی۔

'اگر بے گناہ تھی تو سمجھو جنت گئی، اگر گناہ کر کے اس نے سزا پائی ہے تو بھی سمجھو گناہ سے نجات پا کر جنت گئی۔ اس میں اتنا چیخنے چلانے، رونے کی کیا بات ہے؟' آدمی نے ہنس کر مذاقیہ انداز میں بھیڑ کو دیکھا۔

'تم کون ہوتے ہو اسے جنت بھیجنے والے ظالم؟' سہیلہ خانم اس کی طرف لپکیں۔

'زبان سنبھال کر خانم!' اس افسر نے ڈانٹا اور اشارہ کیا۔

'مانگو واپس میری لڑکی کو اپنے خدا سے؟ کیسا مذہب ہے، کیسا انصاف ہے؟' سہیلہ خانم زمین پر بیٹھ کر دھول خاک سر اور منہ پر ڈالنے لگیں۔ لمبے ناخنوں سے منہ نوچ لیا تھا، خراشوں سے خون چھلک رہا تھا۔ چھتوں اور کھڑکیوں سے لوگ جھانکنے لگے تھے۔ پاسداروں کی حالت دیکھتے بن رہی تھی۔ تبھی دروازے پر دوسری جیپ آ کر رکی۔

'کہاں ہے اس منافق کی ماں؟' دونوں طرف کمر میں لٹکتی پستول کے ساتھ کمیٹی کا انچارج داخل ہوا۔ بھیڑ نے راستہ دیا۔

'کیا دیکھ رہے ہو تم سب، دونوں کو پکڑو اور ختم کرو یہ تماشہ۔ ان موقع پرست مجاہدین نے ناک میں دم کر رکھا ہے۔ انہیں تو بہانہ ملنا چاہئے سرکار کو بدنام کرنے کا۔' کہہ کر اس نے اشارہ کیا۔ جھنڈ آگے بڑھا۔ کئی درجن ہاتھوں نے سہیلہ خانم اور امجد آغا کو پکڑ لیا جس طرح مچھوارا مچھلیوں کو پکڑتا ہے، وہی اکڑ لئے جال میں پھنسے ماں باپ کو جیپ میں ڈال کر وہ افسر چلا گیا۔ گلی میں پل بھر خاموشی چھائی رہی، جیسے ابھی ابھی میت دفنا کر لوگ اپنے اپنے گھروں کو لوٹے ہوں۔ پھر سب کچھ پہلے کی طرح چلنے لگا۔

اڑان کی شرط

'سچ مچ تم میرے بھائی ہو، تو اتنے دنوں سے تھے کہاں؟' فوزیہ نے اپنے سامنے کھڑے علی سے پوچھا جو چمکیلی آنکھوں سے اسے دیکھ رہا تھا۔

'ماماں کے ساتھ......' علی نے فوزیہ کے قریب جاکر اس کے سنہرے بالوں کی لٹ شرارت سے کھینچ کر جواب دیا اور پھر پوچھا، 'اگر تم میری بہن تھیں تو مجھ سے دور کیوں رہیں؟'

'یہاں اپنے بابا کے پاس جو تھی۔' فوزیہ علی کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر اسے کھینچتی ہوئی بکھرے کھلونوں کی طرف لے گئی۔

'تو ہمارے ساتھ کیوں نہیں رہتی تھیں؟' علی نے پوچھا۔

'بابا کہہ رہے تھے کہ اب ہم سب ساتھ رہیں گے۔' فوزیہ نے گردن ہلائی۔

دونوں بچوں کو یوں گھل مل کر کھیلتا دیکھ کر طالب کے چہرے پر اطمینان کی لہر دوڑ گئی۔ اس نے مسکراکر مہشی کی طرف دیکھا۔ مگر اس کے چہرے پر خوشی کی جگہ تناؤ دیکھ کر وہ چونک پڑا۔ خود کو نارمل کر کے اس نے مہشی سے کہا، 'مجھے سوچتی عورتیں بہت خوبصورت لگتی ہیں، مگر تیوری پر پڑے بل کے ساتھ نہیں۔' طالب کو جھٹکا لگا کہ جس جملے سے مہشی کی آنکھیں سدا خوشی سے چمک اٹھتی تھیں، آج وہاں طالب کے لئے شکوہ بھری اداسی تھی۔

'کیا بات ہے؟' یکا یک طالب اپنی جگہ سے اٹھ کر مہشی کے پاس بیٹھ گیا۔

'کچھ نہیں......' پھیکی ہنسی ہنس پڑی مہشی اور سگریٹ کے لمبے لمبے کش لیتی رہی۔ اس کی اس خاموشی سے طالب بھی سست پڑ گیا۔

چند لمحے گزر گئے جو طالب پر صدیوں جیسے بھاری پڑے۔ مہشی نے اپنے ناخنوں کے پاس کی نازک کھال کو نوچنا شروع کر دیا، جسے دیکھ کر طالب بےچین ہو اٹھا۔ خود مہشی نے اسے بتایا تھا کہ جب وہ بہت پریشان اور دکھی ہوتی ہے تو انجانے میں ناخنوں کے آس پاس کی جگہ زخمی کر لیتی ہیں۔

'یہی میرا گھر، یہی میری زندگی، سیدھی سپاٹ، مگر میری یہ کتابیں، ٹائپ رائٹر طوفانوں سے بھرے ہوئے ہیں۔ انہیں جیسے سنبھالنا اور سنوارنا چاہو تمہاری مرضی۔ اب یہ زندگی ہماری اپنی ہے۔'

'ہوں...... ' لمبی سانس کھینچ کر مہشی نے دوسری سگریٹ ہونٹوں سے لگائی اور اداس آنکھوں سے کمرے کا جائزہ لیا۔

'میں چلتا ہوں، کچھ ضرورت کا سامان بازار سے لے آؤں۔ تمہیں کچھ خاص چاہئے ہو تو بتاؤ؟' کہتا ہوا طالب اٹھا اور جواب نہ پا کر باہر نکل گیا۔

'کتنی الگ ہے اس گھر کی سجاوٹ!' مہشی نے دل ہی دل میں سوچا اور صوفے سے اٹھ کر طالب کی میز کے پاس جا کر کھڑی ہو گئی۔ ایسی کتابوں سے بھری الماری، کاغذوں سے بھری میز کا خواب اس نے بچپن سے دیکھا تھا۔ اسے اپنے محبوب کی شکل بھی بکھرے بالوں اور لاپرواچہرے والے شاعر کی نظر آتی تھی۔ طالب میں ساری خوبیاں تھیں، مگر اس کا چہرہ لاپروا اور الجھے بالوں والا نہیں تھا، بلکہ سلیقے سے بال سنورے رہتے۔ اس کے چہرے پر ایک ایسی چمک تھی جو صاف بتاتی تھی کہ اس سے کچھ بھی چھپا نہیں ہے۔

مہشی کو یاد آیا، جب بابا نے طالب کو دیکھا تھا تو بہت متاثر ہوئے تھے اور باتیں کر کے بے حد خوش، مگر ماں نے ڈری آواز میں کہا تھا کہ یہ شیعہ ہے ضرور، مگر ہے تو عرب، ناتے رشتے دار کیا کہیں گے؟ اسی کے ساتھ بھائی فرید کی آنکھوں میں نفرت ابھری تھی۔ طالب کے جانے کے بعد اس نے بے حد کڑوے لہجے سے تھوڑی اونچی آواز سے کہا تھا کہ یہ صرف عرب نہیں ہے جس نے ہمارے آتش کدے ٹھنڈے کئے تھے، بلکہ یہ کمیونسٹ بھی ہے جن کی نظر ہمارے ملک پر گڑی ہوئی ہے۔

یہ سن کر ماں کے چہرے پر پیلا پن چھا گیا تھا۔ ابھی بھی انہوں نے نیچے تہہ خانے میں شاہ کی تصویر

چھپا کر رکھی ہوئی تھی۔ ان کا خاندان دو پشتوں سے درباری بنا ہوا تھا، جس کا سب سے بڑا دشمن اس کا ملحد پڑوسی ملک تھا، جس نے ان مذہبی حکمرانوں کا ساتھ دیا تھا۔ طالب کے جانے کے بعد گھر میں تناو تھا۔ تناو کی کئی پرتیں تھیں۔ اس میں مہشی کے سسرال والے، اس کے مرے شوہر کی کروڑوں کی جائیداد اور اس کا بیٹا علی تھے۔ مہشی سب کچھ طالب کے نام پر چھوڑنے کے لئے تیار تھی۔ سوا بیٹے کے۔ مگر ماں باپ کچھ دور کی بات سوچ رہے تھے۔ وہ نہیں چاہتے تھے کہ مہشی کروڑوں کی جائیداد ایک عرب کمیونسٹ کے لئے چھوڑے اور اس شادی کے سبب ان کی بیٹی پرائے ملک جا کر بسے۔ بہر حال تناتنی کے باوجود بڑی خاموشی سے مہشی اور طالب کا نکاح ہو گیا، کیونکہ گھر والے مہشی کی خواہش کی پوری طرح مخالفت بھی نہیں کرنا چاہتے تھے۔ گھر کی اس تلخ ٹکراہٹ کی تھوڑی بہت بھنک طالب کے کان تک پہنچی تھی اور باقی چیزیں اس نے خود سمجھ لی تھیں کہ اس رسم ورواج سے بندھے سماج میں اس کو کھل کر قبول کرنا کتنا مشکل کام تھا۔

طالب کو مہشی کا ڈرا سہما، بولنے کا ملائم انداز بہت اچھا لگا تھا۔ خاص کر اس کی سوچ میں ڈوبی آنکھیں جس میں ہلکی سی اداسی بھی شامل تھی۔ اب شادی کے بعد طالب بڑے ارمان سے مہشی کو اپنے ملک شام لایا تھا۔ جب دو نسلیں، دو مختلف زبانیں محبت کے پل پر کھڑے ہو کر تاریخی منافرت اور مقابلہ آرائی سب کچھ بالائے طاق رکھ دیں اس وقت اس کا رنگ کچھ اور ہوتا ہے۔ اس لئے طالب نے بڑے کھلے دل سے مہشی سے کہا تھا کہ وہ شام میں نہ رہنا چاہے تو اس کو دنیا کے کسی بھی ملک میں بسنے کی آزادی ہے — پولینڈ، سوویت یونین اور...... مگر مہشی تو یہاں آکر پہلے دن ہی بجھ گئی تھی۔ اس کو دیکھ کر طالب کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ آخر مہشی کو ایسی کیا بات اداس بنائے ہوئے ہے؟ پہلی زندگی کی یاد؟ شوہر کے گھر والوں سے خوف؟ علی کو کچھ ہو جانے کا خدشہ؟ آخر ایسا نیا کیا ہوا ہے جو وہ اس طرح تناو سے بھری ہے؟

مہشی کی خوشی آسمان سے ٹپکی بوند کی طرح مختصر تھی۔ اس کے سکھ کو خوف نے جذب کر لیا تھا۔ یہاں شام میں بھی اسے محسوس ہوتا جیسے کوئی اسے دیکھ رہا ہے۔ اس کی سرگرمی کی خبر رکھتا ہے اور سب باتوں کی اطلاع اس کے سسرال پہنچ جائے گی۔ وہ بجتی تو بیچ میں ٹھہر جاتی، وہ تو بیوہ ہے، پھر یہ پیروں کو خوبصورت، چکنا کس لئے بنا رہی ہے؟ ہاتھ میں پکڑی ریل اور دانتوں میں پکڑا دھاگہ ڈھیلا

پڑ جاتا اور ٹانگ پر جھکا اس کا سر سیدھا ہو جاتا......

'طالب...... ہاں، طالب کے لئے مجھے بجنا ہے، آخر وہ میرا شوہر ہے ...... 'مہشی جواز دیتی اور آئینہ اٹھا کر اس میں اپنی بھویں دیکھتی۔ آنکھوں اور پلکوں کو سنوارنے کی کوشش کرتی، مگر بیکار...... اس خوف کے درمیان فوزیہ کا وجود ایک نئی کڑواہٹ کے ساتھ اسے طالب سے دور لے جاتا۔ فوزیہ کی ماں کی کوئی تصویر اس گھر میں نہیں تھی، مگر مہشی کو لگتا، ایک اور عورت اس گھر میں مسلسل اس کے ساتھ سانس لے رہی ہے، اسے تحقیر آمیز نظروں سے گھور رہی ہے۔

مہشی کا دل چاہا تھا کہ وہ فوزیہ کی ماں کے بارے میں طالب سے پوچھے کہ وہ کہاں ہے، اسے طلاق دیئے کتنا عرصہ گزر گیا، مگر پھر مہشی کی غیرت نے اسے اجازت نہیں دی۔ جب طالب نے اپنی زندگی کے اس باب کو اس سے چھپا کر رکھا ہے تو پوچھنے پر کیا وہ سچ بتائے گا؟ مہشی اپنے غم کے بنائے جالے میں پھنس جاتی۔

دکھ میں ڈوبی مہشی ایک مہینہ دمشق میں رہی، مگر اس شوہر سے اپنا کوئی رشتہ نہ بنا سکی، نہ اس گھر کو جی سکی۔

فوزیہ، علی اور طالب چھوٹے سے باغیچے میں کھیل میں مست تھے۔ اس وقت یکایک مہشی نے کمرے سے نکلتے ہوئے کہا، 'میں واپس جانا چاہتی ہوں۔'

'کیا؟' طالب کو جھٹکا لگا۔

'ہاں، فرید کا فون تھا۔ لڑائی شروع ہو گئی ہے اور ماں بابا میرے لئے بہت فکر مند ہیں۔' بےچین سی مہشی کہہ اٹھی۔

'جنگ تو ہر جگہ چھڑی ہے میری جان، اتنا گھبرا کیوں رہی ہو؟ چلیں گے آرام سے۔ ابھی تم نے شام دیکھا کہاں ہے اور اس پر لکھا کیا ہے؟' طالب نے بڑے آرام سے کہتے ہوئے مہشی کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔

'پھر کبھی، ابھی مجھے واپس جانا ہے۔' مہشی کا لہجہ جذبات سے خالی تھا۔

'اچھا!' طالب اتنا کہہ کر بچوں کے لئے کچھ کھانے کا سامان فریج سے نکالنے لگا۔

'میرے بابا آئس کریم بہت اچھی بناتے ہیں۔' فوزیہ کمرے میں داخل ہوتی ہوئی بولی۔

'اور میری ماماں، جیلی۔' علی نے کہا اور فوزیہ کے بال کھینچے۔

'یہ میرے اور میری کیا ہے؟ ہم تم دونوں کے بابا اور ماماں ہیں۔' طالب نے سمجھاتے ہوئے کہا اور بچوں کو کھانے میں مصروف دیکھ کر دوسرے کمرے میں جاکر کچھ کاغذات الٹنے پلٹنے لگا۔

'بابا......!' فوزیہ چہکی۔

طالب نے سوالیہ نظریں اٹھائیں اور دوڑ کر آتی بیٹی کو گود میں اٹھا کر پیار کرنے لگا۔ تبھی علی آکر اس کے پیروں سے لپٹ کر کھڑا ہو گیا۔

'اب بابا کی جان کی باری ہے۔' کہہ کر طالب نے فوزیہ کو گود سے اتارا اور علی کو سینے سے لگایا۔ گالوں پر پیار کر اسے اپنے ٹائپ رائٹر کے پاس میز پر بٹھا کر اپنا کام شروع کیا۔ اسی درمیان مہشی بھی ہاتھ میں کاغذ قلم اٹھائے کمرے میں داخل ہوئی اور کونے کے صوفے پر بیٹھ گئی۔

'ماماں......!' فوزیہ نے باغیچے سے لال پھولوں کا گچھا لاکر مہشی کو دیا۔

'ادھر رکھ دو۔' مہشی کا سپاٹ لہجہ کمرے کی گرمی کو چیر گیا۔ چونک کر طالب نے پہلے مہشی اور پھر بیٹی کے چہرے کی طرف دیکھا اور خاموشی سے سر جھکا کر ٹائپ کرنے لگا۔

فوزیہ نے غمزدہ ہو کر پہلے مہشی کو تاکا، پھر طالب کو۔ باپ کو مصروف دیکھ کر اس نے میز پر پھول رکھے اور طالب کی کرسی کے پیچھے جاکر کھڑی ہو گئی اور وہاں سے وہ ڈری سہمی نظروں سے مہشی کو دیکھنے لگی۔ اس کی آنکھوں میں پانی تیرنے لگا تھا۔

سال بھر پہلے طالب ایک سمینار کے سلسلے میں ایران گیا تھا۔ کئی دوسرے ملکوں سے بھی لوگ آئے تھے۔ وہیں پر اس کی ملاقات مہشی سے ہوئی تھی۔ سب نے اپنی اپنی تخلیقات اپنی اپنی زبان میں سنائی

تھی۔ اسی میں طالب نے اپنی نظمیں اور مہشی نے ایک مضمون پڑھا تھا۔ تین دن تک مسلسل ہوتی ملاقاتوں میں طالب اور مہشی کے درمیان کچھ ایسا ہوا کہ طالب دوبارہ ایران جانے پر مجبور ہو گیا۔

اس ملاقات میں مہشی نے اپنی زندگی اس کے سامنے کھول کر رکھ دی۔ اس کی شادی چھ برس پہلے ایک امیر گھرانے میں ہوئی تھی۔ چونکہ شادی لڑکے کی پسند سے ہوئی تھی، اس لئے حمید کے ماں باپ نے اس کو کبھی وہ پیار نہیں دیا اور نہ وہ عزت جو بہو کا حق تھی۔ انہیں مہشی نچلے و پسماندہ طبقے کی ایک ایسی لڑکی لگی تھی جو اپنی غریبی سے گھبرائی ہمیشہ امیر گھر کے لڑکوں پر نظر رکھتی ہے۔ حمید کو پتہ تھا۔ اس لئے جب کار حادثہ میں موت اس کے قریب پہنچ گئی تو اس نے اپنی ساری جائیداد بیٹے کے نام لکھ کر مہشی کو اس کا وارث بنا دیا۔ ماں نے مرتے بیٹے کی بات رکھی، مگر ایک شرط لگا دی کہ اگر مہشی دوسری شادی کرتی ہے تو پھر لڑکا اور جائیداد دادا دادی کو ملیں گے۔ حمید کو موت لے گئی اور مہشی ایک سال کے علی کے ساتھ اس گھر میں چالیس دن تک کانٹوں کے بستر پر سوئی۔

پانچ سال اس نے اپنے مائیکے میں گزارے۔ ماں باپ، بھائی بہن، سبھی علی اور مہشی کا دل ہاتھوں پر رکھتے اور اس محبت کے بدلے میں مہشی ان سب کی ضرورتیں اور خواہشیں پوری کرتی تھی، مگر طالب نے یکایک آکر اس کی پرسکون زندگی میں ہلچل مچا دی۔ شادی کے بعد مہشی نے یہ ارادہ ظاہر کیا تھا کہ وہ تین ماہ شام میں رہ کر ایران لوٹے گی اور کچھ ضروری کارروائی کے بعد لمبے عرصے کے لئے وہ ایران چھوڑ دے گی۔ اس کی رگیں بھی سسرال والوں کے خوف اور ملک میں پھیلتی قدامت پسند دہشت سے پھٹنے کی حد تک تن چکی تھیں۔ کہیں پر یہ ضد بھی تھی کہ وہ نہ شوہر کی جائیداد سے اپنا حق کھوئے گی اور نہ دوسری شادی کے سکھ کو دکھ میں بدلے گی۔

ہوائی جہاز سے گھر کا راستہ مہشی کے لے خوشیوں سے بھرا تھا۔ آنکھوں کی اداسی غائب تھی۔ وہاں رنگ بکھرے تھے۔ چہرہ خوشی سے دمک رہا تھا۔ گھر کا تالا کھول کر جب تینوں اندر داخل ہوئے تھے تو چھوٹا سا گھر مہشی کو بہت پیارا لگا تھا۔ شام کو بھائی کے گھر جا کر جب وہ لوٹے تو مہشی بالکل بدل چکی تھی۔ طالب کی ماں نے مہشی کا جس طرح استقبال کیا تھا، اس میں سچ ہی سچ تھا۔ طالب نے چہک کر کہا تھا، 'دیکھو، میں نے کہا تھا نہ تمہارے لئے ایک فرشتہ لے آؤں گا، مگر تمہاری پریوں سے شادی

نہیں کروں گا ... لے آیانا؟' طالب کی بات سن کر ماں کا چہرہ کھل اٹھا تھا۔

لوٹتے ہوئے فوزیہ ان کے ساتھ تھی جو بار بار مہشی کے چہرے کو دیکھ رہی تھی۔ اس کی معصوم آنکھوں میں ایک عجیب ساخواب تیر رہا تھا۔ مہشی نے چار سال کی اس کی بیٹی کو پیار ضرور کیا، اس کی طرف دیکھا بھی، مگر وہ گرمی وہاں نہیں تھی جس کا طالب اور فوزیہ کو انتظار تھا۔ طالب کو تھوڑا اٹپٹا لگا تھا کہ یہ تناکسا برتاو کیوں؟ مگر اس کی سمجھ میں کوئی سبب نہیں آیا اور نہ ٹوکنے کے لئے ایسا کچھ تھا جس کا ذکر وہ مہشی سے کرپاتا۔

جب جب اس نے اپنی زندگی کے بارے میں مہشی کو بتانا چاہا، موقع ہاتھ نہیں آیا۔ جب ایک شام مہشی نے جذباتی ہو کر کہا تھا کہ میں تمہارے بچے کی ماں کبھی نہیں بن پاؤں گی، کیسی مجبوری ہے میری...... ایک بیٹی کی ماں بننے کی بڑی خواہش تھی مگر...... طالب نے اسے دلاسہ دیتے ہوئے دل ہی دل میں طے کیا تھا کہ وہ مہشی سے اب کچھ نہیں کہے گا اور بیٹی کا انمول تحفہ وہ سیدھا شام پہنچ کر دے گا۔

مہشی فوزیہ کو ایران لے جانے پر کسی طرح راضی نہیں ہوئی۔ خود اکیلی جانے کی ضد کی، مگر طالب اس بات پر راضی نہیں ہوا۔

'پھر ہم الگ الگ فلائٹ سے جائیں گے۔' مہشی نے فیصلہ سنایا۔

'مگر کیوں؟ گھر میں سب کو پتہ ہے، پھر؟' طالب نے تعجب سے پوچھا۔

'وہ تو ہے، مگر اتفاق سے، کسی رشتے دار کی نظر پڑ گئی تو؟'

'ٹھیک ہے۔' طالب نے اتنا کہہ کر مہشی کی واپسی کی تیاری کرنی شروع کر دی۔ بیٹی کو دادی کے پاس جب چھوڑا تو اس کا رونا دیکھا نہیں جارہا تھا اور علی بار بار مہشی سے کہہ رہا تھا کہ اس کی بہن آخر اس کے ساتھ کیوں نہیں جارہی ہے؟ طالب سوچ رہا تھا کہ کیا زندگی اتنی سوجھ بوجھ سے جینے میں جذبات سے خالی نہیں ہو جاتی ہے؟ بھلے ہی وہ میرے بچے کی ماں نہ بنے مگر......؟ مہشی علی کے

ساتھ چلی گئی، پیچھے ڈھیروں سوال چھوڑ کر کہ اس کا ماضی اس کے لئے اہم ہے یا حال کا یہ سچ؟

تہران پہنچ کر علی سخت بیمار پڑ گیا۔ بخار کی تیزی میں وہ بار بار فوزیہ کا نام لے رہا تھا۔

ماں کے پوچھنے پر مہشی کو بتانا پڑا کہ فوزیہ طالب کی بیٹی ہے، جس کا ذکر طالب نے پہلے نہیں کیا تھا۔

'دیکھتی جاؤ، یہ عرب اور کیا کیا گل کھلاتا ہے!' فرید نے تلخی سے کہا۔

رات کو جب طالب شام سے ایران پہنچا تو اس نے مہشی کے سلوک میں وہی ٹھنڈک پائی۔ اپنا بستر مہشی کے بھائی فرید کے کمرے میں دیکھ کر تو وہ تعجب میں پڑ گیا اور مہشی سے بولا، 'جس وقت میری ضرورت سب سے زیادہ علی کو ہے تو تم اسے مجھ سے الگ کر رہی ہو؟'

'ماماں کو ڈر لگ رہا ہے۔' خوفزدہ سی مہشی بولی۔

'کیوں؟' طالب چونکا۔

'پورا ملک عرب مخالف ہو رہا ہے، جگہ جگہ جنگ مخالف جلوس نکل رہے ہیں۔ ایسی حالت میں وہ آپ کی حفاظت کے لئے پریشان ہیں۔'

'کمال ہے۔' طالب ہنس پڑا۔

'آپ جتنی جلدی ہو، لوٹ جائیں۔'

'تم اپنا سارا کام تو ختم کر لو۔'

'میں کرتی رہوں گی۔'

'مطلب؟'

'میں ابھی آپ کے ساتھ نہ لوٹ سکوں گی۔ مجھ سے زیادہ سوال نہ کریں۔ میں مجبور اور پریشان ہوں۔' مہشی نے روتے ہوئے کہا۔

'اچھا، اچھا تم پریشان نہ ہو...... ڈاکٹر نے کہا ہے کہ علی صبح تک ٹھیک ہو جائے گا۔ میں کمرے کے باہر بیٹھا ہوں۔ ضرورت پڑے تو بلا لینا۔' کہتا ہوا طالب باہر آ کر ڈرائنگ روم میں بیٹھ گیا اور یوں ہی ایک کتاب کے صفحے الٹنے لگا۔

کافی دیر ہو گئی ہے۔ روشنی دیکھ کر پاسدار کہیں دروازہ نہ کھٹکھٹا دے!' فرید نے تھوڑی دیر بعد آ کر کہا۔

'ٹھیک ہے، میں بتی بجھا دیتا ہوں۔' کہہ کر طالب اندھیرے میں بیٹھ گیا۔

رات گزر رہی تھی۔ طالب کو یاد آ رہا تھا، جب ڈر کے مارے مہشی نے اس سے کہا تھا کہ نکاح نامے میں اس کا نام 'زلیخا' لکھوایا جائے، شادی نام بدل کر ہو جس سے اگر سسرال والوں کو کبھی بھنک بھی ملتی ہے تو اس کا ثبوت ان کے ہاتھ نہیں پڑنا چاہئے۔ اس بات پر طالب راضی ہو گیا، آخر نام میں کیا رکھا ہے؟

علی کو ایک مرد کی محبت چاہئے تھی، جو باپ جیسا پیار دے۔ اس لئے گھر آئے ہر مرد سے وہ دوستی کر لیتا تھا۔ اس کے جانے کے بعد بری طرح روتا تھا۔ طالب پہلا مرد تھا، جس نے جی بھر کر پیار کیا، اس کے ساتھ ساتھ رہا اور اسے باہر کی دنیا دکھائی، ورنہ نانا اور ماموں کے علاوہ تیسرے کسی کے پاس اسے نہ نکلنے دیا جاتا، نہ باہر بچوں کے ساتھ کھیلنے دیا جاتا۔ ایک مہینہ فوزیہ کے ساتھ گزار کر اسے بھول نہیں پا رہا ہے۔ گھر میں آتے ہی وہی پرانی روک ٹوک اور حفاظت کا بندھن اسے شام کے کھلے ماحول کی یاد دلاتا، جہاں روز فوزیہ کے ساتھ وہ بڑے پارک میں دوسرے بچوں کے ساتھ شام کو کھیلتا تھا۔ طالب کے کندھوں پر اچکتا تھا۔

جنگ خطرناک شکل پکڑتی جا رہی تھی۔ جنازوں کی جھڑی لگ گئی تھی۔ قبریں قطاروں میں کھد گئی تھیں۔ مہشی کا دل اچٹا اچٹا رہتا۔ ایک دن طالب نے کمرے میں اسے اکیلا پا کر بانہوں میں بھرنا چاہا تو وہ دور چھٹک گئی تھی۔

'نہیں، میرا دل بالکل نہیں ہے۔' اس کے چہرے پر یہ کیفیت پڑھ کر طالب کمرے سے نکل آیا اور جانے کس موڈ میں لوٹنے کی تیاری کرنے لگا۔ علی کو اس سے دور رکھا جاتا، مہشی سے مل نہیں پاتا،

گھر سے باہر نکل نہیں پاتا، آخر وہ یہاں کس لئے رُکا ہے؟ وہاں فوزیہ اکیلی ہے۔

ہوائی اڈے پر پہنچ کر فرید نے طالب سے کہا کہ وہ مہشی کو بھول جائے۔ اب اس کا دل نہ شام جانے کا ہے اور نہ ہی اس شادی کو بنائے رکھنے کا ہے۔ ہر انسان کی مجبوری ہوتی ہے۔ ہر سماج، ہر ملک کا اپنا مزاج ہوتا ہے۔ اس کو بدلا نہیں جاسکتا۔

'مگر مہشی نے تو ایسا کچھ نہیں کہا؟' طالب نے چڑھ کر کہا۔

'کیسے کہتی؟ آپ نے اس کے سوچنے سمجھنے کی ساری طاقت ختم کر دی ہے۔' فرید نے تلخ جواب دیا۔

'میں شام سے اسے خط لکھوں گا۔ ہماری باتیں ہیں، ہم ہی حل کرنا پسند کریں گے۔' طالب نے فرید کے بڑھتے حوصلے پست کر دیئے۔

خط، ملاقات، فون سب کچھ خواب سا بن گیا۔ جنگ نے عام زندگی کی دھار تہس نہس کر دی۔ طالب کے خط مہشی کو نہیں ملے اور مہشی کے خط طالب کو۔ ایک لمبا خاموش زمانہ دونوں کے درمیان پھیلتا چلا گیا۔ سیاست کا زہر خون کی گرمی کو سرد کرنے لگا۔ اس کی جگہ ایک کڑوا ابال دماغوں میں کھولنے لگا جس نے انسانوں کے احساس کو سلا کر رکھ دیا۔

طالب کی شادی رابعہ سے چھ سال پہلے ہوئی تھی۔ رابعہ اس کی چچازاد بہن تھی۔ بچپن سے وہ ایک دوسرے کی عادتوں سے واقف تھے، اس لئے گرہستی سکھ چین کی تھی۔ مگر قسمت کو کیا کہیے۔ فوزیہ کی پیدائش میں وہ موت کے آغوش میں چلی گئی۔ پورے چار سال طالب نے بیٹی کو بڑا کرنے میں لگا دیئے۔ اسی کے ساتھ اس کا لکھنا پڑھنا بھی چلتا رہا۔ دو کام ایک ساتھ کرنا بہت مشکل تھا، مگر اس نے اس کام کو بخوبی اس لئے نبھایا کہ وہ جدائی کا غم جینا چاہتا تھا۔ اس لئے رابعہ کی یادیں کچھ اس طرح سے چار سال کے غمگین پیمانے میں جمع ہوئیں جیسے کوئی اچھی نظم ہزار درد کے دریچوں سے نکل کر شعروں میں ڈھلتی ہے۔

مہشی کو دیکھ کر ایک نئی نظم اس کے خالی ذہن میں کلبلانے لگی تھی، جس کا ردیف قافیہ بالکل آزاد

'بحر' جیسا تھا، پرانی بندش سے جداگانہ۔ ایسا نہیں تھا کہ وہ رابعہ کو بھول گیا تھا، مگر اس کی یادیں ماضی تھیں اور مہشی حال تھی۔ اب حال بھی جس طرح اس کے لئے ماضی بن رہا تھا، اس سے طالب پریشان تھا۔ کام کچھ اس طرح پھیل چکا تھا کہ وہ ایران نہ جاسکا اور شاید جانا بھی نہیں چاہتا تھا۔ حقیقت میں اسے مہشی کے پیغام کا انتظار تھا۔

عرصے بعد جب طالب مہشی کو تقریباً بھولنے میں کامیاب ہو گیا، تب مہشی کا ایک خط اسے ملا کہ وہ شام آنا چاہتی ہے۔ اس جہنم میں اس کا جینا مشکل ہے۔ طالب نے کئی بار خط پڑھا۔ ہر بار وہ سوچتا کہ آخر اس خط کا کیا جواب دے؟ کتنی مشکل سے فوزیہ کو سنبھالا ہے جو علی کے اس طرح جانے کا جواز نہیں سمجھ سکتی تھی۔ پھر وہی کچھ دہرانا، خاص کر تب جب مہشی کے گھرانے میں نہ صرف عرب، بلکہ اشتراکیت پسند نظریہ سے نفرت کی جڑیں بہت گہری ہوں، وہاں یہ رشتہ کب تک چلے گا؟ ایسے خاندان سے جن کا سارا سروکار سامراج واد کے اردگرد بُنا ہوا ہو، وہاں پر خود وہ کتنے دن ٹھہر پائے گا؟

ہفتہ بھر بعد مہشی کا دوسرا خط آپہنچا کہ وہ اس کا شوہر ہے، اس کی مدد کرنا اس کا فرض ہے۔ طالب اس خط کو پڑھ کر ہنسا۔ فرض نبھانا صرف اسی کا کام رہ گیا ہے؟ سال بھر پہلے شادی کی اطلاع سماجی طور پر دے بھی نہیں پایا تھا کہ مہشی نے واپس جانے کے لئے سامان باندھ لیا تھا اور اب دوبارہ وہ کس منہ سے اپنے اس گھر کا دروازہ کھولے؟ ماں کو پھر سمجھانا پڑے گا۔ پارٹی میں بھی اس کو لے کر کئی طرح کی باتیں اٹھی تھیں۔ تب وہ کوئی اطمینان بخش جواب نہیں دے پایا تھا۔ اب دوبارہ مہشی کے آنے کا مطلب ہے کہ وہ اس شادی کے بارے میں بتائے جو نہ ٹوٹی تھی، نہ جڑی تھی۔ بہت سے الزام بھی اس پر سوالیہ نشان کی طرح درج ہو سکتے ہیں جو اسے منظور نہیں ہوں گے۔

تیسرا خط ملنے پر اسے کھولنے سے پہلے فیصلہ لے لیا کہ وہ مہشی کو ایک موقع دے سکتا ہے مگر جب خط کھولا تو وہ فرید کا تھا— شکوہ شکایتوں سے بھرا ہوا۔ طالب خون کا گھونٹ پی کر رہ گیا۔ چونکہ وہ فیصلہ کر چکا تھا، اس لئے اس نے دعوت نامہ مہشی کو بھیجا۔ بیٹی کو بہن کے گھر چھوڑا جو دوسرے شہر میں رہتی تھی۔ خود کو پوری طرح تیار کر لیا کہ وہ مہشی سے کھل کر باتیں کرے گا۔

مہشی کو جب طالب نے ہوائی اڈے پر دیکھا تو پہچان نہ سکا— دبلی، پیلی اور پریشان حال۔ علی اسے

بھول چکا تھا۔ وہ چمک اس کی آنکھوں سے غائب تھی، جو طالب کو دیکھ کر آتی تھی۔ فرید بھی ساتھ تھا۔ اس کو دیکھ کر طالب کا ماتھا ٹھنکا۔

پہلا دن آرام سے گزرا۔ مہشی سہمی سہمی سی تھی۔ علی تھکا اور فرید شہر، گھر اور ماحول کو سونگھتا ہوا۔ مہشی نے طالب سے فوزیہ کے بارے میں کوئی سوال نہیں پوچھا۔ شاید وہ اس کے ذہن سے صاف ہو چکی تھی۔

تیسرے دن فرید نے باتوں کا سلسلہ شروع کیا، جس سے طالب کو لگا کہ یہ دونوں بھائی بہن امریکہ جانے کا پروگرام بنا رہے ہیں، اس سے مدد چاہتے ہیں۔ سب کچھ جان کر طالب انجان بنا رہا۔ آخر فرید نے کھل کر طالب سے کہا کہ وہ انہیں امریکہ کا ویزا دلانے میں مدد کرے۔

طالب نے بہت صاف لفظوں میں جواب دیا، 'جس نظام کو میں سرے سے رد کرتا ہوں وہاں جانے کا ویزا کیسے دلوا سکتا ہوں بھلا؟'

'یہاں ہم رہ نہیں سکتے اور ایران میں مہشی کا دم گھٹتا ہے۔' فرید نے جواب دیا۔

'اپنے ملک میں دم گھٹتا ہے تو پھر مہشی کو یہیں رکنا چاہئے اپنے شوہر کے گھر۔' فرید کو بڑا سپاٹ سا جواب دیا طالب نے۔

'یہ تو وہ جانے اور آپ، مگر بچے کی تعلیم امریکہ میں ہی بہتر ہو سکتی ہے۔' فرید نے کہا۔

'ہاں، ہم سب کے باپ دادا وہیں سے پڑھ کر آتے رہے ہیں جیسے۔' طالب ہنسا۔

'مذاق کی بات نہیں ہے۔ وہ جاہل رہ کر بھی عزت کما لیتے تھے، مگر آج پڑھا لکھا بھی تبھی عزت پاتا ہے جب اس کی تعلیم کہیں اچھی جگہ ہو۔' فرید نے جواب دیا۔

'بات آپ کی مناسب ہے۔ میں علی کو ایڈمیشن کرانے کی کوشش کروں گا۔ ہاسٹل میں جگہ بھی مل جائے گی۔ مہشی اور آپ کو امریکہ، انگلینڈ یا فرانس جانے کی ضرورت نہیں پڑے گی۔ اس حالت میں تو آپ دونوں کو یہی رائے دوں گا کہ آپ ایران اپنے بوڑھے ماں باپ کے پاس لوٹ جائیں۔

مہشی میرے پاس رہے گی اور ہمارا بیٹا بیرون ملک میں۔ جب مہشی چاہے گی، چھٹیوں میں اسے شام بلا لے گی یا پھر ہم باہر ہو آئیں گے۔' طالب نے بہت آرام سے اپنی بات کہی اور مہشی کے چہرے کو دیکھا جس پر اطمینان کی لکیریں کھنچ گئی تھیں، مگر فرید کا چہرہ بے عزتی سے فق ہو گیا تھا۔

رات کو طالب پڑھائی کی میز کے پاس والے لمبے صوفے پر سویا۔ اسے مہشی کا ایران والا برتاؤ یاد تھا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ مہشی اس کے گھر میں رہنے کی مجبوری سے اس کے ساتھ ایک کمرے میں رہے۔ مہشی کو اپنا فیصلہ لینے کی ہمت خود پیدا کرنی چاہئے۔ آخر دوسرے کی ادھار لی ہوئی قوت کب تک اس کا ساتھ دے گی؟

مہشی اتنے تناؤ میں تھی کہ وہ اس نکتے پر سوچ بھی نہیں پا رہی تھی کہ طالب اس کے پاس ہے یا اکیلا باہر سو رہا ہے۔ اسے تو اپنی زندگی اتنی الجھی نظر آ رہی تھی کہ طالب کے پیار کی دیوانگی بھی جیسے کافور بن کر اڑ چکی تھی۔ اب تو صرف رشتوں کو ان کے صحیح مقام پر بٹھانا تھا۔ اگر وہ طالب کو پوری طرح اپناتی ہے تو اسے اپنا بیٹا، مائکہ اور دولت سے ہاتھ دھونا پڑے گا۔ کیا وہ بیٹے کے بغیر رہ سکتی ہے؟ مائکہ ......؟ طالب سے نہ نبھی تو واپسی کا راستہ کیا ہوگا؟ طالب نے اس کو بھروسہ کب دلایا؟ اپنی شادی اور بیٹی کے بارے میں کچھ بھی نہیں بتایا تھا۔ اوپر سے عرب پارسی تاریخی دشمنی ایک بار پھر سینہ تان کر اپنے کو دہرانے کھڑی ہو گئی ہے۔ اس سے انکار کرنا بھی تو مشکل ہے۔ یہ پیسہ نہ ہوتا تو وہ کتنی سکھی ہوتی......! گھر والے، سسرال والے اسے ایک انسان کی طرح دیکھتے اور جو یہ سیاست نہ ہوتی، نسل پرستی نہ ہوتی تو اس کی اور طالب کی زندگی کتنی بہتر ہوتی۔ اگر یہ سب ہوتا اور حمید زندہ ہوتا تو؟ حمید نہیں ہے تبھی تو اسے طالب کی ضرورت پڑی اور زندگی ان سوالوں سے گھر گئی جس کے ہر جواب میں ایک سونا ریگستان اس کا انتظار کر رہا ہے۔

صوفے پر لیٹا طالب سوچ رہا تھا، لکھ پتی کہلانے والی اس عورت پر اس نے ایک سال میں پانی کی طرح پیسہ بہایا ہے۔ معلوم نہیں وہ دولت ہے کہاں اور کتنا ہے جو پورا خاندان اس کے چاروں طرف بھنبھناتا رہتا ہے۔ ایک جذباتی لغزش نے اس کو کیسا بکھیرا ہے۔ لکھنا پڑھنا چھوٹا، قرض کا بوجھ بڑھا اور ملا کیا سوائے ایک ادھ کچے رشتے کے؟ اس زمانے میں جب چاروں طرف جنگ، قحط،

سیلاب، زلزلہ سے انسان پریشان ہے، وہ انسانی سوچ کے دائرے سے نکل کر ایک بیکار زندگی کو شکل دینا چاہتا ہے؟ مرد عورت کی زندگی کی بوسیدگی پر وقت برباد کر رہا ہے؟ ریت کا گھروندہ بنانا چاہتا ہے۔ اف، اس ذاتی پریشانی سے اسے باہر نکل آنا چاہئے، ورنہ ان بے بنیاد سوچ والوں کے ساتھ، جو خود شناس اور خود غرض ہیں، وہ بھی بھٹک جائے گا۔

صبح ناشتے پر فرید نے بتایا کہ وہ مہشی کے ساتھ ویزا کے لئے جائے گا۔ اس کی بات سن کر طالب خاموش رہا، پھر اس نے مہشی کی طرف دیکھا کہ وہ کیا چاہتی ہے۔ مہشی چپ چاپ سر جھکائے علی کو ناشتہ کراتی رہی۔

'آپ لوگ کیا محض امریکہ جانے کے لئے مجھے استعمال کرنا چاہتے تھے؟' طالب کے کان لال ہو گئے۔

'آپ چاہیں تو آپ بھی جا سکتے ہیں۔' فرید نے کہا، پھر دھیرے سے بولا، 'قانونی طور سے تو آپ کو امریکہ کا خرچ بھی اٹھانا چاہئے اور علی کی پڑھائی کا خرچہ بھی دینا چاہئے۔'

'اچھا!' کہہ کر طالب اٹھا اور اپنی پڑھائی کی میز پر کچھ ڈھونڈنے لگا۔

'چلیں پھر!' فرید نے کہا۔

'سامان آپ نے پیک کر لیا ہے؟' طالب نے ٹھہرے لہجے میں کہا۔

'کیوں؟' فرید کے تیور چڑھے۔

'مجھے ایک سیمینار میں دوسرے شہر جانا ہے۔ میرے پیچھے آپ لوگوں کو یہاں تکلیف ہوگی۔ بہتر ہے آپ کا انتظام ہوٹل میں کرا دوں۔ مجھے لوٹنے میں دو دن لگ جائیں گے۔' طالب نے کہا۔

'تو پھر مہشی کو طلاق اور مہر دے کر جائیں۔' تیز تلخ آواز میں فرید نے کہا۔

'مہشی کو طلاق؟ اس سے میں نے شادی کب کی؟' طالب تلخی سے بولا۔

'طالب...... 'چونک کر مہشی نے طالب کو دیکھا۔

'آپ کی پارٹی کے صدر کو فون کرتا ہوں۔ 'فرید کانپ اٹھا۔

'کس حق سے؟' طالب کے تیور چڑھ گئے۔

'آپ میری بہن کو جذباتی طور سے بلیک میل کر رہے ہیں۔ 'فرید چیخا۔

'یہ کہیئے کہ آپ مجھے جذباتی طور سے بلیک میل نہیں کر پا رہے ہیں۔ اس لئے آپ کو اس کا دکھ ہے۔' طالب ہنسا۔

'دکھ؟ سچ پوچھیں تو آپ سے ہمیں ڈر لگتا ہے۔ جانے کتنی معصوم عورتوں کو آپ بیوقوف بنا چکے ہیں۔' فرید نے حقارت سے کہا۔

'بیوقوف تو فی الحال آپ لوگ مجھے بنا رہے ہیں۔ ڈرنا تو مجھے آپ لوگوں سے چاہیئے کہ آخر کیا جرم کر کے آپ اپنے ملک سے بھاگنا چاہتے ہیں؟' طالب بھول گیا کہ فرید مہشی کا بھائی ہے اور اسے اتنی تلخ زبان کا استعمال نہیں کرنا چاہیئے۔

'فوزیہ آپ کی بیٹی ہے اور آپ نے...... 'فرید نے طنز کیا۔

'فوزیہ ہمارے اور مہشی کے درمیان کا معاملہ ہے، اسی طرح جیسے علی۔ مہربانی کر کے اس کو آپ زبان پر مت لائیں۔' طالب کے چہرے پر غصے سے بھرا دکھ ابھرا۔

'طلاق دیجیئے، ساتھ ہی مہر، وہ بھی نقد۔' فرید اپنی ذلالت پر اتر آیا۔

'فرید......' کانپتی آواز میں مہشی چیخی۔

'تم چپ رہو! تمہاری ایک غلطی نے ہمارا سر ایک عرب کے سامنے جھکایا ہے۔' فرید نے بہن کو ڈپٹا۔

مہشی سوچنے لگی کہ فوزیہ کو اس کے گھر والوں نے کیسا رائی کا پہاڑ بنا لیا تھا۔ اس کا اندازہ مہشی کو آج ہوا۔ ماں، باپ، بھائی، ساس سسر سبھی اسے نئے نئے انداز سے جکڑتے، ڈراتے، دھمکاتے ہیں اور

وہ...... وہ اپنا حق کیوں نہیں لیتی ؟ کہیں وہ خود اپنی حمایت میں کی گئی وکالت میں کمزور تو نہیں ہے ؟ کیا اسے خود پتہ ہے کہ حقیقت میں اسے کیا چاہئے ؟

'میں نے ضرور کوئی غلطی کی ہوگی جو دوبارہ گھر بس کر اجڑا۔ بہر حال طلاق، وہ بھی فوزیہ کی ماں کو؟ میرے لئے مشکل کام ہے۔ دنیا میں یقین کے نام پر کچھ تو بچا رہنا چاہئے، ورنہ......' طالب دل ہی دل میں جیسے اپنے سے کہہ رہا ہو۔ اس کا چہرہ بدل گیا تھا۔ مہشی کے برتاؤ سے وہ صدمے میں تھا۔ مہشی نے نام بدل کر شادی کیا اسی لئے کیا تھا کہ ایک دن وہ دودھ کی مکھی کی طرح اسے نکال پھینکے گی؟ عورت کیا اس حد تک خود غرض ہو سکتی ہے؟

'طلاق......' فرید چیخا۔

'مجھے طلاق دینے کا شوق نہیں ہے۔ آپ چاہیں تو اپنی طرف سے طلاق نامہ بھجوا دیں۔ کم سے کم اس میں میرا نام تو صحیح لکھا ہوگا۔' طالب نے غصے بھرے لہجے میں کہا۔

مہشی وہیں صوفے پر بیٹھ گئی۔ اس کی زندگی کا فیصلہ ہو رہا ہے اور وہ چپ ہے۔ حمید کی طرح اس کی آنکھوں کے سامنے طالب بھی اس سے دور جا رہا ہے۔ کیا اس کا کام صرف علی کی دیکھ بھال ہے یا اس دولت کو سنبھالنا بھی ہے جس کو گننے تک کا خواب اس کے مائیکے والوں نے کبھی نہیں دیکھا تھا؟ دولت کی کسے ضرورت ہے، اسے یا اس کے گھر والوں کو؟

'اگر آپ پسند کریں تو ہمیں کچھ لمحے تنہا رہنے دیں، بقول آپ کے کہ مجھے شوہر کے فرض نبھانے چاہئیں۔' طالب نے کچھ اس طرح کہا کہ فرید کو علی کے ساتھ باہر جانا پڑا۔

کمرے میں خاموشی چھا گئی۔ مہشی کا ذہن خالی تھا۔ دل میں صرف دہشت تھی۔ فیصلے کی زنجیر ٹوٹی پڑی تھی۔ طالب نے اپنے کو سنبھالا، پھر مہشی کے سامنے آ بیٹھا۔

'مہشی، تم ذہین ہو، باتیں سمجھتی ہو، یہی تمہاری خوبصورتی ہے۔ تم جانتی ہو کہ میں چاہوں تو تمہیں زبردستی روک سکتا ہوں اور فرید کو اس کی گستاخی کی سزا بھی دے سکتا ہوں، مگر میں ایسا نہیں کر سکتا، کیوں کہ فرید سے بڑا دشمن ہمارے سامنے ہے۔ اس سے لڑنے کے لئے کھڑا ہونا ہے۔

کیا پتہ فرید کو بھی شریک ہونا پڑے۔ وہ دن دور نہیں جب پورے ایشیا کو اتحاد میں باندھنا پڑے گا اور......'

'فرید نادان ہے۔ مجھے خوش دیکھنا چاہتا ہے، اس لئے......' تھکی آواز میں مہشی نے کہا۔

'رنگوں کو ملاؤ نہیں مہشی! وہ تمہارا بھائی ہے، یہ حقیقت ہے۔ وہ نادان نہیں، شاطر ہے۔ ایسے لوگوں کی بھی ایک حد ہوتی ہے۔ خیر...... مجھے پتہ ہے تمہاری اپنی بے بسی، اپنی مجبوری تھی، اس لئے تم سے کوئی شکایت نہیں کر رہا ہوں۔ صرف اس صورت حال کو دیکھ رہا ہوں جو دو انسانوں کے درمیان سیاست کا سیاہ سمندر کیسے پھیلا رہی ہے۔ دل اور جذبات بھی خالص نہیں رہ پاتے۔ ان پر بھی کالے ڈینے پسر پڑتے ہیں......'

طالب کو درمیان میں روک کر مہشی نے کہا، 'انہی سیاسی پارٹیوں میں سے ایک کے ممبر تم بھی ہو طالب، جو دلوں کو کاٹتی، زمین کو بانٹتی، تاریخ کو تہہ خانوں میں بند کرتی ہے۔'

'نہیں مہشی، میں برسر اقتدار نہیں ہوں، نہ اقتدار کے لئے سیاست کرتا ہوں، بلکہ اقتدار کا مخالف ہوں۔ انسان کی مخالفت اور حمایت میں کی گئی سیاست کا فرق سمجھو۔ مجھے یقین ہے کہ تم سب کچھ سمجھتی ہو، بس اقرار کرنے سے گھبراتی ہو۔ مجھے جانتی ہو کہ میں دنیا میں امن لانے والے، انسانوں کو دکھ درد سے نجات دلانے والے نظریات سے جڑا ہوں۔ ہماری پارٹی انسانوں کو غلام بنانے میں دلچسپی نہیں رکھتی ہے، بلکہ انہیں نجات دلانا اس کا مقصد ہے۔ اس لئے میری دوست، چیزوں کو گڑبڑانے کی عادت مت ڈالو۔ مانا کہ ہم میاں بیوی کی طرح نہیں رہ سکتے، مگر دو قلم کار، دو تخلیق کار، دو انسانوں کی طرح تو آپس میں سلوک کر سکتے ہیں۔' طالب نے کہا۔

'طالب! میں بہت بدقسمت ہوں۔ مجھے یوں ذلیل مت کرو۔' مہشی صرف اتنا کہہ پائی۔ اس کے ذہن میں طالب کا قد گھر والوں کے بنائے قد سے بہت اونچا ہو گیا تھا۔ اس کی آنکھیں ضرور چھلک پڑی تھیں، مگر دل و دماغ دکھ درد سے نکل کر ایک عجیب سکون میں پہنچ گیا تھا۔

'تم بہت خوش قسمت ہو مہشی! خدا نے تمہیں عقل دی ہے، اس کا استعمال کرو...... ہاں، یہ تمہارا واپسی کا ٹکٹ ہے۔ یہ میری ذمہ داری ہے۔ رہا ملک ملک بھٹکنے کا شوق، وہ پورا کر سکتی ہو، مگر تمہیں

سکون وہیں ملے گا جہاں تم عام انسان کے دکھ درد سے جڑ سکو گی۔ اپنے ملک لوٹ جاؤ جہاں اپنی بات کہہ سکو اور ان کی بات سن سکو گی ....' طالب نے ہلکے سے مہشی کے سر پر تھپکی دی۔

'مجھے معاف کرنا طالب، میں نے تم کو بہت دکھ پہنچایا۔' مہشی نے کانپتی آواز میں کہا۔ مگر اس کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ طالب سے کہے کہ وہ اپنے پورے حق سے اسے روک کر اس گھر میں ہمیشہ کے لئے قید کر لے۔

'مجھ سے زیادہ تم اپنے کو دکھ دے رہی ہو۔ اپنے سے معافی مانگو۔ میں تو تمہاری عزت کرتا ہوں۔ بس، اتنا میرے لئے کافی ہے۔' طالب نے ایک عجیب دلکشی بھری سنجیدگی سے کہا، 'میں تمہیں آزاد کرتا ہوں تاکہ تم اونچی اڑان بھر سکو، دنیا دیکھ سکو، مگر ایک بات یاد رکھنا— ماضی کے نام پر حال کو سیاہ کرنا اڑان کی شرط نہیں ہے۔'

مہشی نے طالب کو دیکھا۔ سورج اس کے بالکل قریب تھا۔ کتنا اونچا اڑی؟ ابھی وہ پنکھ کھول کر گرمی بھرنا ہی چاہتی تھی کہ دروازہ کھلنے کی آواز آئی۔ فرید اور علی آگئے تھے۔ مہشی کے سارے الفاظ حلق میں چپک گئے۔ اس نے ہمت کا سرا تھامے رکھا تاکہ ڈوبتی زندگی کو بچالے، مگر فرید نے اونچی آواز میں کہا، 'مہشی، میں نے سارا سامان رکھ لیا ہے ٹیکسی میں......'

سورج گہری بدلی میں چھپ گیا اور اندھیرا چھا گیا۔ زندگی کو تلاش کرتی چڑیا یکایک پھڑپھڑائی اور چڑی مار کے پھیلائے جال میں پھر آن پھنسی۔

سنگسار

آسیہ جب المست سی ملائم بستر پر کروٹ بدل کر کہنی کے سہارے اٹھی تو اسے محسوس ہوا جیسے ساری دنیا ہی بدل گئی ہو اور اس کے اندر ایک نئی عورت نے جنم لیا ہو، جو ہر طرح سے بھری پوری اور مطمئن ہے۔ اس نے دوسری طرف سے جھک کر اپنے لمبے بالوں کو اس کے اوندھے پڑے سینے کے نیچے سے دھیرے سے کھینچا اور بستر سے اتری۔

آہستہ آہستہ قدم اٹھاتی ہوئی آگے بڑھی، لگا جیسے بدن کے سارے جوڑ زنجیریں توڑ کر ٹھمک رہے ہوں اور روئیں روئیں سے امنگوں کا سوتا پھوٹ رہا ہو۔ بدن اتنا ہلکا جیسے دھنی ہوئی روئی کا گولہ۔ سامنے آئینے میں نظر آتے اپنے سراپا پر اس نے نظر ڈالی۔ ایک نکھار، ایک دلکشی، ایک حسن، ایک سلونا پن اس کے پورے وجود کو دمکا رہا تھا۔ کوئی جلن، کوئی زخم، کوئی داغ، کسی طرح کا کوئی سیاہ نشان کہیں موجود نہیں تھا، بلکہ بدن پر پھسلتے ہاتھوں نے احساس دلایا جیسے وہ پھول کی طرح ملائم اور خوشبودار ہے۔

اپنے دونوں ہاتھ اٹھا کر اس نے بھرپور انگڑائی بھری، بدن میں چھائی گہری مستی پھولوں سے بھری ڈال جیسے جھری۔ انگلیوں کو بالوں کے بیچ پھنسا کر اس نے دونوں ہاتھوں سے ماتھے پر جھک آئے بالوں کو پیچھے کی طرف سمیٹا اور پلکیں جھپکائیں۔ لمبے بالوں کے گچھے اس کے ننگے سرین پر لہرائے۔ اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ سارا بدن انجانی گدگداہٹ سے بھر گیا۔

'وہ ان بالوں سے کیسا کھیل رہا تھا۔ کبھی بالوں کی لمبی بھاری لٹ اس طرح بکھیرتا کہ مہین جال اس کے سینے پر بکھر جاتا۔ وہ ان کے بوسے لیتا۔ بالوں کو سمیٹ کر آدھے چہرے اور سینے کو ڈھکتے ہوئے اسے پلکیں جھپکائے بغیر نہارتا۔ پھر انہیں بستر پر دوسری طرف پھیلا کر اس کی کمر میں ہاتھ ڈالتا ہوا اس کے ہونٹوں کو اس طرح اپنے ہونٹوں کے آغوش میں بھینچ لیتا کہ وہ بے سدھ ہو جاتی اور......'

آسیہ کی بھاری پلکوں میں خواب آمیز سماں تیر گیا۔

کچھ گھنٹے پہلے جھجکتی آسیہ دو دل بنی چلمن کے باہر کھڑی تھی۔ یکایک جانے کس جذبے سے متاثر ہو کر اس نے چلمن ہٹائی اور کمرے میں تیر گئی۔ اس کے جسم پر اُگی ناگ پھنی کی بیل اپنی چبھن بھول گئی۔ پیچھے پکارتی آواز تھم کر خاموش ہو گئی اور اس کا کانپتا وجود یکایک تھم گیا۔ یہ تھمنا موت نہیں تھی، بلکہ اس خوف سے نجات تھی کہ اندر گھستے ہی تیز زلزلہ آ جائے گا جو اس کے ساتھ اس آسمان اور زمین کو بھی ہلا کر تباہ و برباد کر دے گا۔

'چلمن ایک خوف، ایک دیوار، ایک قید تھی۔ اس کے اس پار ایک آزادی، ایک زندگی، ایک استحقاق ہے۔' سوچ کر آسیہ ہنس پڑی اور گنگناتی سی غسل خانے سے کمرے میں داخل ہوئی۔ کھلی کھڑکی سے ہوا کا تازہ جھونکا آیا۔

'سب کچھ بدل گیا— اندر اور باہر۔' اس نے جھانک کر باہر دیکھا۔ آنکھوں میں نظر آتا نیلا آسمان اور پیڑوں کے ہرے پتے کبھی اتنے چمکدار اور سورج کبھی اتنا جاندار نظر نہیں آیا تھا۔ وہ کپڑے اٹھانے جھکی تبھی بالوں سے ڈھکی پیٹھ کے نیچے اس کو گرم انگلیوں نے چھوا۔ 'وہ جاگ گیا شاید۔' شرمائی آسیہ بغیر مڑے سیدھی کھڑی ہو گئی۔ انگلیاں اب ہتھیلی بن کر اس کے پیروں کو سہلا رہی تھیں۔ ساری زندگی کی تھکان ٹوٹی زنجیر کی طرح اس کے پیروں سے اترنے لگی۔ وہ سب کچھ بھول گئی۔ اتنا یاد رہا کہ دو گرم بانہیں پہلی جیسی گرمی اور تشنگی کے ساتھ اس کی کمر کے گرد بندھ گئیں اور وہ کسی بھنور کی طرح اس بدن سے لپٹ گئی۔ ماتھے کے قریب گرم سانسوں کے لمس سے آسیہ نے چہرہ اوپر اٹھایا، بھاری پلکیں کھولیں، آنکھیں ملیں اور اندر کی کھولتی، ابلتی خوشی باندھ توڑ گئی۔ زندگی سے بھرپور دونوں کی ہنسی ایک ساتھ ایک آواز میں کمرے میں گونج اٹھی۔

'سچ ہے، انسان کو اپنے سکھ کی تلاش خود پوری کرنی پڑتی ہے۔' آسیہ نے گرم ہونٹوں کو اس کے سینے پر رکھ دیا۔ شہد کے منوں مٹکے ایک ساتھ لڑھکے، ایک دوسرے کے جسم کی بو سونگھتے، ایک دوسرے کو پوری طرح پانے کے لالچ سے بےچین، دونوں کھلتے کملوں کے بیچ مدہوش تھے۔

سورج چڑھا، ڈھلا اور رات دبے پیر کھلی کھڑکی سے کمرے میں داخل ہو گئی۔ گلی کوچوں میں زندگی کی چہل پہل بدستور قائم تھی۔ توبہ کی بارگاہ کھلی تھی اور گناہوں کے راستوں پر پہریدار کھڑے تھے،

مگر اس کمرے میں سانسوں کے سارس ہر چیز سے بے نیاز خود سپردگی کے سمندر پر اڑنے کے لئے پنکھ پھیلائے کمرے کی مدہوش فضا میں جھولا جھول رہے تھے۔ انہیں نہ دنیا کا خوف تھا، نہ زمانے کا ڈر۔ تلوار، گولی اور پھانسی ان کے لئے پھولوں کی سیج تھی۔

ماں کی جہاں دیدہ نظروں سے آسیہ کی گھبراہٹ چھپی نہیں رہ سکی۔ مائیکے میں آکر آسیہ زیادہ کھل اٹھی تھی، مگر روز روز باہر نکلنا اور ہر بار نیا جھوٹ بولنا ذرا مشکل کام تھا۔

'دوزخ کی آگ خرید رہی ہو تم؟' ماں کے تیور بدل چکے تھے۔ انہیں دیکھ کر اس کا دل دہل گیا اور وہ جواب دینے کی جگہ ماں کو پھٹی نظروں سے دیکھتی رہی، جیسے کہہ رہی ہو کہ زندگی ایک ہی طرح کے راستے پر چلنے کا نام نہیں ہے، ماں!

کئی دن آسیہ گھر سے باہر نہیں نکلی۔ کمہلائی، مرجھائی بغیر نہائے دھوئے پڑی رہی، مگر چوتھے دن وہ اٹھ کر تیار ہوئی، جیسے ماں سے کہنا چاہ رہی ہو کہ دوزخ کی آگ میں جیتے جی جھلس چکی ہوں، مجھ سے میری جنت مت چھینو۔ سب کی نگاہ میں یہ گناہ ہی سہی، مگر کر لینے دو مجھے یہ گناہ...... یہ میرے تجربے کی حصولیابی ہے، اس پر کسی کا حق نہیں ہے۔

آسیہ چلی گئی۔ ماں اس کے چہرے کے تیور کو دیکھ کر چپ رہی یا پھر بیٹی کی پہلی سرکشی کو دیکھ کر سمجھ نہیں پائی کہ بائیس سال کی اپنے سے اونچے قد کی اس خوبصورت آفت کو وہ کیا سزا دے؟

شام کو عاصمہ اپنے چار بچوں کے ساتھ لدی پھدی چلی آئی۔ گھر کی کوئی چیز اپنی جگہ پر ٹکی نہ رہ سکی۔ گھوڑ دوڑ نے گھر میں وہ طوفان برپا کیا کہ آخر ماں کو منہ کھول کر انہیں ڈانٹنا پڑا، مگر نانی کی ڈانٹ کون سنتا ہے۔ کھانے کے بعد جب سارے شیطان سو گئے تو ماں بیٹی دھوپ میں بیٹھیں اور اپنے اپنے دکھ سکھ کی باتیں کرنے لگیں۔

شام ڈھلے جب آسیہ گھر میں داخل ہوئی تو اس کے استقبال میں بچوں نے وہ چیخ پکار مچائی کہ آسیہ

بھول گئی کہ اب اسے ان کے ساتھ اودھم نہیں مچانا چاہیے۔ اس اچھل کود میں آسیہ کو واپس گھر میں دیکھ کر ماں کے تیور بھی ڈھیلے ہوگئے اور ہنسی خوشی سب ایک ساتھ بیٹھ کر چائے پینے لگے۔ ٹی وی پر بچوں کا پروگرام شروع ہوگیا تھا۔ اس لئے کیک پھل کھاتے بچے خاموشی سے بیٹھے تھے۔

رات کے کھانے کے بعد بہنیں جب اکیلی رہ گئیں تو آسیہ نے بہن کو غور سے دیکھا، پھر جھجکتے ہوئے بولی، 'سچ بتانا، کیا وہ سب تمہیں اپنے شوہر سے ملا جس کی تمنا ایک عورت کے دل میں رہتی ہے یا صرف ہر سال ایک عدد اولاد کا تحفہ ملتا رہا؟'

'ہاں، ملا بہت کچھ، گھربار اور یہ اولادیں، اوپر آسمان سے تو نہیں گریں نا؟' عاصمہ نے آنکھیں اس طرح اٹھائیں جیسے بہن کی نادانی پر ہنس رہی ہو، مگر جب بہن کے چہرے پر سنجیدگی اور آنکھوں میں سوال کو لگاتار ناچتے پایا تو وہ سوال کو سمجھی اور ہنسنا بھول گئی۔ جواب کے نام پر ایک سستی چہرے پر اتر آئی۔

'جھوٹ...... یہی جھوٹ ہمارا زیور ہے...... یہ زیور میں نے بھی پہنا، یہ نقاب میں نے بھی آنکھوں پر ڈالی، مگر جانتی ہو میری قسمت میں کچھ اور لکھا تھا۔ مجھے میرا حصہ ملا ضرور، مگر اس نے میرا سب کچھ بدل ڈالا۔'

'میں سمجھی نہیں تمہاری بات۔'

'جب کوئی کسی تجربہ سے گزرا ہی نہ ہو تو اس سے زندگی کی گہرائی پوچھنا بیکار ہے۔'

الجھی الجھی عاصمہ بہن کو سمجھنے کی کوشش کرنے لگی۔ جب کچھ بھی پلے نہ پڑا تو اس نے ایک پرانا سوال دہرایا، 'افضل شوہر تو اچھا ہے نا؟'

'ہاں، شریف، سیدھے اور کمانے والے...... ہر عورت کے لئے صرف یہ خوبیاں کافی نہیں ہوتیں۔'

'یعنی؟'

'شرافت بھوکے کو کھانا، پیاسے کو پانی، مرتے ہوئے کو زندگی نہیں بخشتی۔ ان چیزوں کے لئے شرافت سے اور اونچا اٹھنا پڑتا ہے، سمجھیں؟ اگر اب بھی عورت ہو کر نہ سمجھ پائی ہو تو......' آسیہ

بہن کے تعجب سے کھلے منہ کو دیکھ کر چڑھ گئی اور بستر پر جا کر لیٹ گئی۔

عاصمہ کی گود کا بچہ دودھ کے لئے روپڑا اور وہ بہن کو چھوڑ کر اپنے لاڈلے کو سنبھالنے میں لگ گئی۔ آسیہ نے اکتائی نظروں سے بہن کو دیکھا جس کے بائیں طرف تین اور بچے بے سدھ پڑے سو رہے تھے۔

سورج کے نکلتے ہی گھر میں ہنگامہ شروع ہو گیا۔ کوئی گرا، کوئی چیخا اور کوئی رویا۔ ناشتے کے بعد آسیہ موقع دیکھ کر چپ چاپ گھر سے نکل گئی۔

عاصمہ رات سے الجھن میں پڑی تھی۔ اس لئے بچوں کے پارک میں نکلتے ہی اس نے ماں سے پوچھا، 'سب ٹھیک تو ہے نا؟'

'بلا کر پوچھو اسی سے!' ماں یکایک غصے سے بھڑک اٹھیں۔

'وہ تو کب کی جا چکی، پوچھ کر نہیں گئی کیا؟' تعجب سے عاصمہ نے پوچھا۔

'وہ تجربے کر رہی ہے۔ یہاں صدیوں سے جو تجربہ ہم کر رہے ہیں وہ تو اس کی نظر میں فضول اور بوسیدہ بات ہے۔ وہ اکیلی سماج کو بدل ڈالے گی، مردوں کی برابری کر ان سے نیا قانون لکھوالے گی۔ چپ چاپ بیٹھی دیکھتی جاؤ یہ آتش پارہ کیا گل کھلاتی ہے۔' ماں کا چرخہ چل گیا تھا اور عاصمہ کے کان کھڑے ہو گئے تھے۔ اب دھیرے دھیرے کر کے بات اس کی سمجھ میں آنے لگی تھی۔

'مرد صیغہ بھی کرے گا، بیاہتا کے رہتے دوسری شادی بھی کرے گا اور باہر بھی جائے گا، اسے کون روک سکتا ہے بھلا؟ لوگ تھو تھو بھی کریں گے تو فرق نہیں پڑتا، مگر عورت یہ سب کرے گی تو نہ گھر کی رہے گی نہ گھاٹ کی۔ دوسرا شوہر کرنا تو دور، کسی سے آشنائی بھی ہوئی تو دنیا اسے حرام کاری اور مذہب اسے زناکاری کہے گا، مگر اس کے سر پر تو انقلاب سوار ہے۔ ایک انقلاب نے ہمارا سکھ چھینا، دوسرا آیا تو سمجھو ہماری بچی عزت بھی دھول میں مل جائے گی۔' ماں پر جیسے دورہ پڑ گیا تھا۔ ان کی آواز اونچی ہو کر پھٹ گئی تھی۔

'صبر سے کام لو۔' گھبرا کر عاصمہ نے ماں کو خاموش کرنا چاہا۔

'ارے، اس کے میاں میں ہے کوئی خرابی، مگر بد بخت کی قسمت پھوٹی ہے۔' ماں نے روہانسی آواز میں کہا اور چپ ہو گئی، شاید آنسو پینے کی کوشش کر رہی تھیں۔

عاصمہ سر جھکائے بچوں کے دھلے کپڑوں پر آئرن کرنے لگی۔ اس کا دماغ تیزی سے سوچ رہا تھا۔ اگر آسیہ افضل سے خوش نہیں ہے تو طلاق لے لے، مگر یہ سب......؟ طلاق کس بنیاد پر وہ مانگے گی بھلا؟ کوئی خرابی نہیں افضل میں، نشہ، بیماری، بیکاری، پٹائی، لاپروائی کچھ بھی ایسا نہیں ہے جو کیس بنا سکے۔ نامردی کا الزام اس پر لگایا نہیں جا سکتا ہے۔ اس کو ثابت کرنا پڑے گا اور یہ پتہ لگا کہ آسیہ خود کہیں دلچسپی رکھتی ہے پھر تو قیامت آجائے گی، کورٹ اسے......

'کپڑا جل رہا ہے؟' ماں چیخی۔

'اوہ!' عاصمہ چونکی۔ چھوٹی بیٹی کا لال فراک سینے کے پاس سے جل چکا تھا۔ عاصمہ نے پلگ نکالا، کپڑے سمیٹے اور چپ چاپ بیٹے کے پاس جا کر بیٹھ گئی۔ اس کا دل و دماغ پریشان تھا۔ کئی طرح کے سوال اس کے سامنے آکھڑے ہوئے تھے جن میں سب سے اہم سوال تھا کہ شادی کے بعد ایسا کیوں ہوا اور وہ کون ہے جس نے اس کی بہن کا ایمان ڈگمگا دیا ہے؟

شام کو عاصمہ کے شوہر کا فون آیا کہ وہ اسے لینے آنے والا ہے، مگر ماں کی بیماری کا بہانہ کر کے عاصمہ نے اس سے ایک دن اور رکنے کی اجازت لے لی۔ بیٹی کو رکتا دیکھ کر ماں نے بڑی بہن کو فون کر کے بلا لیا اور تینوں سر جوڑ کر آسیہ کی بدقسمتی پر آنسو بہاتی رہیں۔ آسیہ جب شام ڈھلے گھر میں داخل ہوئی تو خالہ نے محسوس نہیں ہونے دیا کہ انہیں ساری بات کا پتہ چل گیا ہے۔ وہ اسی پیار دلار سے ملیں اور پوچھنے لگیں۔

'مائیکے میں کب تک رہنا ہے؟ ہو سکے تو خالہ کے گھر بھی آؤ۔'

'اب یہیں رہوں گی، مجھے واپس نہیں جانا ہے۔' آسیہ نے فیصلہ سنایا، جسے سن کر ماں کے ہاتھ سے گھی کا ڈبہ چھوٹتے چھوٹتے بچا۔

'لاؤ، میں بگھارتی ہوں۔' عاصمہ گود کا بچہ آسیہ کو دے کر ماں کی گھبراہٹ تاڑی اور ہنڈیا بھوننے میں لگ گئی۔

'پورے ایک مہینے میں نے تجھے دودھ پلایا تھا، جب تو تین مہینے کی تھی اور زہرہ سخت بیمار تھی۔' خالہ نے پرانی یادوں میں ڈوبتے ہوئے کہا۔

'اب میں تین مہینے کی بچی تھوڑی ہی ہوں جس کی ضرورت صرف ماں کی چھاتی کا دودھ ہوتا ہے۔ اس گھر میں کوئی نہیں سمجھتا کہ میں بڑی ہو گئی ہوں۔ میری ضرورت، میری چاہت کچھ اور ہے۔' آسیہ نے شکوے بھرے لہجے میں کہا۔

'آ میری بچی، تیری ضرورتوں کو میں اپنی عقل کے مطابق سمجھنے کی کوشش کروں گی۔' کہہ کر خالہ نے آسیہ کو اپنی بانہوں میں سمیٹا، اس کے ماتھے کو چوما اور بالوں کو سہلایا۔

زہرہ ایک کنارے بیٹھی بیٹی کا چہرہ حیرت سے تاکنے لگیں۔ عاصمہ نے چائے کی ٹرے سامنے رکھی اور کیک، سوکھے میوے کی پلیٹ خالہ کے آگے بڑھائی۔ آسیہ سنبھل کر بیٹھ گئی۔

'ضرورت کا، انسان کی زندگی میں ایک اصول ہوتا ہے۔' خالہ نے دھیمی آواز میں کہا۔

'مانتی ہوں خالہ، مگر جب زندگی ان بوسیدہ اصولوں کی قانونی کتابوں سے آگے نکل جائے تو؟' آسیہ نے پریشان آنکھیں اٹھائیں اور خالہ کو دیکھا۔

'ہر ضرورت اگر پوری کی جائے تو پھر اللہ ہی حافظ ہے۔' خالہ نے اس کے گالوں پر پیار سے چپت ماری۔

'آپ کا پرانا قانون نئی پریشانیوں کا حل نہیں جانتا، مرتے گھٹتے انسان کی مدد کو نہیں پہنچتا، اس لیے آپ زندگی کو خوف کی دیواروں میں چن دینا چاہتی ہیں تاکہ انسان ایک بار ملی زندگی بھی کھل کر نہ جی سکے۔' کہہ کر آسیہ اٹھی اور کمرے سے باہر نکل گئی۔

کمرے میں تھوڑی دیر خاموشی چھائی رہی۔ تینوں عورتیں اپنے اپنے خیالوں میں ڈوبی تھیں۔ کمرے میں اندھیرا بڑھتا دیکھ کر عاصمہ نے بتی جلائی۔

'یہ رشتے کس زمانے میں عورت مرد کے بیچ نہیں بنے، مگر...... 'ماں نے دھیرے سے کہا۔

'ارے زہرہ، تب اچانک یہ رشتے بنتے تھے کیونکہ اچانک ہی موقع ملتا تھا۔ حمل ٹھہرایا اولاد پیدا ہوئی۔ اس بات کو بتانے کے لئے شاید ہی ان بیچاروں کو دوسرا موقع ملتا ہو، کس کی اولاد کس گھر میں پلی، کسی کو کیا پتہ ہے۔ مگر اب حالات دوسرے ہیں۔ یہاں بار بار زندگی انسان کو موقع دیتی ہے۔ حالات اس کا ساتھ بھی دیتے ہیں، کیونکہ انسان اپنے حق کو پہچاننے لگا ہے اور...... 'خالہ بیچ میں رک گئی۔

'ہم نے آپ کو اس لئے بلایا تھا کہ آپ اسے سمجھائیں الٹے آپ اسی کی زبان بولنے لگی ہیں۔' زہرہ بہن کی اس ادا کا برا مان گئیں اور ان کی بات بیچ میں کاٹ دی۔

'میرے کہنے کا مطلب ہے کہ بات نہ ہلکی ہے نہ فضول، اس لئے تھوڑا صبر سے کام لو، جوش وقت کے ساتھ بیٹھے گا، دبانے سے اور ابھرے گا۔' بڑی بہن نے سوچتے ہوئے کہا۔

رات کو سب نے جانے کہاں کہاں کی باتیں کیں، دکھ سکھ کو یاد کیا۔ آسیہ نے بچوں کے ساتھ تکیہ پھینک پھینک کر کھیلا، ماں سے روئی کے ٹوٹنے پر صلواتیں سنیں اور کھانے کے بعد ایک لحاف میں گھس کر سب نے آسیہ سے ڈھیر ساری کہانیاں سنیں۔ کہانی سناتے سناتے آسیہ بچوں کے بیچ گہری نیند میں ڈوب گئی۔

آدھی رات کے لگ بھگ جب ماں اور خالہ اپنے کمرے میں سو گئیں تو عاصمہ نے جاکر بہن کو جگایا اور دونوں خاموشی سے بیٹھک میں آکر بیٹھ گئیں۔ عاصمہ نے پہلے ہی کافی بنا کر رکھ لی تھی۔ بہن کی خواب میں ڈوبی آنکھیں دیکھ کر عاصمہ ہلکے سے مسکرائی۔

'لو، پہلے تمہاری یہ نیند ٹوٹے تو آگے بات ہو۔'

دونوں دھیرے دھیرے کافی پیتی رہیں۔ عاصمہ کے چہرے پر فکر تھی۔ آسیہ کے چہرے پر خواب کا سنہرا پن تھا۔ کافی کے پیالے خالی ہوگئے۔ آسیہ نے پیر اٹھا کر صوفے پر پالتی ماری اور بہن کی طرف دیکھا۔ عاصمہ نے صوفے کی پیٹھ سے ٹیک لگا کر ایک لمبی سانس کھینچی۔

'کون ہے وہ؟'

'کون؟' آسیہ چونکی، نیند کا خمار کافور ہو گیا۔

'تم میرا مطلب سمجھ رہی ہو، آخر وہ کون ہے۔' عاصمہ کا لہجہ سپاٹ تھا۔

'ایک مرد۔' آسیہ کا لہجہ تلخ تھا۔

'اس سے تمہارا کیا رشتہ ہے؟' بہن کی بھنویں تنیں۔

'میرا اور اس کا رشتہ؟ آدم اور حوا کا ہے۔' آسیہ ہنسی۔

'آدم اور حوا کا رشتہ پاک ہے، مگر عورت مرد کا جو رشتہ تم جی رہی ہو وہ سماج کی نظر میں ناپاک ہے۔' عاصمہ نے آئینہ الٹ دیا۔

'سماج؟ کون سا سماج؟ عورت مرد کا آپسی رشتہ کسی سماج، کسی قانون کا محتاج نہیں ہوتا ہے۔ اس لئے میں بھی نہیں ہوں۔'

'تمہارے چہرے پر بغاوت کی تتھری بج رہی ہے، مگر یہ بغاوت تمہیں صرف غلط راستے پر نہیں، بلکہ موت کے راستے کی طرف بھی دھکیل رہی ہے۔'

'اب میرا ہر راستہ موت کی طرف ہی جاتا ہے۔'

'تو پھر راستہ بدل ڈالو۔'

'جب مرنا ہر حالت میں ہے تو راستہ بدل کر کیا ہوگا؟'

'ایک موت کو سماج عزت دے گا اور دوسرے پر لعنت بھیجے گا۔'

'تو پھر بھیجنے دو انہیں لعنت، اس سورج پر جو زمین کو زندگی دیتا ہے، اس مٹی پر جو بیج کو اپنے آغوش میں لے کر انکر پھوڑنے کے لئے مجبور کرتی ہے اور اس کائنات پر جس کا دار و مدار انہی رشتوں پر قائم ہے، جس میں ہر وجود دوسرے کے بغیر ادھورا ہے۔'

'یہ لن ترانی چھوڑو اور حقیقت کی دنیا میں اترو۔'

'حقیقت؟'

'ہاں۔'

'اگر شوہر دار عورت کو مرد پوری طرح حاصل نہ ہو اس کی اپنی خواہشوں اور تمناؤں کے مطابق تو پھر تمہارا سماج اور قانون کوئی حل بتاتا ہے؟'

'طلاق......دوسری شادی......'

'طلاق؟ اس انتظار میں میں تو بوڑھی ہو جاؤں گی...... پھر آج تک عورت کو طلاق مانگنے پر کیا اسے آزادی ملتی رہی ہے جو میں......'

'پھر شرافت، شرافت کی زندگی گزارو، عورتوں کے لئے شریف ہونا ہی......'

'شرافت کچھ عورتوں کی مجبوری ہو سکتی ہے، کیونکہ ان کی طرف کوئی آنکھ اٹھا کر دیکھنا پسند نہیں کرتا ہے اور اس مجبوری میں وہ پاکیزہ بنی رہ جاتی ہیں مگر میرے ساتھ یہ مجبوری نہیں ہے۔'

'تم افضل کو ذلیل کر رہی ہو۔'

'بالکل نہیں، وہ بستر پر میری تکمیل نہیں ہے، یہ میں جانتی ہوں۔ اس کا جوڑا بھی کہیں ہوگا اور......'

'میں بھی اسی گھر میں پیدا ہوئی، پلی بڑھی اور اپنی زندگی گزار رہی ہوں، کم اور زیادہ کا توازن بنا کر شادی شدہ زندگی کو خوش حال بنانے کی ہم دونوں کوشش کرتے ہیں، مگر تم؟ تم بھی تو اسی گھر میں پیدا ہوئیں، پلی بڑھیں اور اچانک یہ تبدیلی...... وہ بھی شادی سے پہلے نہیں شادی کے بعد، آخر کیوں؟'

'اس لئے کہ محبت نے میرا دروازہ کھٹکھٹایا ہے۔' آسیہ نے کہا دھیمی آواز میں، مگر اس کے تیور کو دیکھ کر عاصمہ کے ماتھے پر پسینہ چھلک آیا۔

بہن کے اس طرح کئے گئے سوالوں سے آسیہ کے دل میں اتھل پتھل مچ گئی تھی۔ اس نے یہ رشتہ خود تلاش نہیں کیا تھا۔ شادی کے بعد افضل سے ملی ہر خوشی کو اس نے امنگ کے ساتھ جیا تھا، مگر

شادی کے ایک سال بعد وہ کون سا کمزور لمحہ تھا، جب وہ آ ٹکرایا۔ اپنی باتوں، اپنی نظروں سے اس نے اس طرح آسیہ سے خود اس کا تعارف کرایا کہ آسیہ حیرت زدہ رہ گئی تھی۔

دور سے پیدا ہوئی کشش پہلے ہی دن داستان جسم میں نہیں بدلی تھی، بلکہ جب دونوں ہر طرح کی منطق، روک اور حالات کی کربناکی پر فتح یاب ہوگئے تو اس مقام تک پہنچے تھے۔ وہ افضل سے عمر میں دو تین سال بڑا تھا۔ آدھی دنیا گھوم چکا تھا۔ پڑھے لکھے ہونے کے ساتھ اس کے پاس تجربہ تھا، نظریہ تھا جو آسیہ کے سامنے سے کئی طرح کے جالے صاف کرنے میں، اسے اعتماد سے بھر دینے میں اور سماج کو سیاسی طور سے سمجھنے میں مددگار ہی نہیں ہوئے تھے، بلکہ باتوں سے ایک عجیب طرح کا لطف بھی دیتے تھے۔ افضل کے ساتھ اس کی زندگی بندھے بندھائے طریقے پر چل رہی تھی، مگر اس کے ساتھ روز ایک نئی بات معلوم ہوتی۔ روز ایک تلاش شروع ہوتی جو اسے بڑے آرام سے ایک ٹھہری زندگی سے آگے لے جاتی۔ آسیہ عمر کے جس دور میں تھی وہ جستجو سے بھری عمر کا دور تھا۔ اس کی یہ ضرورت افضل نہیں، بلکہ وہ پوری کر رہا تھا۔

'وہ شادی شدہ ہے؟' عاصمہ نے سوال ٹھونکا۔

'نہیں۔' آسیہ نے معصومیت سے گردن ہلائی۔

'تم سے شادی کرے گا۔' نظر انداز کرتے ہوئے عاصمہ بولی۔

'میں نے ابھی تک اس سوال پر سوچا ہی نہیں تھا۔'

'اگر تمہارے وجود میں ایک نئے انسان نے سانس لی تو؟'

'قیامت کے دن بچے ماں کے نام سے پکارے جائیں گے، باپ کے نطفے سے نہیں۔'

دونوں بہنیں آمنے سامنے بیٹھیں چپ چاپ سی چند لمحے ٹکٹکی باندھے ایک دوسرے کو دیکھتی رہیں، جیسے اپنی بات سمجھانے کی کوشش کر رہی ہوں۔ پھر جانے کیا ہوا کہ عاصمہ کی بڑی بڑی آنکھوں میں پانی جمع ہونے لگا۔

'یہ کیا؟' آسیہ چونک پڑی، اپنی جگہ سے اٹھ کر بہن کے پاس بیٹھ گئی۔

'تمہاری زندگی کی کون سی منزل ہو گی، اس کے انجام سے گھبراتی ہوں۔' عاصمہ نے پیار سے بہن کا گال تھپتھپایا۔ آنکھوں میں بھرے آنسو گالوں پر لڑھک آئے۔

'ڈرتی میں بھی ہوں مگر گناہ کا یہ پکا میٹھا پھل چھوڑنے کا دل نہیں چاہتا۔' آسیہ نے بہن کے سر پر پیار سے اپنا سر رکھتے ہوئے کہا۔

'کوشش کرو۔' عاصمہ نے بھرائی آواز سے کہا۔

'بھول مت کرنا کہ مجھے اپنا انجام پتہ نہیں، مگر محبت کو لوٹانے کا دم مجھ میں نہیں تھا۔ اس جسم کو سلانا اب میرے بس کی بات نہیں ہے۔' آسیہ قالین پر بہن کے پیروں کے پاس آ کر بیٹھ گئی اور بہن کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے گہری آواز میں بولی۔

جانے کس جذبے کے تحت عاصمہ نے بہن کے اوپر اٹھے معصوم چہرے کو پل بھر غور سے دیکھا، چوما اور زور سے اسے سینے سے لگایا۔ آسیہ کا دل بہن کی حالت دیکھ کر بھر آیا۔ ان سب کے بیچ رہتے ہوئے آسیہ نے اس رشتے کو سمندر میں پڑے موتی کی طرح سنبھال لیا تھا۔ لوٹنا، ٹھہرنا اور واپس مڑنا اس کے بس میں نہیں رہ گیا تھا۔ مگر ایک دن یہی سارے لوگ اس سے جواب طلب کریں گے، اس رشتے کا نام پوچھیں گے، گناہ اور ثواب کا فرق سمجھائیں گے، اسے سوچنے پر مجبور کریں گے...... یہ سب رشتہ بننے سے پہلے اس نے نہیں سوچا تھا۔ وہ مل گیا، یہی حصولیابی اسے سر جھکانے پر نہیں، بلکہ اس میں عجیب و غریب طاقت اور تیقن دینے کے ساتھ سر اٹھانے پر اکساتی رہی ہے اور آج...... آسیہ کی پلکوں پر ٹکے آنسو آبشار بن گئے۔

'ان موتیوں کو یوں نہ گراؤ، انہیں سنبھال کر رکھو، یہ بہت قیمتی ہیں پگلی......' عاصمہ نے بہن کی جھجھماتی آنکھوں سے گرتے آنسوؤں کو اپنی انگلیوں سے صاف کیا۔

آسیہ نے پاس پڑے کاغذ کے رومال کو اٹھایا، چہرہ اور آنکھیں خشک کیں اور اپنے کو سنبھالنے لگی مگر آنسو تھے کہ رکنے کا نام نہیں لے رہے تھے۔ سسکیاں اتنی شدت لئے ہوئے تھیں، جیسے اس کا سینہ توڑ کر باہر نکل آئیں گی۔

'تم مجھے غلط مت سمجھنا...... زندگی میں نے بھی جی ہے اور قریب سے دیکھی بھی ہے۔ میرے پاس

میرے اپنے تجربے ہیں...... ہو سکتا ہے، وہ تمہیں بیکار لگیں، مگر...... شاید تمہارے کام بھی آجائیں......' عاصمہ نے بہن کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیتے ہوئے سرگوشی کے انداز میں کہا۔

آسیہ نے اپنی بیر بہوٹی جیسی لال لال آنکھیں بہن کی طرف اٹھائیں اور قالین سے اٹھ کر سوفے پر آبیٹھی۔ عاصمہ اپنی جگہ سے اٹھی اور صوفے کے بازو پر ٹک کر بہن کے گلے میں بانہیں ڈالے اس کے سر پر اپنی ٹھڈی رکھ کر چند لمحے بیٹھی رہی۔

'ہو سکتا ہے کچھ نازک لمحوں میں افضل کو تمہاری مدد کی ضرورت ہوتی ہو...... جو تمہیں ملا، تم نے جانا، اس کی روشنی میں سوچو...... جانتی ہو، عورت چاہے تو اپنے ساتھی کو بھرپور مرد بنالے اور نہ چاہے تو نامرد...... اپنے سکھ کو افضل میں تلاش کرو، ہو سکتا ہے، چھپا خزانہ تمہارے ہاتھ آ لگے اور تمہیں دوگنے سکھ سے شرابور کر جائے......' عاصمہ نے گہری آواز میں نپے تلے لفظوں میں اپنی بات ختم کی اور بہن کا چہرہ اپنی طرف موڑا۔

آسیہ نے حیرت سے بہن کو تاکا۔ عاصمہ کا چہرہ اسے بالکل الگ سا نظر آیا اور اس کی آنکھوں کا ٹھہرا جذبہ جانے کیسی چمک میں دھندلا گیا تھا۔ آسیہ کے ہونٹ کانپے اور بھاری پلکیں جھک گئیں۔

بہن صبح ماں کو یہ دلاسہ دے کر چلی گئی کہ آسیہ اپنے کو بدلنے کی کوشش کرے گی۔ وہ اپنے خون پر بھروسہ رکھے۔ دوپہر کو خالہ بھی اطمینان دلا کر چلی گئیں کہ آخر آسیہ ہے تو انسان ہی، کوئی فرشتہ تو نہیں، ایک دن ضرور سمجھے گی گھر کا مطلب۔ جب بچے سے گود بھرے گی تو اس کو خود اپنی زمین کی تلاش ہو گی۔ ابھی شادی کو دو سال ہی تو گزرے ہیں...... ٹھوکر کھائے بغیر کوئی سنبھلتا ہے؟ بہن کے کہنے سننے سے ماں کا دل کافی سنبھل چکا تھا۔ ماں کو دوپہر میں کسی دور کے رشتے دار کے گھر پرسے میں جانا تھا۔ وہ چلی گئیں۔

بھرا پورا گھر یکایک خالی ہو گیا اور آسیہ تنہا رہ گئی۔ اسے وہ دن یاد آنے لگے جب بابا زندہ تھے۔ آسیہ اور عاصمہ کے بیچ ایک بھائی بھی تھا جو پانچ سال کا ہو کر ڈپتھیریا سے مر گیا۔ دادا دادی تھے جن کی موت کے کچھ دن بعد بابا کو ہارٹ اٹیک ہوا تھا۔ گھر کی آبادی اور خوشحالی گھٹ کر سناٹے میں بدلنے

لگی تھی۔ جانے کتنے حادثے تھے جنہوں نے عاصمہ اور آسیہ کو بہن سے زیادہ سہیلی بننے میں مدد کی تھی۔ طرح طرح کے کھیل، اوٹ پٹانگ باتیں، ہار جیت، لڑائی، آنسو، شکوے شکایت، جلن، دکھ سکھ کے بعد جب عاصمہ کی شادی ہوگئی تو وہ یکا یک اکیلی ہوگئی۔ ہر جگہ عاصمہ کی کمی کھٹکتی۔ پڑھنا لکھنا، گھومنا پھرنا پھیکا پھیکا لگتا۔

جب عاصمہ کچھ دن بعد اپنے شوہر کے ساتھ گھر لوٹی تو وہ بجائے آسیہ کے ساتھ بیٹھنے کے اپنے شوہر کے آگے پیچھے گھومتی رہی تھی۔ وہ دونوں آپس میں باتیں کرتے، قہقہے لگاتے۔ یہ دیکھ کر آسیہ کو گہرا دکھ لگا اور حسد میں منہ سے نکلا تھا — 'بے ایمان......'۔ پھر ایک بچے کے بعد دوسرا بچہ عاصمہ کو اس سے اتنی دور لے گیا کہ اسے اپنی ہی بہن سے چڑھ ہونے لگی تھی۔ مگر کل رات، اتنے دنوں بعد اسے اپنی بہن واپس ملی تھی۔ خوشی کا احساس پرانی اداسی کو پونچھ گیا تھا۔

پرانی یادوں کی امنگ سے بھری آسیہ اٹھی اور اس نے الماری سے البم نکالے۔ بچپن کی اپنی تصویریں دیکھ کر وہ ہنسنے لگی۔ دونوں بہنیں ایک سی لمبی فراکیں پہن کر گلے میں بانہیں ڈالے آگے سے ٹوٹے دانت دکھاتی ہنس رہی تھیں۔ دوسری تصویر میں اس کی دو کسی چوٹیاں سینے پر پڑی تھیں۔ عاصمہ نے بال موڑ کر بنا رکھے تھے۔ کان کے دونوں طرف بڑے بڑے ربن کے پھول لگے تھے مگر دھوپ سے بچنے کے لئے اس نے عجیب طرح سے منہ بچکا کر آنکھیں بند کر رکھی تھیں۔

دوسرے البم میں سب کی شادیوں کی تصویریں تھیں۔ پہلے صفحے پر ماں اور بابا کھڑے تھے۔ ماں کی شکل کبھی عاصمہ کی طرح لگتی، کبھی اپنی طرح۔ پھر دوسرے صفحے پر عاصمہ اور راشد کا رنگین فوٹوگراف تھا۔ تیسرے صفحے پر اس کا اور افضل کا...... وہ شرمائی کھڑی ہے اور افضل کسی سے ہاتھ ملا رہا ہے۔

'کہتے ہیں، جنت میں جوڑے بن جاتے ہیں اور ان کی شادی بھی وہیں ہو جاتی ہے۔ میری شادی جنت میں بھلا کس سے ہوئی ہوگی، افضل سے یا اس سے؟' اس نے سوچا۔

کافی دیر تصویروں کو دیکھنے کے بعد وہ اٹھی اور رات کے کھانے کے انتظام میں لگ گئی۔ اس نے ریڈیو کھول رکھا تھا، ٹھیک پہلے کی طرح، تاکہ اسے تنہائی کا احساس نہ ہو۔ گانوں کے ساتھ کبھی وہ

گنگناتی، کبھی اس کی لے پر کام کرتے ہوئے ہاتھ تیزی سے چلاتی۔

'کھانا خود پکایا جاسکتا ہے، پیسہ بھی خود کمایا جاسکتا ہے، مگر خود اپنا محبوب آپ نہیں بنا جاسکتا ہے۔' سوچتے ہوئے ہنس پڑی آسیہ۔

کھانا پک گیا تو وہ سامان سمیٹ کر بیٹھک میں لوٹ آئی۔ اس نے البم اٹھائے اور انہیں واپس الماری میں رکھنے لگی۔ تبھی اس میں سے ایک لفافہ نیچے گرا۔ جھک کر اس نے لفافہ اٹھایا اور کھولا۔ کچھ رنگین تصویریں تھیں۔ شادی کے کچھ دنوں بعد ہی پہلی عید پڑی تھی۔

آسیہ کی آنکھوں کے سامنے شادی کے شروع کے دن گھوم گئے۔ عید کا دن۔ گھر مہمانوں سے بھرا ہے۔ دور قریب کی رشتے کی نندیں بھابھی کو گھیر کر مذاق اور دلار دکھارہی ہیں۔ چونکہ شادی کے بعد اس کی یہ پہلی عید ہے اس لئے عیدی کے ساتھ شادی کے دن نہ آسکنے والوں سے اسے منہ دکھائی بھی مل رہی ہے۔ رسم کے مطابق اس نے جھک کر سب کے آگے شیرینی کی سینی بڑھائی۔

'بہو سلیقے کی ہے۔' افضل کی دادی کی آواز میں اطمینان تھا۔

'کمسن ہے، گھر کے ماحول میں آسانی سے رچ بس جائے گی۔' پھوپھی نے فیصلہ سنایا۔

'یہ کیا دریا دلی دکھائی بیٹی، ابھی تو تمہارے کھانے کھیلنے کے دن ہیں۔' چچیا ساس نے اپنی بیٹیوں کے ہاتھ تحفوں سے بھرے دیکھ کر بڑے تعجب سے کہا۔

'انہیں پسند آئے، ان پر سجتے بھی تو ہیں۔' آسیہ نے ہنس کر نندوں کو دیکھا۔

'مبارک ہو تمہیں، بڑے دل والی بہو پائی ہے۔' ساس کی بڑی بہن نے پسندیدہ نظروں سے آسیہ کو دیکھتے ہوئے خوشی سے بھر کر بہن کو گلے لگایا۔

حنا کی خوشبو سے کمرا مہک رہا تھا۔ موسم دلکش اور ہوا متوالی تھی۔ افضل نے کھڑکی کھول دی، تاروں سے بھرا آسمان جھلملاتی چادر تان کر کھڑا ہوگیا۔ خوش مگن آسیہ پھولوں کے زیور سے لدی

پھدی کمرے میں داخل ہوئی تو افضل سے نہ رہا گیا، ہنستا ہوا آسیہ کے قریب پہنچ کر بولا، 'آپ کا ہم سے عید ملنارہ گیا۔'

آسیہ بری طرح جھینپ گئی۔ افضل نے اسے چھوا اور وہ چھوئی موئی بن گئی۔ آسیہ کے دل میں حسرت تھی کہ افضل اس کو بار بار دیکھے، اس کی تعریف کرے اور دھیرے دھیرے اس کی سجاوٹ اس سے دور کر کے اپنی بانہوں میں اسے بھرے۔ افضل کو گنگنا پسند نہیں تھا۔ وہ طوفان کی طرح اس کو اپنے ساتھ بہالے جاتا اور پھر جب وہ پوری رفتار سے بہہ رہی ہوتی تو وہ یکایک خاموش ہو جاتا اور آسیہ ابھی 'تھوڑا اور' کے احساس میں ڈوبی بڑی مشکل سے اس بکھراؤ سے اپنے کو باہر نکال پاتی اور زور سے افضل کا ہاتھ اپنی طرف کھینچتی۔ وہ 'ابھی آیا' کہہ کر اس کے پاس سے اٹھا جاتا۔ افضل اسے وقت سے پہلے بھنور میں لے کودتا اور منجدھار میں چھوڑ کر باہر نکل آتا۔

افضل کو مہنگے اور خوبصورت تحفے دینے کا بہت شوق تھا۔ آسیہ کو بہت اچھا لگتا، باہر گھومنا، سجنا، خالی وقت میں کچھ پڑھنا اور ساس سسر کے لاڈ میں بھر کر کبھی کبھی کچھ پکانا اور ڈھیروں تعریفیں سننا۔ کچھ مہینوں بعد اس اکیلی زندگی سے وہ گھبرانے لگی۔ کوئی کورس کرنے کی سوچنے لگی۔ افضل نے اجازت دے دی اور جب کورس ختم ہوگیا تو زندگی بھی ایک نئے راستے پر مڑ گئی۔ اس میں کس کا کتنا قصور تھا؟

آسیہ نے تصویریں لفافے میں واپس رکھیں اور الماری بند کر کے واپس مڑی۔ اس کے دل اور دماغ کی کیفیت بدل رہی تھی۔ کئی طرح کے سوال اس کے سامنے آکر اس سے جواب طلب کر رہے تھے۔ یہ جنت کی شادیاں ہوش آنے پر جوانی کا مرض کیوں بن جاتی ہیں؟ شوہر سے جسم اور دل کا ملنا بہت ضروری ہوتا ہے؟ جس سے جسم، دل اور ذہن سب مل جائیں وہ شوہر نہیں ہوتا ہے، پھر وہ کیا ہوتا ہے...... دنیا کی نظر میں صرف گناہ؟ گناہ آخر اتنا خوبصورت، اتنا لبریز، اتنا لطیف کیوں ہوتا ہے؟ گناہ میں اتنی طاقت کہاں سے آجاتی ہے کہ وہ ثواب کو چھوٹا کر کے سماج اور قانون کو چنوتی دینے لگتا ہے؟

آسیہ غسل خانے میں گھس گئی اور جی بھر کر نہائی۔ نل بند کیا اور سامنے سے تولیہ اٹھایا، پانی کی بوندیں اس کے بدن پر شبنم کی بوند بن کر ٹھہر گئی تھیں۔ وہ بدن پونچھنا بھول گئی تھی۔

'اپنے اس بدن کے ساتھ اتنے سال رہی مگر جان نہ پائی یہ کیسا ہے اور جو پل بھر کے لئے اس سے جڑا اس نے پرانی داستان سنا دی — بدن پر کہاں پر کالا تل ہے اور کہاں کا لمس فاختہ کے ملائم پروں

جیسا ریشمی ہے۔ اس کے تلووں میں خم ہے اور پیروں کی انگلیوں کے پیچھے کا گدے دار حصہ ٹھیک پھولوں کی پنکھڑیوں کی طرح کٹاؤدار ہے، اس کی پنڈلی چڑیا کے پنجے کی طرح نازک اور لچک دار ہے۔ اس کے بدن کا رنگ پیلی چمپا جیسا سنہرا اور مہک دار ہے اور......'

اس نے سر جھٹکا مگر متجس نگاہیں پھر اپنے کو تولنے پرکھنے لگیں۔ سانسیں تیز ہو گئیں۔ اس نے گھبرا کر تولئے سے بدن لپیٹا۔

نہانے سے دل اور دماغ کافی ہلکا ہو گیا تھا۔ چائے بنا کر وہ پیالی اٹھائے کمرے میں واپس آئی۔ اس نے ٹی وی کا بٹن دبایا۔ اپنے ہی ملک میں نہیں، بلکہ ساری دنیا میں آگ لگی ہوئی ہے۔ کہیں مذہب، کہیں رنگ، کہیں نسل، کہیں نظریات، کہیں اقتدار، کہیں پابندیاں انسانی دکھوں کی وجہیں بنی ہوئی ہیں۔ آدمی نے ترقی کہاں کی ہے؟ اس سے تو اچھا وہ زمانہ تھا، جب سب ایک بڑے کنبے کی شکل میں رہتے، بانٹ کر کھاتے، سیلاب، زلزلہ، طوفان سے ڈرتے، انہیں خدا مانتے۔ رنگ، نسل اور خود غرضی نے ان کے درمیان تب گہری کھائیاں نہیں کھودی تھیں۔ وہ اپنے نطفے کے لئے جان نہیں دیتے تھے، بلکہ بچوں کے باپ کی پہچان کا سوال ان کے لئے کوئی مسئلہ نہیں تھا۔

دروازے کی گھنٹی نہ بجتی تو اپنی رو میں آسیہ سوچ کی دھارا میں بہتی جاتی۔ ماں واپس لوٹ آئی تھیں اور کپڑے بدل رہی تھیں۔ اس نے دستر خوان بچھا کر اس پر کھانا چن دیا۔ کھانا کھاتے ہوئے ماں وہاں آئی عورتوں اور لڑکیوں کا ذکر کرتی رہیں۔ آسیہ بڑے دھیان سے ان کی باتیں سنتی رہیں۔

رات کو سوتے ہوئے ماں کا دل چاہا کہ بیٹی سے پوچھے کہ آخر سسرال والے بھی اس کی راہ دیکھ رہے ہوں گے۔ بہتر ہے کہ وہ اس زندگی کو اجڑنے سے پہلے بسا لے۔ ایک گھر بنانے کی کوشش کرے، مگر کچھ سوچ کر چپ رہ گئیں کہ کہیں کچی مٹی پر وار کرنے سے بنا بنایا کھیل بگڑ نہ جائے۔

آسیہ سارے دن گھر میں رہتی۔ ماں کے ساتھ کچھ پرانے بکسے صاف کرنے، کوڑا کباڑ پھینکنے میں اور گھر کو نئے طریقے سے سجانے میں ان کی مدد کرتی رہی۔ ماں کو اطمینان ہو گیا کہ عاصمہ کی باتوں کا اثر آسیہ پر ہو رہا ہے۔ خدا نے چاہا تو وہ ایک دم بدل جائے گی۔ خود ہی واپس جانے کی خواہش ظاہر کرے گی۔

ایک روز صبح آسیہ نے جو دروازہ کھولا تو افضل کو پھولوں کے گلدستے کے ساتھ سامنے کھڑا پایا۔ اس نے پورا دروازہ کھول دیا۔ افضل نے گلدستہ اس کے ہاتھوں میں پکڑاتے ہوئے کہا، 'ظالم، ایک بار تو فون کر کے اپنے بیمار کا حال پوچھ لیتیں۔'

'کون ہے؟' پوچھتی ماں آسیہ کے پیچھے آکر کھڑی ہو گئیں۔

افضل نے انہیں سلام کیا اور کار سے اترتی سمدھن نے آگے بڑھ کر انہیں گلے لگایا۔ سسر پھل اور مٹھائی کی چھوٹی چھوٹی ٹوکریاں اٹھائے اندر داخل ہوئے اور بولے، 'واہ رے زمانہ، ہم چپ رہے تو آپ نے ہماری چیز اپنی سمجھ کر رکھ لی۔'

'سچ، گھر سونا ہو گیا ہے۔ میں ابھی آتی نہ، سوچا سال بھر بعد گئی ہے۔ رہ لے مہینہ دو مہینہ، مگر آپ کے داماد کا باہر جانا ہو رہا ہے۔' ساس نے ایک ادا سے سمدھن سے کہا۔

'آپ کی امانت پورے دس دن سنبھال کر رکھی۔ آپ کی بہو ہے، جب چاہیں لے جائیں۔' ماں کا چہرہ خوشی سے گلنار ہو رہا تھا۔

'آپ اکیلی یہاں رہتی ہیں، آکر ہمارے ساتھ رہیں نا۔' افضل نے ساس سے کہا۔

'ٹھیک ہی تو کہتا ہے آخر آپ کا بیٹا جو ہے۔' سمدھی بولے۔

'کس منہ سے شکر ادا کروں اس اوپر والے کا جس نے آپ جیسا گھرانا اور ہیرے جیسا داماد دیا ہے۔'

جھجکتی سی آسیہ چائے کی ٹرے لے کر کمرے میں داخل ہوئی۔ افضل کی آنکھیں شرارت سے چمکیں۔ شرمائی سی آسیہ ساس سسر کی دعائیں لیتی افضل کی نظروں سے بچتی ماں سے لگ کر بیٹھ گئی۔

'بیٹی، افضل کو اندر لے جاؤ۔' ماں نے بیٹی سے کہا۔

'ہاں، ہم بوڑھوں میں بندھے بیٹھے نہ رہو تم لوگ۔' ساس نے کہا۔

آسیہ نے اپنا سامان سمیٹ کر باندھ لیا۔ ماں نے بیٹی کی بلائیں لیں اور داماد کے کندھے پر پیار سے ہاتھ رکھا۔ ساس نے ان کی حالت دیکھ کر کہا، 'بہن، میں نے لڑکی پیدا نہیں کی تو کیا، آسیہ نے اتنے

دن دور رہ کر احساس دلادیا کہ لڑکی ہوتی بڑی موہنی ہے۔ آپ کے داماد کے جانے کے بعد اسے میں آپ کے پاس کچھ دنوں کے لئے پھر بھیج دوں گی۔'

آسیہ کے جانے کے بعد ماں تھوڑی دیر آنسو بہاتی رہیں، پھر اٹھ کر انہوں نے شکرانے کی نماز ادا کی اور عاصمہ کو فون ملانے لگیں۔

'آسیہ سسرال گئی، میرے سر سے ذمہ داری کا بوجھ ہٹا۔ اگلے مہینے اگر راشد کی چھٹی ہو تو منت بڑھا لیتے ہیں۔'

'ٹھیک ہے۔' ادھر سے عاصمہ کی خوشی میں ڈوبی ہوئی آواز ابھری۔

'میں تمہاری خالہ کو بھی اطلاع دے دوں۔' کہہ کر ماں نے فون رکھ دیا۔

آسیہ سسرال آکر افضل کے کپڑے ٹھیک کرنے، نئے کپڑے سلوانے، ضرورت کی چیزیں خریدنے میں جٹ گئی تھی۔ افضل اپنی فرم کی طرف سے چھ مہینے کے لئے یورپ جا رہا تھا۔ اس کا ارادہ تھا کہ کورس کے ختم ہوتے ہی وہ آسیہ کو وہاں بلالے گا اور پھر وہ دونوں پورا یورپ گھوم کر لوٹیں گے۔

کام کی مصروفیت میں اکثر آسیہ کا دل بھٹک جاتا۔ فون پر ہاتھ جاتا، نمبر گھماتی مگر پھر گھبرا کر رکھ دیتی اور بجتے ٹیلیفون کو کبھی خود نہیں اٹھاتی تھی۔ مگر اس ملائم بستر کی یاد، جس نے اسے زندگی کا معنی سمجھایا تھا، اسے پوری طرح بھولنے کی کوشش کرتی۔

'اپنے بندوں سے یہ دوہرا کھیل کیسا؟ جب جذبہ دیا تھا تو بہاو بھی سیدھا دیتا؟ ایک ساتھ دو عاشقوں کو میرے دامن میں ڈالنے کا معنی؟' آسیہ بے دم ہو کر کہہ اٹھتی۔

رات کو وہ اپنے کو ڈھیلا چھوڑ دیتی۔ افضل اس کی اس ادا پر مٹ جاتا۔ آخر ایک دن اس نے کہہ دیا، 'بہت بدل گئی ہو۔'

'یعنی؟' آسیہ کی آنکھیں پھیلیں۔ چہرے پر سے ڈر کی پرچھائی گزر گئی۔

'کچھ دن ماں کے گھر ہو آیا کرو، وہاں سے آکر پہلے کی طرح بھولی، حسین اور ...... 'باقی باتیں ہنسی میں ڈوب گئیں۔

سب کچھ سمجھ کر آسیہ کی آنکھیں جھک گئیں۔ افضل نے اس پر بوسوں کی بوچھار کر دی۔

کچھ دن اچھے گزر گئے مگر جلد ہی دل افضل کے نام پر ٹکا نہیں رہ سکا۔ دل اور دماغ پر قابو پاتی تو بدن بے قابو ہو کر اپنا ساتھی تلاش کرتا۔ اسے بھی ایک خاص حرارت پر چڑھنے اور اترنے کی عادت ہو گئی تھی۔

اب افضل کے لمس اسے تناؤ مین لا رہے تھے۔ اس کی رگیں اس طرح سے تن جاتیں اور اس کی کھلتی بند ہوتی مٹھی کئی بار افضل کو پرے دھکیلنا چاہتی۔ ایک کھولتا احتجاج آتش فشاں بن کر ابلتا ہوا دل و دماغ پر چھانے لگتا جیسے کوئی زبردستی اپنی حدیں پار کر رہا ہو۔ طیش میں آکر اسے لگتا کہ وہ اپنی پوری طاقت سے چیخے کہ گھر کی ہر نازک چیز چکنا چور ہو جائے۔

'کیا بات ہے؟' کبھی کبھی اس کے تنتے اکڑتے بدن کی اینٹھن کو افضل محسوس کرتا۔ اسے لگتا کہ آسیہ اس کی بانہوں میں ہونے کے باوجود اس کے پاس نہیں ہے۔

'کچھ نہیں، تھک جاتی ہوں جلدی۔' آسیہ اس کی آواز سن کر ہوش میں آجاتی۔ خواب سے حقیقت میں اتر آتی اور کہیں بات کھل نہ جائے، اس گھبراہٹ میں وہ افضل سے لپٹ کر اس کے بازوؤں کو چوم لیتی، مگر دل میں درد اٹھتا۔

'اپنے جسم کی یہ توہین...... آخر کیوں سہتی ہے۔' آنکھیں جل اٹھتیں۔

'آنسو...... بھلا کیوں؟ کہو تو نہ جاؤں؟' دیوانگی میں بھر کر افضل اسے جھنجھوڑتا۔

'نہیں...... نہیں، بس یوں ہی۔' کہہ کر ہنس پڑتی آسیہ اور افضل اس کے چہرے پر بدن پر بوسوں کی مہریں لگا دیتا۔

اپنے جسم پر قابو پاتے، اپنی خواہشات کا گلہ گھونٹتے اور اپنے اوپر ظلم کرتے کرتے آخر وہ ہار گئی۔ جانتی ہے کہ افضل نے اسے پیار کا سبق سکھایا مگر پیار کرنا، بدن کی زبان میں ایک دوسرے تک پہنچنا اور

اس وسعت میں اپنے ساتھ کسی کو پانا، پھر سارے جہاں کو اس میں دیکھنا یہ سب تو اس کو کسی اور نے بتایا ہے۔ کیا مرد بھی ایک دوسرے سے اتنے جدا ہوتے ہیں؟ اس دوسرے مرد نے اسے ایسا کیا دیا ہے کہ جو چاہ کر بھی پہلے سے جڑی نہیں رہ پاتی ہے؟ کیا اس حقیقت کو وہ قبول کرلے کہ جسم ہر ایک سے اپنی زبان میں بات نہیں کر سکتا ہے؟

وہ اپنے بھٹکتے قدم پر پہرا لگاتی اور خود کو تلاش کرتی ہوئی یہ بات سمجھنے کی کوشش کرتی کہ کہیں دو جگہ بٹی زندگی اسے سمجھا تو نہیں رہی ہے کہ دنیاوی زندگی سے ہٹ کر ایک روحانی زندگی بھی ہوتی ہے اور ان دونوں کے درمیان تال میل بٹھا کر، اپنی پہلی زندگی کی توسیع مان کر دوسری زندگی کو جینا ہوگا۔ ایک کا رشتہ سماج سے ہوگا اور دوسرے کا اس کی ذات سے......؟

آسیہ کے دماغ نے دل کو سمجھایا مگر دل جسم کو نہ سمجھ سکا۔ یہ کوشش بھی جب بیکار گئی تو ہمت کر کے آسیہ نے طے کیا کہ وہ افضل کو سب کچھ بتادے گی، کچھ نہیں چھپائے گی۔ اس طرح تناؤ میں ہر رات بسر کرنا اس کے بس کی بات نہیں ہے۔ اس کے سارے جوڑ ٹوٹ رہے ہیں۔ وہ افضل کو سکھ دینے کی جگہ ایک فکر میں ڈبو دیتی ہے۔ فیصلہ کر وہ اس رات آرام سے سوئی مگر صبح اٹھتے ہی اسے دوسری فکر لگ گئی۔

'دنیا کیا کہے گی؟ اسے بری عورت کا نام دے گی، مگر اس نے تو کبھی اپنے کو اچھی عورت کہلانے کا خواب نہیں دیکھا۔ سچی ایماندار ضرورت کی بات کرنا بے ایمانی ہے کیا؟ اچھی عورت کے پردے میں وہ دوہری زندگی کب تک جئے گی؟ وہ خراب عورت ہے، ہاں...... وہ بدکار اور آوارہ عورت ہے۔' آسیہ سر پکڑ کر بیٹھ جاتی اور اسے لگتا کہ اب اس گھر میں لمحے بھر بھی ٹھہرنا اس کے لئے مشکل ہے۔ جب وہ اٹھ کر افضل سے بات کرنے جاتی تو راستہ روک کر عاصمہ آ کھڑی ہوتی۔

'اس جسم کی خاطر سب کچھ داؤ پر لگا دیا؟'

'ہاں، کون اس سے بچا ہوا ہے؟ تم بھی نہیں...... تم جسم کو آبادی مان کر گھر کا بہانا بناتی ہو اور جسم کو روح سے الگ دیکھتی ہو مگر میں کسی بہانے کی ضرورت محسوس نہیں کرتی ہوں۔ میرے لئے جسم ہی سب کچھ ہے، وہی زندگی کی حقیقت اور وہی میرے جینے کا مقصد......'

عاصمہ سے جانے کیا کیا باتیں خیالوں میں کر جاتی آسیہ۔ اخیر میں اس نے فیصلہ لے لیا کہ افضل کو ابھی آرام سے جانے دے مگر جس دن وہ واپس آئے گا اسے وہ اپنا یہ فیصلہ سنا دے گی۔ اس چھ مہینے کے عرصے میں تینوں کو ایک دوسرے کے تئیں اپنی ذمہ داری کا بھی احساس ہو جائے گا اور وہ پرکھ بھی لیں گے کہ خود وہ کتنے پانی میں ہیں۔

افضل چلا گیا۔ گھر سونا اور دل اداس ہو گیا۔ کئی دن سوتے جاگتے، تھکان اتارتے گزر گئے۔ ماں اور عاصمہ نے بہت زور دیا مگر وہ ان کے ساتھ نہیں گئی۔ انہیں یہ جان کر خوشی ہوئی کہ بیٹی عزت آبرو کا معنی سمجھنے لگی ہے۔

اب آسیہ کو اس کے ٹیلیفون کا انتظار تھا، خود فون کرنا اسے پسند نہ تھا کیونکہ وہ بڑے آرام سے اب ایک دور کھڑے تماش بین کی طرح اپنے ساتھ ہونے والے واقعات اور حادثات کا جائزہ لے سکتی ہے۔ وہ اندر سے اتنی بڑی اور پختہ ہو چکی ہے کہ دوسرے کے کئے گئے فیصلے کا صرف سبب ہی نہیں سمجھ سکتی ہے، بلکہ اس کو احترام دینا بھی جان گئی ہے۔

ایک دن دوپہر کو فون کی گھنٹی بج اٹھی۔ بے خیالی میں اس نے فون اٹھایا۔ آواز سن کر دھک سے رہ گئی۔ اتنے دنوں کے انتظار نے اس سے امید چھین لی تھی۔ ان خوبصورت گزرے لمحوں کو محض ایک اتفاق سمجھ کر، اس کی حسین یادوں کو سمیٹ کر رکھنے کا تہیہ کر چکی تھی، مگر اب وہ عاصمہ کو کیسے سمجھائے کہ اس کا تجربہ کسی اور کا سچ نہیں ہو سکتا ہے اور کسی دوسرے کا سچ اس کا اپنا تجربہ نہیں بن سکتا ہے۔

'کچھ دیر کے لئے ہو آؤ نا، آج مہینہ بھر ہو گیا ہے گھر سے نکلے، نہ کہیں آئی، گئیں۔' ساس نے پیچھے سے بہو کو منایا۔

'پھر کبھی۔' کہہ کر آسیہ نے فون رکھ دیا۔ وہ گھبرا گئی تھی۔ انہیں کیا پتہ یہ کس کا فون تھا اور وہ اسے کہاں بھیجنے کا اس طرح اصرار کر رہی ہیں۔

دو مہینے کے اس طویل ہجر نے وصال کے ان لمحات کو نیا معنی دے دیا تھا۔ ابر ٹوٹ کر برسا۔ پیاسی ندی ابلنے لگی، آبشار دوگنی رفتار سے گرا مگر نہ تپش ٹھنڈی پڑئی نہ پیاس بجھی۔ دونوں اپنی طاقت، اپنی مجبوری اور اپنی اپنی ضرورت سمجھ چکے تھے۔ دونوں میں سے کسی نے کچھ کہنے پوچھنے اور صفائی دینے کی ضرورت نہیں محسوس کی۔ جہاں سے بچھڑے تھے وہیں آکر پھر مل گئے تھے۔ جیسے ساتھ ساتھ بہنا ہی ان کی تقدیر ہو۔

'تمہارے اس پاک جسم پر آج میں نماز ادا کروں گا تاکہ یہ عبادت گاہ میرے لئے اور میں اس کے لئے سدا محفوظ رہوں۔' کہہ کر وہ آسیہ کے پہلو سے اٹھا اور اس کے پیروں کے پاس جاکر کھڑا ہو گیا۔ سینے پر ہاتھ رکھ کر نیت باندھی، پھر دونوں ہاتھ اٹھا کر خاموشی سے اس خدا کو یاد کیا جس کا دوسرا نام محبت ہے پھر رکوع میں جھکا اور اس ننگی چھاتی کے بیچ سجدے میں گرا۔

دونوں سنگ مرمر کے گنبدوں کے درمیان بالوں سے بھرا سر آستانے پر ٹکا کر اپنی ایمانداری اور وفاداری کی قسم کھاتا رہا۔ سورج ڈھلنے لگا۔ چاروں طرف سے اڑتے پرندے تھکے ہارے سے ان گنبدوں میں پناہ لینے لگے تاکہ نئی صبح کے نمودار ہونے پر وہ اور اونچی اڑان بھر سکیں۔

آدم و حوا کی اس خاموش سپردگی میں کسی تیسرے کے وجود کی کوئی گنجائش نہیں بچی تھی۔ جسم ایک ہو گئے۔ دھڑکن ایک ہو گئی۔ خود کو دیکھنے، اس دنیا کو پہچاننے او خدا تک پہنچنے کا راستہ ایک ہو کر بدن میں پیوست ہو گیا، جس کو وہ بے تحاشہ چوم رہے تھے۔

شام ڈھلے جب آسیہ گھر نہیں لوٹی تو ساس بیچین ہو اٹھیں۔ سسر جب دفتر سے لوٹے تو اپنے ساتھ خبر بھی لائے کہ کسی جوان مرد عورت کو زناکاری کے جرم میں پکڑا گیا ہے۔ سن کر ساس کی جان نکل گئی۔ شہر میں بم پھٹنے سے پھر ہنگامہ، ایسی حالت میں آسیہ کہاں اٹک گئی؟

'لگتا ہے جدھر کرفیو لگا ہے اسی علاقے میں گئی ہو گی۔' سسر نے کہا۔

'اگلی دفعہ سے گھر کا پتہ اور فون نمبر لکھ لوں گی، بیچاری کو آج جانا نصیب ہوا تو یہ آفت آپڑی۔' ساس نے ہاتھ ملتے ہوئے کہا۔

رات آنکھوں آنکھوں میں کٹ گئی۔ کہاں فون کریں؟ ماں اور عاصمہ منت بڑھانے دوسرے شہر گئی ہیں۔ سہیلیوں کا نہ نام پتہ ہے، نہ ٹیلیفون نمبر۔ جب کرفیو ہٹنے کا اعلان ہو گیا اور دوپہر تک آسیہ نہیں لوٹی تو دونوں پریشان ہو اٹھے۔

'افضل کو کیا جواب دوں گی؟ کہے گا کہ اماں آسیہ کی حفاظت نہ کر سکیں!' ساس نے آنکھیں پونچھیں۔

'سمدھن بھی کیا سوچیں گی کہ بہو کا خیال نہ کیا، اکیلے جانے دیا۔' سسر ست سے پڑ گئے۔

دونوں نے مشکل کشا کی تسبیح پڑھنی شروع کر دی۔ آنے جانے والوں کے سامنے منہ نہیں کھولا۔ فکر نے انہیں چند گھنٹوں میں ادھ مرا بنا دیا تھا۔

دوستوں نے اسے کسی طرح جیل جانے سے پہلے ہی چھڑا لیا تھا مگر وہ اس بات سے ان سب سے خفا تھا۔ جب وہ بک جھک کر کے خاموش ہوا تو صادق نے کمرے کی خاموشی توڑی۔

'اس کا اور تمہارا رشتہ میں مانتا ہوں، تمہاری اپنی ذاتی زندگی سے تعلق رکھتا ہے مگر جو کچھ تم لوگوں کے ساتھ آج ہوا وہ اب تمہارا معاملہ نہیں رہ گیا، بلکہ اس کا تعلق ہم سے اور اس سماج سے ہے۔ اس لئے ابھی تک ہم چپ تھے، مگر اس معاملے میں اب تم چپ رہو گے اور ہم اپنا فرض نبھائیں گے۔'

'کچھ سوچو تو، گناہگار تو برابر کا میں بھی ہوا، سزا صرف اسے کیوں ملے؟' وہ تڑپا۔

'تمہیں چھڑانا آسان تھا، تم چھوٹ گئے۔ اب ہم اسے چھڑانے کی کوشش کریں گے، اطمینان رکھو۔' اسلم نے سمجھایا۔

'ایک بار پھر مرد دغاباز ثابت ہو گیا۔' اس نے دونوں ہاتھوں سے اپنے کان کے پاس پھڑکتی رگ پکڑی۔

'یار! بور مت کرو، بات کو سمجھو۔ یہاں ساتھ ساتھ مر کر لیلیٰ مجنوں کی کہانی نہیں دہرانی ہے، یہاں ضرورت ہے اسے بچانے کی، آج ایک کی شامت آئی ہے، کل ہزاروں پکڑی جائیں گی۔' نعیم نے

جھنجلا کر کہا۔

'اس کو ذہنی فشار بہت ہے، کہیں دماغ کی رگ نہ پھٹ جائے، کہو تو انجکشن دے کر سلادوں تاکہ ہم بیٹھ کر چین سے صلاح مشورہ کر سکیں۔' فاروق نے صادق کے کان میں کہا۔

دوستوں نے زبردستی اسے بستر پر لٹایا۔ فاروق نے اپنا دوا کا بیگ کھولا، انجکشن تیار کیا اور یہ کہتے ہوئے اس کے بازو میں گھونپ دیا، 'بات تمہاری نہیں ہے، بلکہ ہم جو نظام لانا چاہتے ہیں، آسیہ جو پانا چاہتی ہے یا عورتیں اپنی طرح جینا چاہتی ہیں، یہ اس کی ہے۔ ان کی تلملاہٹ اسی لئے ہے کہ آسیہ اب ان کے لئے چنوتی بن گئی ہے اور ہمارے جدوجہد کی مشعل......'

'مگر میں تو اپنے کو انہی جاہلوں کی لائن میں کھڑا پا رہا ہوں۔' وہ بین کرتا سا چیخا۔

'یقین رکھو اسے سزا نہیں ہونے دیں گے۔ ہاں، جب مقدمہ چلے گا اور بحث شروع ہو' تو ہم اپنا نظریہ اس زوردار طریقے سے سامنے رکھیں گے کہ ان ظالموں کو بغل جھانکنے کے علاوہ کچھ سمجھ میں نہیں آئے گا۔' صادق نے تلخی سے کہا۔

ادھر وہ گہری نیند میں ڈوب گیا۔ ادھر شہلا اور سعدیہ ناکام لوٹیں۔ اپنے اثر ورسوخ، جان پہچان اور رشوت کی پیشکش کے باوجود وہ اس حقیقت سے بری طرح ٹکرائیں کہ ایک ہی سماج کے دو پیمانے ہیں۔ مرد کے لئے معافی اور عورت کے لئے کڑی سزا...... سب کے سر جھک گئے۔ آسیہ کو توالی سے جیل پہنچادی گئی تھی۔ معاملہ اب سنگین ہو چکا تھا۔

یہ سارے لوگ سماج کے اس طبقے سے ہیں جو پڑھا لکھا ترقی پسند کہلاتا ہے۔ ان کے سامنے آج اتنے پیچیدہ سوال آ کھڑے ہوئے ہیں کہ وہ ان سے بچ کر بھاگ نہیں سکتے ہیں۔ یہ ڈاکٹر، انجینئر، وکیل، ادیب، ٹیچر، صحافی اپنے پیشے کے بعد کا وقت سماج کو غلط سیاست اور مذہب کے شکنجے سے نکالنے میں خرچ کرتے ہیں تاکہ آنے والے دنوں میں انسان صحت مند زندگی جی سکے۔

دانشوروں کی چیخ پکار سے سوئے لوگ جاگنے لگے۔ ان کے سامنے سوال تھا کہ یہ کیسے ممکن ہے کہ مرد، عورت اپنے درمیان کی دلکشی کو نظر انداز کر کے، سارے دن آمنے سامنے بیٹھے صرف قرآن

کی تلاوت کیا کریں؟اس رسہ کشی میں سنگسار کی تاریخ آگے بڑھ گئی۔پارلیامنٹ میں،اخباروں میں، مذہبی جگہوں میں جم کر بحث شروع ہوگئی۔ مولویوں کے درمیان شدت پسند اور اعتدال پسند گروپ بن گئے۔ شدت پسند گروپ کا پلڑا بھاری تھا کیوں کہ اقتدار ان کے ہاتھ میں تھا۔اعتدال پسند گروپ والوں کے ساتھ پڑھا لکھا طبقہ اور عوام کا ایک بہت بڑا حصہ تھا، اس لئے گرم دل والوں کی دال نہیں گل پا رہی تھی۔لوگوں میں عجیب تنتناہٹ تھی۔ جیسے وہ پوچھنا چاہ رہے ہوں کہ وہ آگے جا رہے ہیں یا پیچھے لوٹ رہے ہیں؟

جیل کی کوٹھری میں بیٹھی آسیہ دن گننا بھول گئی ہے۔ شہتوت کے ڈھیروں پیڑ اس کی کوٹھری کے پاس ہیں۔اس لئے اکثر جیل کی ملازمہ عورتیں اور لڑکیاں وہاں شہتوت بینے پہنچ جاتی ہیں۔ کبھی کبھی کوئی لڑکی ہاتھ سلاخوں میں ڈال کر اس کی طرف شہتوت سے بھری مٹھی بڑھاتی ہے۔ کبھی آسیہ شہتوت کا ایک دانہ منہ میں ڈال لیتی ہے، کبھی انکار کر دیتی ہے۔

'ہرجائی ہے؟'لڑکیاں آپس میں پھسپھساتیں۔

'نہیں، فاحشہ ہے!'شک میں ڈوبی ادھیڑ آوازیں ٹکراتیں۔

'نہیں،وہ بھی نہیں، یہ تو عائشہ ہے۔'بوڑھی عورتیں فیصلہ سناتیں۔

'عائشہ، عائشہ، عائشہ ؟؟؟'

پیڑوں پر چہچہاتی چڑیاں اڑ جاتی ہیں۔ پکے شہتوت شاخوں سے جھڑ جاتے ہیں اور سناٹے میں بیٹھی وہ دل ہی دل میں ان حیرت زدہ آوازوں کو اپنے سے دور جاتا سنتی ہے۔

کیا میں آسیہ نہیں عائشہ ہوں؟ اگر سچ مچ عائشہ ہوتی تو کیا میرا انجام یہ ہوتا؟

آسمان کا رنگ لال ہو جاتا، آسیہ کی آنکھیں انگارے بن جاتیں اور رات کی سیاہی پھیلتے ہی انگارے دھیرے دھیرے کر کے راکھ میں بدل جاتے۔

ساری دوڑ دھوپ کے باوجود کورٹ نے اپنا فیصلہ سنا دیا۔ماں اور عاصمہ کی طرف سے رحم کی اپیل

ہوئی۔ ساس سسر نے اس سزا کو الزام مان کر اس کے خلاف اپیل دائر کی۔ اعتدال پسند گروپ والے مولویوں نے شریعت کی ساری کتابیں چاٹ ڈالیں۔ ثبوت پیش کئے گئے کہ سنگسار کا ذکر کہیں نہیں ہے مگر کورٹ نے اپنا جلد بازی میں لیا گیا فیصلہ واپس نہیں لیا۔ انہیں ڈر تھا کہ اس طرح ان کے ہر قدم پر روک لگ جائے گی اور ہر حرکت پر سوال اٹھیں گے۔ ان کے اقتدار کی بنیاد جس خوف اور دہشت پر ٹکی ہے وہ ختم ہو جائے گی۔ اس لئے بغیر کسی جھجک کے اعلان ہوا کہ موقع واردات پر آسیہ کے پکڑے جانے کی وجہ سے اسے کل سنگسار کر دیا جائے گا۔ اس کا ساتھی فرار ہے اور لاکھ کوششوں کے باوجود اب تک پکڑا نہیں جا سکا ہے۔ مگر اس کی تلاش جاری ہے۔

کاغذ تیار تھے۔ دیر کرنے کی گنجائش نہیں تھی ورنہ بغاوت اپنے پر پھیلا لیتی۔ اس لئے اسی روز، جب دن شام سے گلے ملنے کے لئے بیقرار تھا، قبر میں پیر لٹکائے ایک بزرگ کورٹ کی آخری خانہ پوری کے لئے جیل پہنچے۔

'اپنا گناہ قبول کرو۔' کالے جوتے یکایک آسیہ کے پاس آکر ٹھہر گئے اور بھاری آواز کی چوٹ نے خاموشی توڑی۔

آسیہ نے چونک کر نظریں اوپر اٹھائیں اور لرزتی سی اٹھ کھڑی ہوئی۔ سامنے کھڑے بزرگ نے اپنی سفید داڑھی پر ہاتھ پھیرا اور داہنے ہاتھ میں پکڑی تسبیح گھمائی۔ ان کی آنکھوں میں حیرت آمیز تجسس کوندھا، جیسے وہ اپنے کو یقین دلانا چاہ رہے ہوں کہ سامنے کھڑی کنواری مریم ماں جیسی پاک معصوم چہرے والی یہ کمسن لڑکی بھی گناہگار ہو سکتی ہے جس کو خدا نے سب کچھ دیا ہے؟

'تمہیں شیطان نے بہکایا، اور تم نے خدا کا راستہ چھوڑ کر شیطان کے کاموں میں ہاتھ بٹایا، خدا کا قہر تم پر ہے، بہتر ہے کہ تم خود گناہ کا اعتراف کر لو۔' نصیحت میں ڈوبی ان کی آواز ابھری اور بزرگ نے آنکھیں بند کر لیں۔

آسیہ کے ماتھے اور ہونٹوں کے اوپر پسینے کی بوندیں چھلکیں اور پھر وہ پوری کی پوری پسینے میں نہا گئی۔ بچپن کا خوف اس کے سامنے کھڑا تھا، مگر اس کی آنکھیں اب بھی بزرگ کے چہرے کو تاک رہی تھیں جیسے ان کی کہی باتوں کا سر پیر اس کی سمجھ میں نہ آرہا ہو۔

آسیہ کے معصوم چہرے پر پھیلی بھولی آنکھوں کو بزرگ نے ایک بار نظر بھر کر دیکھا، مگر جلدی ہی

نظریں ہٹالیں۔ یہ وجود آخر کس جذبے سے سرشار ہے؟ان کے اندر سے سوال ابھرا، مگر اپنی کہی بات کا جواب نہ ملنے کو وہ اپنی توہین سمجھ کر زیادہ دیر تک ٹھہر نہ سکے اور مڑ گئے۔ ساتھ آئے لوگ بھی لوٹ گئے۔ ان کا فرض پورا ہو گیا تھا۔

آسیہ گھٹنوں پر سر رکھ کر بیٹھ گئی۔ جیسے سجدے میں ماتھا ٹیکا ہو۔ اگر یہ گناہ تھا تو پھر اوپر والے نے اس بدن میں یہ پیاس بھری کیوں؟ شام کا دھندلکا بڑے میدان میں دوڑنے لگا، شہتوت کے پیڑوں نے اپنی ڈالیاں جھکا دیں اور آسیہ کے چاروں طرف رات پسر کر بیٹھ گئی۔

بند آنکھوں کے سامنے اس کا چہرہ ابھرا، آسیہ کے پپڑی پڑے ہونٹوں پر مسکان پھیل گئی۔ پھر عاصمہ کی آنسو بھری آنکھیں، ماں کا چھاتی پیٹتے ہوئے بین کرنا، ساس سسر کا بیقراری سے رونا، افضل کا حیرت سے اس کو تاکنا، بچپن، جوانی — ساری زندگی ریل کی طرح کھل کر سامنے آکھڑی ہوئی۔ آنکھوں سے کچھ گرم گرم بہہ کر گھٹنوں کے کپڑے میں جذب ہوا۔

پو پھٹ گئی۔ کوٹھری کے باہر شہتوت کی ننگی ڈالیاں ہوا میں لہرائیں اور آسیہ نے اپنی آنکھیں اٹھا کر اس سوال پوچھنے والے کو تعجب سے دیکھا۔ پت جھڑ کی ہوا سوکھے پتوں کو اڑاتی گزر گئی۔

'کوئی آخری خواہش؟'

سن کر ہنس پڑی آسیہ اور ہنستی ہی چلی گئی۔ جب جینا چاہتی تھی تب سب نے جسم پر سو سو پہرے لگائے، کسی نے پوچھا کہ عورت تیری خواہش کیا ہے اور آج جب موت سرہانے کھڑی ہے تو اس سے پوچھا جا رہا ہے کہ بتا تیری آخری تمنا کیا ہے؟

'آخری خواہش، کسی کو دیکھنا، کچھ کہنا، جو چاہو بغیر جھجک کہو۔' سوال پھر دہرایا گیا۔

'ہاں!' یکایک ہنستے ہنستے آسیہ رک گئی۔ چہرے پر سنجیدگی پھیل گئی۔ آنکھوں میں زندگی کی چمک لوٹ آئی، سلاخوں پر کسی مٹھی ڈھیلی پڑی اور آرزو کی گہری گھلاہٹ میں دل کی آواز، آخری خواہش میں مہک اٹھی۔

'میری جنت، ایک لمحے کے لئے ہی مجھے واپس دے دو۔'

اس رات عورتوں نے چولہے نہیں جلائے، مردوں نے کھانا نہیں کھایا، سب ایک دوسرے سے آنکھیں چراتے رہے۔ اگر آسیہ گناہگار تھی تو پھر اس کے سنگسار ہونے پر یہ درد، یہ کسک ان کے دلوں کو کیوں متھ رہی تھی۔

ناصرہ شرما

پیدائش : ۱۹۴۸ الہ آباد میں

میدانِ عمل : ادب انہیں وراثت میں ملا۔ فارسی زبان وادب میں ایم اے کرنے کے علاوہ ہندی، اردو، فارسی، انگریزی اور پشتو زبانوں پر ان کی گرفت مضبوط ہے۔ وہ ایرانی سماج وسیاست کے علاوہ ادبی، فنی اور ثقافتی موضوعات کی ماہر ہیں۔ عراق، افغانستان، پاکستان، ایران اور ہندوستان کے سیاست دانوں اور معروف دانشوروں سے انہوں نے انٹرویو لیا جو کافی مشہور ہوئے۔ ایرانی جنگ بندیوں پر جرمن وفرنچ ٹیلی ویژن کے لئے بنی فلم میں ان کا اہم رول رہا ہے۔

مطبوعہ کتابیں

ناول: کوئیاں جان، اکشے وٹ، سات ندیاں ایک سمندر، شالملی، ٹھیکرے کی منگنی، زندہ مہاورے۔

افسانوی مجموعہ : شامی کاغذ، پتھر گلی، ابن مریم، سنگسار، شبینہ کے چالیس چور، خدا کی واپسی، انسانی نسل، گونگا آسمان، دوسرا تاج محل، بت خانہ، چار بہنیں شیش محل کی۔

تراجم: شاہنامہ فردوسی، گلستانِ سعدی، برننگ پائر، ایکوز آف ایرانین ریولیوشن: پروٹسٹ پوئٹری، قصہ جام کا، کالی چھوٹی مچھلی، فارسی کی دلچسپ کہانیاں۔

مطالعات: افغانستان، بزکشی کا میدان (دو جلدوں میں)، مرجینا کا دیش: عراق، سب سے پرانا درخت : جابر حسین کی تخلیقی اساس۔

مجموعہ مضامین: کتاب کے بہانے، عورت کے لئے عورت، راشٹر اور مسلمان۔

رپورتاژ: جہاں فوارے لہو روتے ہیں۔

ٹی وی فلم: ماں، تڑپ، آیا بسنت سکھی، کالی موہنی، سیمل کا درخت، باولی۔

سیریل : واپسی، سرزمین، شالملی۔

تدوین وترتیب : ساریکا، پنچ کا ایرانی انقلاب پر خصوصی شمارہ، ورتمان ساہتیہ کا خاتون قلم کاروں پر خصوصی شمارہ اور شج پار- راجستھانی قلم کاروں کی کہانیاں۔